PROFILES OF INTELLIGENCE

اردو ایڈیشن

حسّاس ادارے

بریگیڈیئر (ر) سیّد احمد ارشاد ترمذی
سابق چیف آف اسٹاف ڈائریکٹریٹ جنرل آئی ایس آئی

حسّاس ادارے

بریگیڈیئر (ر) سیّد احمد ارشاد ترمذی
سابق چیف آف اسٹاف ڈائریکٹریٹ جنرل آئی ایس آئی



رَبِّ

زِدْنِيْ

عِلْمًاؕ

حسّاس ادارے

بریگیڈیئر (ر) سید احمد ارشاد ترمذی
سابق چیف آف اسٹاف ڈائریکٹریٹ جنرل آئی ایس آئی

ترجمہ

افضال شاہد

نام کتاب : حساس ادارے

مصنف : بریگیڈیئر (ر) سید احمد ارشاد ترمذی

ترجمہ : افضال شاہد

نظرثانی : سجاد ترمذی

پرنٹرز : زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

سرورق : ریاظ

سن اشاعت : 2004ء

قیمت : -/250 روپے

تقسیم کار : فکشن ہاؤس

18- مزنگ روڈ، لاہور

فون: 7249218-7237430



اپنے والد محترم

سید احمد حسین ترمذی مرحوم

کے نام

ترتیب

الفاظ x

میری نظر میں xii

تعارف

حرف آغاز 1

اسلام' پاکستان اور انٹیلی جنس کا نظام 8

امریکہ

امریکہ کا لائحہ عمل 19

کالی دوپہر 24

ذوالفقار علی بھٹو کا قتل 42

پاکستان کا ایٹمی پروگرام اور امریکہ 54

فرانس بھی بودا نکلا 68

موت کے سوداگر 71

اسلام آباد میں امریکی سفارتخانہ شعلوں کی لپیٹ میں 77

دشمن یا نادان دوست؟ 85

وشت کویر کے جنات 92

جاگتے رہنا بھائیو! 101

تازہ ترین 108

بھارت

چانکیا کے چیلے 113

جموں کا علموں 124
پریم نگری 130
ویزا ایکشن 137
بھارتی ماتا ہری 143
لمحوں کی جنگ 151
نفسیاتی جنگ 156

لیبیا

نام نہاد پاکستان لبریشن موومنٹ 173
یہ بھی کوئی دوستی ہے؟ 190

روس

قراقرم ہائی وے اور روسی سفارتکار 201
چالاک روسی اور معصوم پاکستانی 206
اولے کا بدلہ 208

اسرائیل

اسرائیلی انٹیلی جنس 221
آگ اور خون کا کھیل 228

اپنے ہی لوگ

فلائٹ پی کے 326 235
باغی جرنیل 246
شرمندگی 260
شیعہ فوجیوں پر پابندی 267
پیسہ بولتا ہے 271

تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کا کنونشن 276
شہنشاہی فیصلہ 288

اسلامی جمہوریہ ایران

اسلامی جمہوریہ ایران کی سرزمین پر 293

اختتامی کلمات

چند اسباق 323
خدا حافظ 330

الفاظ

سب سے خوبصورت الفاظ اس مصنف کے ہوتے ہیں' جس کا دل اور روح دونوں وطن کے درد سے تڑپتے ہوں' سب سے خوبصورت تصنیف وہ ہوتی ہے جس میں حق بات کہی گئی ہو' وہ بات جو ظلم' ناانصافی اور غلامی کے خلاف ہو۔

خاموشی کو سنہری کہا جاتا ہے مگر ایک مصنف کی خاموشی کبھی سنہری نہیں ہو سکتی' اس کے الفاظ زیادہ قیمتی ہوتے ہیں' کہنے اور لکھنے والوں کو چاہیئے کہ وہ خاموشی کو توڑ دیں ورنہ امید اور حق دفن ہو جائے گا۔ بہت سے لکھنے والے جو عرصے سے خاموش ہیں' انہوں نے سچ کو مار ڈالا ہے اور ان کی خاموشی شکست قبول کرنے اور ظالم کا ساتھ دینے کے مترادف ہے۔

لکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ مجاہدین کے ہمرکاب ہو کر جہاد بالقلم کریں' ناامیدیوں کو شکست دیں اور حق کی راہ کو روشن کریں۔

سچ لکھنے کی جرات کرنے والے بہادروں کے الفاظ ایک طرف تو بے ضمیروں کے ضمیر کو جھنجوڑیں گے اور دوسری طرف ظالم اور دشمن پر کاری ضرب لگائیں گے' ان کے الفاظ ملک کے متعصب منصوبہ سازوں کو بھی اپنے منصوبے بدلنے اور حقیقت کو سمجھنے پر مجبور کر دیں گے۔

ماضی کی بڑی بڑی تہذیبوں اور نام نہاد فلسفوں کو صرف لفظوں ہی نے شکست دی۔ لفظوں سے ہزاروں کہکشائیں جنم لیتی ہیں اور لیتی رہیں گی۔ سچے الفاظ' انقلابی کے سچے الفاظ' جھوٹے شہنشاہوں کے تخت و تاج کو ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں۔

حق کا اظہار نہ صرف معاشرے میں مثبت انقلاب برپا کرتا ہے۔ بلکہ مظلوموں کے زخموں کے اندمال کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے۔

حق کا اظہار ظلم کی اندھیری راتوں میں مینارۂ نور ہے اور جبر کی چکی میں پستے ہوئے انسانوں کی زنجیروں کو توڑتا ہے' کرۂ ارض پر محبت و یگانگت کا بیج بوتا ہے' اور راہبروں کو عوام کے دل تسخیر کرنے کے انداز سکھاتا ہے۔

اس لئے مصنف کی خاموشی کبھی سنہری نہیں ہو سکتی۔

السوریہ ٹائمز
دمشق' شام
18 نومبر 1997

میری نظر میں

بریگیڈیئر ایس اے آئی ترمذی کی تصنیف "پروفائلز آف انٹیلی جنس" ایک بہت ہی غیر معمولی کتاب ہے۔ اگر میں انٹیلی جنس کا رکن ہوتا اور مجھے یہ تمام معلومات میسر ہوتیں جو ترمذی نے اس کتاب میں شامل کی ہیں تو میں پاکستان کے ایوان اقتدار میں پھیلی ہوئی اس کرپشن' نااہلی اور چاپلوسی کے خلاف ایک چھوٹا سا انقلاب ضرور برپا کر دیتا۔ ترمذی نے بھی ایک طرح سے کو Coup ہی کیا' جب اپنی قبل از وقت ریٹائرمنٹ کے موقع پر اسے ڈائریکٹر جنرل انٹر سروسز انٹیلی جنس نے کہا "میرے پاس ملازمت کی درخواست لے کر نہ آنا" تو ترمذی نے جواب دیا "سر امید ہے میں نہیں آؤں گا۔"

بریگیڈیئر ترمذی سے میری پہلی ملاقات تہران میں اس وقت ہوئی جب مجھے اسلامی حکومت نے دعوت دی تھی کہ میں خود آکر انقلاب کا رخ اور تندی دیکھوں' ترمذی انقلاب اسلامی کے بارے میں خوب جانتا تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے حالات کا تجزیہ بھی کر رہا تھا' پھر جو میں نے از خود دیکھا اور اس کا موازنہ اس سے کیا جو ترمذی کا تجزیہ تھا تو بہت مقامات پر میں نے اسے درست پایا۔ نتیجتاً میں آیت اللہ عظمیٰ شریعت مدار سے ملنے قم بھی گیا جنہیں انقلاب سے باہر رکھا گیا تھا' اور ان سے ولایت فقیہہ اور ان کے اور آیت اللہ عظمیٰ خمینی کے درمیان جو خلیج حائل تھی اس کے بارے میں بھی گفتگو کی۔

عمومی طور پر میں اس بات کے خلاف ہوں کہ انٹیلی جنس پر کتاب اس وقت کے حالات کے فوراً ہی بعد لکھ دی جائے۔ اس لئے میں نے اسے میلان سے دیکھا لیکن اب جب کہ یہ کتاب چھپ کر مارکیٹ میں آچکی ہے میں اس سے خوب لطف اندوز ہوا ہوں۔ میں نے اس کتاب کو عوامی نمائندگان کے خلاف فرد جرم کے طور پر دیکھا ہے۔ اس کتاب میں بہت سے ایسے ناموں کا ذکر کیا گیا ہے جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے ہیں اور شاید اب بھی ہوں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم قوم کو صحیح صورت حال سے آگاہ کریں۔ جو کچھ کتاب میں لکھا گیا ہے اگر اس کی تردید نہ کی گئی تو انتہائی خطرناک نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

مصنف نے مجرمانہ غفلتوں، خوفناک کوتاہیوں، قوم کے نقصانات، نہایت ہی نازک مقامات پر آپس کے لڑائی جھگڑوں اور اوپر کی سطح پر قومی جذبے کے فقدان کی نشاندہی کی ہے۔ اگر یہ سب کچھ سچ ہے، تو من حیث القوم ہم ایک بہت ہی خطرناک مرض میں مبتلا ہیں۔ اگر یہ سب جھوٹ کا پلندہ ہے تو یہ کتاب دشمن کو غلط روش پر لگانے کا ایک شاہکار ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ ترمذی جو کہنا چاہ رہا ہے، وہ سچ ہے۔

لاہور میں امریکہ کے کونسل جنرل ڈاکٹر لینڈریو وی کوری، کا یہ بیان پڑھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ "ایک پاکستانی کی قیمت ایک وہسکی کی بوتل سے لے کر امریکہ کی مفت سیر تک محدود ہے۔" میری حیرت اس وقت دکھ میں بدل گئی جب اس کا ذکر میں نے اپنے چند دوستوں سے کیا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ قیمت اتنی گر چکی ہے کہ شاید اب ایک بوتل واڈکا سے لے کر لندن کی مفت سیر تک آگئی ہے۔ یہ سوچنے کا مقام ہے کہ کیا ہماری اخلاقی قدریں واقعی اتنی گر چکی ہیں؟ اور کیا ہمارا قومی جذبہ اتنا ہی مردہ ہو چکا ہے؟ خاص طور سے اب جب کہ ہم ایک ایٹمی قوت بننا چاہتے ہیں۔ یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ بعض پاکستانی بی بی سی پر پاکستان، پاکستان کے مستقبل اور اپنے معاشرے کے بارے میں ہتک آمیز گفتگو کرتے ہیں، خاص طور سے جب ان لوگوں کا تعلق حزب اختلاف سے ہوتا ہے۔

اگرچہ انٹیلی جنس کا تعلق خفیہ کام سے ہے جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے، بہر طور اس کے بہت سے حصے خفیہ نہیں ہوتے اور ان کا تعلق براہ راست عوام سے ہوتا ہے، انٹیلی جنس ایجنسیوں کے سربراہ کی نامزدگی کا تعلق پاکستان میں بھی عوام الناس سے ہے، یہ بھی سننے میں آیا کہ صدر غلام اسحاق خان اور وزیر اعظم نواز شریف کے درمیان اختلاف اس بات پر بھی تھا کہ میاں صاحب آئی ایس آئی کے سربراہ کو جو کہ ایک Fundamentalist تھا تبدیل کرنے کے حق میں نہیں تھے۔

اس کتاب کو پڑھنے سے یہ بھی واضح ہوا ہے کہ انٹیلی جنس کے محکموں کے اوپر کی سطح کے عہدیداران کو لگانے اور ہٹانے کا عمل شفاف ہونا چاہیے، امریکہ میں اس امر کا جائزہ سینٹ کمیٹی آف انٹیلی جنس لیتی ہے۔ آخر میں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ میں نے اس سے پہلے بھی ایک ایسی ہی کتاب "By Way of Deception" کا مطالعہ کیا تھا جو اسرائیل کی

خفیہ ایجنسی موساد کے ایک سابق آفیسر نے لکھی تھی۔ مصنف کا کہنا ہے کہ موساد کی مہمات میں کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہودی جہاں بھی ہے موساد سے تعاون کرتا ہے اور یوں یہ لوگ موساد کی آنکھیں اور کان بن جاتے ہیں۔

ترمذی نے بھی اپنے پاکستانی بھائیوں سے اسی قسم کے تعاون کے لئے ایک جذباتی اپیل کی ہے۔ میں بھی اس سے متفق ہوں چونکہ اسرائیل کی طرح پاکستان بھی ایک نظریاتی مملکت ہے' ہم پاکستانیوں کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ ہماری میراث' وجود اور پہچان' صرف اور صرف پاکستان ہے' لیکن ساتھ ہی ساتھ میں سیاست دانوں اور انٹیلی جنس والوں کو بھی یہ باور کراتا چلوں کہ ایسا محسوس کیا جارہا ہے کہ دور حاضر میں انٹیلی جنس کے محکموں نے اپنی کارروائیوں سے قوم میں ایک شدید تصادم کی صورت حال پیدا کر دی ہے۔ جسے درست کرنا نہایت ضروری ہے' اور میں امید کرتا ہوں کہ اس کتاب کے مطالعہ سے موجودہ اور آنے والے انٹیلی جنس ایجنسیوں کے کارکنوں تک یہ پیغام پہنچ جائے گا۔

ایس ایم ظفر

سابق وزیر قانون

ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان

چیئرمین ہیومن رائٹس سوسائٹی آف پاکستان

چیئرمین جناح فورم

پریزیڈنٹ کلچرل ایسوسی ایشن آف گریجوایٹس

پریزیڈنٹ ہمدرد مجلس شوریٰ

تعارف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف آغاز

"مجھے جس سے خوف آتا ہے وہ ہے دشمن کا جاسوس' میری دلی خواہش ہے کہ اس خفیہ دشمن پر کڑی نظر رکھی جائے۔ اور یہ کام دیانتدار' قابل اعتماد' ہوشیار اور سمجھدار کارندوں کو سونپا جائے' تاکہ وہ انتہائی ذمہ داری سے تفتیش کے مراحل سے گزر سکیں' اس خفیہ دشمن کا کوئی ٹھکانہ یا اتہ پتہ تو ہوتا نہیں' اس لئے ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ وہ ہمارے راز اڑا لے جانے میں کامیاب نہ ہو۔"

(جنرل جارج واشنگٹن 1776ء)

یہ کتاب لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ خفیہ ادارے' ان کی کارکردگی اور آپریشن تو ہمیشہ راز میں رکھے جاتے ہیں اور رہنے بھی چاہئیں۔ لیکن چند واقعات اس لئے بیان کئے جا رہے ہیں کہ پچھلے چند سالوں سے ہماری خفیہ ایجنسیوں کو مسلسل تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ کہیں فنڈز کے بے جا استعمال' کہیں جائیدادیں بنانے کی تہمت تو کہیں سیاسی حریفوں کو ہراساں کرنے اور ان کے فون ٹیپ کرنے کے الزامات عائد کئے جا رہے ہیں۔ خفیہ ایجنسیوں کی افادیت کو بالائے طاق رکھ کر یہاں تک بھی کہا جا رہا ہے کہ ان کے کارندوں کو اسمبلیوں کے اجلاس کے دوران اسمبلیوں کی عمارت میں داخل ہونے سے روک دیا جائے۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ ہماری خفیہ ایجنسیوں کے کارکن اپنے ہی ملک میں ناپسندیدہ افراد قرار دیئے جا رہے ہیں؟

یہ تاثر بھی عام ہے کہ یہ ادارے لوگوں کی ذاتی زندگی کے معمولات میں مداخلت کرتے ہیں اور یوں بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں بھی اس طرح کے ادارے ان الزامات سے مبرا نہیں ہیں۔ خفیہ آلات لگانے' نگرانی کرنے' ٹیلی فون ٹیپ کرنے اور کیس فائلیں کھولنے جیسے معاملات پر ان اداروں کو بھی تنقید کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ لیکن ہر دانشور اور اپنے ملک و قوم سے محبت رکھنے والا ہر شخص اس

بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ دشمن ہمیشہ اعلیٰ سرکاری افسروں' عہدیداروں' وزراء اور سیاستدانوں کی صفوں میں اپنے ایجنٹ بھیجنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ انہی لوگوں کے پاس ملک کے راز ہوتے ہیں اور یہی لوگ حکومتی فیصلوں میں شریک ہوتے ہیں۔

امریکی ایف بی آئی کے سربراہ جے ایڈگر ہور نے امریکہ کے پریذیڈنٹ جیک ایف کینیڈی کے معاشقوں کی تفصیل خفیہ طریقوں سے حاصل کی اور کینیڈی کو خبردار کیا کہ آپ کی یہ حرکات ملک و قوم کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں اور دشمن ان عورتوں کے ذریعے صدر اور امریکہ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ایڈگر ہور نے ذاتی طور پر پریذیڈنٹ کینیڈی کو ناراض کیا' لیکن چونکہ وہ "جی حضوریا" نہیں تھا' اس لئے اپنے عہدے اور ملازمت کی پرواہ کئے بغیر اس نے اپنا فرض ایک سچے محب وطن شہری کی حیثیت سے ادا کیا۔ صاف ظاہر ہے کہ صدر مملکت کی ذات قوم و ملک کی اہمیت سے بالاتر نہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ یہ ادارے اور ان کے کارندے بھی' دیانتدار' محب وطن اور اپنے کام کے ماہر ہوں۔

یہ بھی درست ہے کہ تیسری دنیا کے بہت سے ممالک کی طرح پاکستان کے کئی صدور اور وزراء اعظم نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول اور سیاسی مخالفین کو ہراساں کرنے کے لئے ان اداروں کا غلط استعمال کیا اور انٹیلی جنس کے بعض افسران بالا نے اس ضمن میں تمام حدود پار کر کے "بادشاہ گر" کا کردار ادا کیا اور کبھی کبھی ملکی سیاست میں "اقتدار کے دلالوں" کا کام بھی سرانجام دیا۔ لیکن اس کی تمام تر ذمہ داری چیف ایگزیکٹو پر ہے جو نااہلوں کو سیاسی اور ذاتی پسند کی بنیاد پر ان حساس اداروں کا سربراہ مقرر کرتا ہے' انہیں وہ کام کرنے کو کہتا ہے جو ان کے فرائض میں شامل نہیں ہوتا' یا پھر ان کو کھلی چھٹی دے دیتا ہے اور یوں وہ اپنی حیثیت کا غلط استعمال کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ پاکستان کے ایک سابق وزیراعظم نے ٹی وی پر اپنی تقریر کے دوران فرمایا کہ انٹیلیجنس اداروں کی 80 فیصد رپورٹیں جھوٹی اور من گھڑت ہوتی ہیں حالانکہ ادارے کا سربراہ اسی وزیراعظم کا چنا ہوا تھا۔

تاریخ گواہ ہے کہ انٹیلی جنس' دلیر' محب وطن اور اپنے مقصد سے لگن رکھنے والے لوگوں کا پیشہ ہے۔ اس شعبے کے سرکردہ کارکن قومی مقاصد کے حصول کی خاطر انتہائی خطرناک اور دشوار مہمات کو سر کرنے میں اپنی ساری زندگیاں صرف کر دیتے ہیں' ہر مشکل اور کڑی صورتحال کا جوانمردی سے مقابلہ کرتے ہیں' لیکن جدوجہد سے بھرپور طویل زندگی میں وہ بے نام' اجنبی اور تنہا ہوتے ہیں۔ بس ایک اجنبی سا سایہ' ایک انجانا خوف ان کے

ساتھ ساتھ رہتا ہے' جو کبھی کبھی حقیقت بن کر انہیں گمنامی کے گھپ اندھیروں میں دھکیل دیتا ہے' ان کی قبروں پر نہ کوئی مینار تعمیر ہوتا اور نہ ہی کوئی کتبہ نصب کیا جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ انہی کی قربانیاں ان کی قوم کی تقدیر بدل دیتی ہیں اور انہی کے نام ہمیشہ کے لئے ایک ایسی غیر مرئی فہرست میں شامل ہو جاتے ہیں جو قوم کی قسمت کے ماتھے کا جھومر بنتی ہے۔

اس شعبے کا "فنکار" ایک ایسا مجاہد ہوتا ہے جو اپنے مقاصد کا سو فیصد شعور رکھتا ہے اور اپنے کام کی حساس نوعیت کا ادراک جس کا قیمتی اثاثہ ہوتا ہے۔ وہ ایک ماہر دستکار کی طرح اپنی قابلیت کے جوہر اور تجربے کے آلات کو ماہرانہ انداز سے استعمال میں لاتے ہوئے تہہ در تہہ چھپی ہوئی خطرناک حقیقتوں کا پتہ لگاتا ہے' وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے کسی "چمک" یا لالچ کا شکار نہیں ہوتا اور نہ ہی جذبات کبھی اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ بس ایک دیوانے کی سی لگن اور دھن اسے لیے چلی جاتی ہے۔

امریکہ کے صدر بل کلنٹن نے سی آئی اے کے ہیڈکوارٹر کے دورے کے موقع پر امریکن انٹیلی جنس کے ایسے ہی 56 گمنام کارکنوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ کئی برسوں پر محیط سرد جنگ میں امریکہ کو انہی لوگوں کے طفیل فتح نصیب ہوئی' اور اب ایسے ہی لوگوں کو نئے محاذوں پر نئے دشمنوں کے خلاف نبرد آزما ہونا ہے۔

صدر کلنٹن نے سی آئی اے کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے یہ بھی کہا تھا:

"آپ نے اس سرد جنگ کی فتح میں کئی حوالوں سے نہایت ہی فعال کردار ادا کیا ہے۔ آج بھی بہت سے خطرات کا سامنا ہے اور صورت حال پہلے سے بھی زیادہ تشویشناک ہے۔ دہشت گردی' ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنا اور مذہب کے نام پر ہونے والی قتل و غارت ایسے چیلنج ہیں' جنہیں صرف ایک قابل اعتماد انٹیلی جنس نیٹ ورک ہی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے' اور اس حوالے سے حکومت صرف آپ کی کارکردگی کی بنیاد پر ہی موزوں فیصلے کر سکتی ہے اور اس ضمن میں آپ کی رپورٹوں کی روشنی میں ہی طویل المدت پالیسی اختیار کی جا سکتی ہے۔ بحیثیت صدر صبح ہوتے ہی مجھے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ گذشتہ رات دنیا میں کیا ہوا اور آج اور کل میں کیا ہونے والا ہے۔ اور یہ مجھے آپ ہی سے پتہ چلتا ہے۔"

سی آئی اے کے 56 کارکنوں کی ہلاکت کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے سی آئی اے کے گمنام سپاہیوں کو روشن ستارے قرار دیتے ہوئے کہا تھا:

"ان بہادروں کی یہ قربانی ہمیں ہمیشہ یاد دلاتی رہے گی کہ آزادی کتنا بیش قیمت تحفہ ہے۔ مجھے علم ہے کہ آپ کا کام انتہائی حساس نوعیت کا ہے جس پر عام حالات میں گفتگو نہیں کی جا سکتی مگر آپ کی کارکردگی کیا ہے میں اسے اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہوں' میں اسے بہت اہمیت دیتا ہوں' اسے انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور اسی لئے آج اس پر آپ کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے بذات خود سی آئی اے ہیڈ کوارٹر آیا ہوں۔"

معلومات کو جمع کر کے' دستاویزات تیار کرنا اور انہیں انٹیلی جنس میں تبدیل کرنا ہمیشہ سے دنیا کے ہر ملک میں معتبر پیشہ سمجھا گیا ہے۔ ہر ملک چاہے چھوٹا ہو یا بڑا' مضبوط ہو یا کمزور' مملکت کو درپیش خطرات اور دیگر اہم امور کے حوالے سے قومی تحفظ کا لائحہ عمل تیار کرنے کے لئے انٹیلی جنس ادارے قائم کرتا ہے اور ان اداروں کے لئے خصوصی کارکن تیار کرتا ہے۔ دفاع' قومی تحفظ اور دوسرے ممالک کے خفیہ منصوبوں' قوت اور تکنیکی شعبوں تک رسائی حاصل کرنے اور ان پر خفیہ نگاہ رکھنے کے لئے انہی حساس اداروں سے کام لیتا ہے۔ بعض ممالک میں تو سیکرٹ سروس کے کارکنوں کو سیاسی قتل و غارت' دہشت گردی اور تخریب کاری کے مشن بھی سونپے جاتے ہیں' اس لئے اپنے ملک کے لئے حفاظتی تدابیر اور بہتر سے بہتر حکمت عملی وضع کرنے کے لئے دوست اور دشمن کارکن کی پہچان بے حد ضروری ہے۔

سی آئی اے کے ایک اہم عہدیدار ایلڈرچ ایمز اور اس کی کمبوڈیا نژاد بیوی ماریہ کی گرفتاری کے موقع پر' جو کے۔ جی۔ بی کے لئے کام کرنے کے الزام میں دھر لئے گئے تھے' ایک روسی سفارت کار نے تبصرہ کرتے ہوئے اس حقیقت کو تسلیم کیا تھا کہ سی آئی اے میں ہمارے ایجنٹ کام کر رہے ہیں اور کے جی بی میں امریکی ایجنٹ موجود ہیں۔ لہٰذا معلومات کے حصول کے لئے ماسکو اور واشنگٹن کی خفیہ جنگ کوئی حیران کن بات نہیں' یہ تو ایک عام اور روزمرہ کا معمول ہے۔

25 مئی 1994ء کو روسی صدر بورس یلسن نے کے جی بی کی صفوں میں موجود غیر ملکی ایجنٹوں کے خاتمے پر زور دیا۔ جبکہ کے جی بی کے سرکردہ عہدیداروں نے اس بات کا

اعتراف کیا کہ بعض غیر ملکی جاسوس ان کی صفوں میں گھس آئے ہیں اور وہ روس کے اقتصادی راز چوری کرتے ہیں۔ صدر یلسن نے اس صورتحال پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ چند دوست نما دشمن روس کو کمزور کرنا چاہتے ہیں اور ان کی کوشش ہے کہ روس ایک ایسا ملک بن جائے جہاں بے روزگاری عام ہو اور عوام کی ذہنی سطح اس قدر پست کر دی جائے کہ ان میں ماضی کی طرح کے کارنامے سرانجام دینے کی سوچ ہی باقی نہ رہے۔

انہوں نے روسی سیکرٹ سروس کے اعلیٰ عہدیداروں کے ساتھ ایک خفیہ ملاقات میں اس بات پر زور دیا کہ انہیں اس صورتحال کا سختی سے نوٹس لینا ہو گا اور روسی سیکرٹ سروس کو ان جاسوسوں سے پاک کرنے کا کام ترجیحی بنیادوں پر انجام دینا ہو گا۔

روسی ادارے کے سربراہ ولادیمیر میٹاکوف نے ایک روسی قومی اخبار کو دیئے گئے اپنے انٹرویو میں اعتراف کیا کہ سیکرٹ سروسز اب دفاعی راز معلوم کرنے کی بجائے اقتصادی اور تکنیکی راز معلوم کرنے پر مامور ہیں اور غیر ملکی جاسوس روس کے اقتصادی راز چرا کر اسے عالمی اقتصادی منڈی میں دیوالیہ قرار دلوانا چاہتے ہیں۔

پاکستان کو جغرافیائی اور سیاسی صورتحال کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہمیں بھی ہر آن قومی' جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کے تحفظ کے حوالے سے غیر ملکی جاسوسوں کا سامنا ہے اور اس وقت ایک سے زیادہ ممالک کے جاسوس' تخریب کار اور دہشت گرد ہمارے ملک میں مصروف عمل ہیں۔

پاک سر زمین کے دشمنوں کی مذموم سرگرمیوں سے نمٹنا ہماری کاؤنٹر انٹیلی جنس ایجنسیوں (سی آئی) کی ذمہ داری ہے اور یہی ادارہ دفاعی لائحہ عمل بناتا اور اس پر عمل کرتا ہے۔ سی آئی کے چند مقاصد یہ ہیں:

1- دشمن کے باہر سے بھیجے ہوئے جاسوسوں یا ہماری صفوں میں بیٹھے ہوئے دشمن کے ایجنٹوں کا سراغ لگانا اور پھر ان سے نبرد آزما ہونا۔

2- ملک دشمن سرگرمیوں' دشمن کے انٹیلی جنس اہداف' اس کے طریقہ کار اور غیر ملکی ایجنٹوں کے رابطوں کا کھوج لگانا۔

3- ملک دشمن عناصر اور ان کے آقاؤں کی کوششوں کو ناکام بنانے کے لئے ان کی سرگرمیوں کا کھوج لگانا اور تخریبی سرگرمیوں کو وقوع پذیر ہونے سے پہلے روکنا۔ ممکن ہو سکے تو دشمن کی صفوں میں اپنے ایجنٹ شامل کرنا۔ یا دشمنوں کے ایجنٹوں کو انہیں کے خلاف استعمال کرنا۔

4- ملکی سیاست میں دشمن کے بلاواسطہ یا براہ راست ملوث ہونے پر نظر رکھنا۔ اس کے پراپیگنڈے' ڈس انفارمیشن اور حوصلہ پست کرنے والی چالوں کی تاک میں رہنا اور ان کا سد باب کرنا۔

5- کسی اہم عہدیدار پر لگائے گئے الزامات کی تفتیش کرنا تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ وہ مجرم ہے یا نہیں۔ کسی ملک دشمن سرگرمی میں اس کے ملوث ہونے کے مکمل اور ناقابل تردید ثبوت اکٹھے کرنا' تاکہ اسے عدالت میں پیش کیا جا سکے۔

6- مختلف معلومات کو ایک باقاعدہ طریقہ کار کے مطابق اور منظم انداز میں جمع کرنا' ان کا باریک بینی سے تجزیہ کرنا اور بروقت ان معلومات کو سربراہ مملکت یا دوسرے عہدیداروں' اور اداروں تک پہنچانا۔

7- حساس اداروں میں کام کرنے والوں کی جانچ پڑتال' ان کی تربیت' انہیں دشمن کے ارادوں سے باخبر رکھنا اور دفاعی اقدامات تجویز کرنا۔

8- دشمن کے لگائے گئے جاسوسی کے خفیہ آلات کو دریافت کر کے انہیں ناکارہ بنانا۔

اس کتاب میں پاکستان کی ایک کاؤنٹر انٹیلی جنس (سی آئی) ایجنسی کی کارکردگی کے چند واقعات درج کئے گئے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے قاری کو اس ایک چھوٹی سی ٹیم کی دشمن کے خلاف کارروائیوں کی ایک جھلک نظر آئے گی۔ مصنف چونکہ اس ٹیم میں شامل تھا اس لئے کتاب کو مصنف کے ذاتی تجربات کے حوالے سے مصنف کی سوانح بھی کہا جا سکتا ہے۔

شاید بعض حالات و واقعات پڑھتے ہوئے قارئین کو کچھ خلاء محسوس ہو اور بات نامکمل نظر آئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "راز راز ہی رہنا چاہئے۔" آپریشنز کی سب تفصیل بیان کر دینا بھی خطرے سے خالی نہیں کیونکہ دشمن ہمہ تن گوش ہے۔ اس لئے بعض مقامات پر نام' تاریخ اور جگہ یا تو بتائی ہی نہیں گئی یا فرضی نام لکھے گئے ہیں تاکہ کوئی واقعہ یا جملہ کسی کی دل آزاری کا باعث بھی نہ ہو اور دشمن اس سے فائدہ بھی نہ اٹھا سکے۔

قارئین کو کتاب کے مطالعہ کے دوران میں یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ امریکی سی آئی اے اور روسی کے جی بی کی طرز پر پاکستان کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے کارکن نہ تو ہزاروں کی تعداد میں دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور نہ ہی ان پر لاکھوں ڈالر خرچ کئے جا سکتے ہیں۔ ہماری سرگرمیوں کا دائرہ کار محدود ہے اور ہماری مہمات میں ایسی حسیناؤں کا بھی عمل دخل نہیں جو جیمز بانڈ 007 کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتی ہیں یا ہلفرڈ ہچکاک کی فلموں

کے خوبصورت کرداروں میں دکھائی دیتی ہیں۔ اور نہ ہی ہمارے پاس ایسے ہیروز ہیں جو مافوق الفطرت کارنامے انجام دیتے ہیں۔ تاہم ہمارے کارکن محنتی ہیں اور جانفشانی سے کام کرتے ہیں۔ مصنف یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ اس کی ٹیم کی اہم مہمات نے تاریخ کا رخ موڑ دیا یا قومی زندگی کے ادراک پر کوئی بڑا اثر چھوڑا مگر اتنا ضرور ہے کہ ان کامیابیوں نے تباہی اور بربادی کے کئی دھاروں کا رخ ضرور موڑ دیا۔

امید ہے کہ یہ کتاب ایجنسیوں کے بارے میں پہلے سے موجود بعض افسانوی اور ماورائی سوچیں بھی تبدیل کر دے گی اور بعض ایسی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کر دے گی جو اس ادارے کے بارے میں پیدا کر دی گئی ہیں۔

یقین ہے کہ ادارے کے موجودہ عہدیداران اور اراکین کے لئے بھی یہ کتاب مفید ثابت ہو گی اور انہیں اپنے پیشروؤں کی ناکامیوں اور کامیابیوں سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا اور ان تجربات کی روشنی میں وہ اپنے مستقبل کی مہمات کا بہتر لائحہ عمل تیار کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ یہ میرا پیشہ ورانہ عقیدہ ہے کہ سی آئی کے کارکن ہمہ وقت دشمن کے خلاف جہاد میں مصروف رہتے ہیں' یہ ایک ایسا مسلسل جہاد ہے جس میں وہ آنکھ جھپکنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے۔



اسلام، پاکستان اور انٹیلی جنس کا نظام

1978ء میں جنرل محمد ریاض خان نے آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے چارج سنبھالا۔ جنرل ریاض بنیادی طور پر مذہبی آدمی تھے۔ انتہائی ایماندار، پیشہ ور اور اپنے فرائض سے عبادت کی حد تک لگاؤ رکھنے والے، دلیر اور کبھی نہ جھکنے والے سپاہی، جن کا طرز زندگی بھی انتہائی سادہ تھا۔

ایک روز ان کے ایک سوال نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ انہوں نے سادگی سے پوچھا:

"ہم جو کام کرتے ہیں کیا یہ انسانی ضمیر کے خلاف نہیں ہے؟ دوسروں کے راز معلوم کرنا، ان کی جاسوسی کرنا اور مختلف روپ دھار کر دوسروں کو دھوکہ دینا، وغیرہ وغیرہ۔؟"

پہلے تو میں یہ سوال سن کر چونک سا گیا پھر میں نے دھیمے انداز میں کہا:

"نہیں سر! ہمارے مقاصد نیک ہیں۔ ہم یہ سب اپنے وطن کی حفاظت اور استحکام کے لئے کرتے ہیں۔ ہمارا ٹارگٹ صرف ہمارے ملک اور قوم کا دشمن ہے۔ ہم دشمنوں کے ایجنٹوں، چوروں اور مکاروں کے منصوبوں کو خاک میں ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارا کام قابل احترام ہے اور ہم اپنے ضمیر کی عدالت میں سرخرو ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ میری اس وضاحت نے انہیں مطمئن نہیں کیا، انہوں نے پوچھا

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا یہ کام قرآن اور سنت کی رو سے جائز ہے؟"

میں ان کا مطمع نظر سمجھ رہا تھا۔

"سر! میں مذہب پر اتھارٹی تو نہیں ہوں، مگر جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، اسلامی تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں جن سے ہمیں اس سوال کا جواب مل جاتا ہے۔"

میں نے اپنے جواب کو مزید واضح کرتے ہوئے کہا:

"اسلامی تاریخ کے اولین دور میں جب کفار مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا تو اللہ نے حضورؐ کو مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کا حکم دیا تھا۔ حضورؐ نے اللہ کے اس حکم کو اپنے قریبی ساتھیوں تک سے چھپا کر رکھا اور شب ہجرت اپنے بھائی حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کو اپنے بستر پر سلا کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اللہ نے ایک مکڑی کو اس غار کے منہ پر جالا بننے کا حکم دیا تھا

جس میں حضورؐ نے اپنے صحابی حضرت ابوبکر صدیق کے ساتھ قیام فرما کر کفار مکہ سے اپنی جان بچائی تھی۔ حتیٰ کہ کفار مکہ کو دھوکہ دینے کی خاطر اللہ نے کبوتروں کے ایک جوڑے کو غار کے منہ پر انڈے دینے کا حکم بھی دیا تھا' یہ سب اللہ کے احکامات تھے' جن سے کفار مکہ دھوکہ کھا گئے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کئی بار اپنے جاسوس دشمن کی فوجی قوت کا اندازہ لگانے اور ان کی پوزیشنوں کو دیکھنے کے لئے دشمن کے علاقوں میں بجھوائے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر مومنوں کو اپنے راز چھپانے کی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ انٹیلی جنس کا یہ سلسلہ نہ صرف اسلام کی رو سے جائز ہے بلکہ عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔"

جنرل صاحب نے کہا:

"پھر بھی کیوں نہ ہم جنرل ہیڈ کوارٹرز کے شعبہ مذہبی امور سے اس کی وضاحت طلب کر لیں؟"

ان کی خواہش پر اس ضمن میں فوج کے مذہبی شعبے کو ایک تفصیلی نوٹ بھیجا گیا۔ جنرل ہیڈ کوارٹرز سے جلد ہی ہمارے سوالوں کا جواب مل گیا۔ یہ ایک خاصا طویل مضمون تھا۔ ہم نے اس مضمون کو ایک کتابچے کی صورت میں شائع کروایا اور اسے تمام متعلقہ دفاتر میں بجھوا دیا تاکہ ہمارے ساتھی اس کا مطالعہ کریں اور ان کے جذبوں کو اس حوالے سے مزید تقویت مل جائے کہ ہمارا کام قرآن و سنت کی رو سے نہ صرف جائز ہے بلکہ انتہائی اہم اور قابل تحسین ہے۔ ہم نے قرآنی آیات پر مشتمل کچھ سیکورٹی پوسٹرز بھی شائع کروائے جو آج بھی مختلف دفاتر میں آویزاں ہیں اور ہمارے افسروں' جوانوں اور ایجنسیوں کو راہنمائی مہیا کرتے ہیں۔

اس کتابچہ سے چند اقتباسات قارئین کی نذر کئے جاتے ہیں:

انٹیلی جنس کی اسلامی اساس

ایک مکمل ضابطہ حیات کی حیثیت سے قرآن حکیم زندگی کے ہر پہلو کے لئے اصول فراہم کرتا ہے' لیکن چونکہ اسلام کسی خاص دور یا جغرافیائی خطے تک محدود نہیں اس لئے ان راہنما اصولوں کی عملی شکل اور طریقہ کار کی تفصیلات کا تعین نہیں کرتا۔ یہ اسلام کی آفاقیت ہی ہے جو مسلمانوں کو آزادی دیتی ہے کہ وہ اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق زندگی کے مختلف شعبوں کو منظم کر سکیں۔ انٹیلی جنس کی اسلامی اساس آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی یہ حدیث ہے:

امض حتی تنزل نخله فترصد بیما وبنا و نعلم لنا من اخبار۔

ترجمہ : نخلہ تک چلے جاؤ وہاں پہنچ کر مخفی طور پر (قریش) کے حالات معلوم کرو اور ہمارے پاس ان کی خبر لاؤ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے ایک قرابت دار کی قیادت میں بارہ آدمیوں پر مشتمل جاسوسی کا ایک قافلہ ترتیب دیا تھا اور ان کو مدینہ اور مکہ کی درمیانی منزلوں پر واقع نخلہ کے مقام کی طرف روانہ کیا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ اپنا آپ ظاہر نہ کرنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جاسوسی کے لئے اسلام میں بھی فرضی تشخص اور فرضی کہانی کی اجازت ہے جس کو جھوٹ سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

اسلام میں انٹیلی جنس کی ابتداء

مدینہ میں ورود کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے نواح مدینہ میں پانی کے قدرتی چشموں' نامعلوم راستوں' قریش کی جنگی' تجارتی اور سیاسی سرگرمیوں اور مدینہ میں مقیم یہودیوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا بندوبست کیا۔ اوپر نخلہ کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی قسم کا دوسرا واقعہ جنگ خندق سے متعلق ہے۔ کفار کا لشکر خندق کے پار دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت حذیفہؓ بن یمانیؓ سے کہا "تم جاؤ اور خبر لاؤ کہ کافر کس حال میں ہیں؟ مگر ہاں! دیکھو' وہاں کسی پر حملہ مت کرنا" یہ دوسری ہدایت دے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خبر لانے کا طریقہ بھی متعین فرما دیا۔ یعنی حملہ نہ کر کے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھو۔ جدید انٹیلی جنس میں "کور" اسی فرمان سے مماثلت رکھتا ہے۔ چنانچہ حضرت حذیفہؓ خندق پار کر کے قریش کے لشکر میں گئے' لشکر کی تعداد وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں واپس پہنچے تو سردی سے کانپ رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انہیں اپنا کمبل اوڑھایا اور جنت کی بشارت دی۔ اس واقعہ سے انٹیلی جنس کی اہمیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انٹیلی جنس کوئی ناپسندیدہ کام نہیں۔ جس کام کے کرنے والے کو خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنت کی بشارت دی ہو وہ کیسے غیر مستحسن ہو سکتا ہے؟

ایک اور واقعہ انٹیلی جنس کی جدید صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جنگ بدر کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے دشمن کا ایک قیدی لایا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے سوال کیا کہ لشکر کفار کی

تعداد کیا ہے؟ وہ تعداد نہ بتا سکا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر پوچھا کہ کفار کے لشکر میں کتنے اونٹ روزانہ کھانے کے لئے ذبح کئے جاتے ہیں؟ اونٹوں کی تعداد سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر کی تعداد اخذ کر لی۔ اس واقعہ میں اگر ایک طرف جنگی قیدیوں سے پوچھ گچھ کے اصول موجود ہیں تو دوسری طرف غیر متعلق جزئیات سے مطلوبہ نتائج اخذ کرنے کے طریقے بھی۔

تاریخ طبری میں درج ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زید بن ثابتؓ کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا تھا تاکہ وہ یہودیوں کے حالات معلوم کر سکیں۔ اسی طرح تاریخ میں حضرت عباسؓ کا ذکر آتا ہے کہ انہوں نے فتح خیبر سے قبل ہی اسلام قبول کر لیا تھا لیکن ظاہر نہیں کرتے تھے۔ بلکہ مکہ ہی میں رہ کر مشرکین مکہ کے حالات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تحریری طور پر بھیجا کرتے تھے۔

دشمن کے خلاف خبر رسانی کے متعلق اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور کے چند واقعات پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد اب ہم مدافعانہ یا کاؤنٹر انٹیلی جنس کی جانب آتے ہیں کیوں کہ اس وقت ہم جن نازک حالات سے گزر رہے ہیں اس میں کاؤنٹر انٹیلی جنس کو مناسب اہمیت نہ دینا زیادتی کے مترادف ہو گا۔

کاؤنٹر انٹیلی جنس

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: "فیکم سمعون لھم یعنی تمہارے درمیان ان کے سننے والے (جاسوس) موجود ہیں۔"

اس حکم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے دشمن کے جاسوسوں' فتنہ پردازوں اور ففتھ کالمسٹوں کی نشاندہی کر کے مسلمانوں کو ان سے خبردار کر دیا۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ آپس کی گفتگو میں بھی احتیاط برتیں تاکہ ہمارے راز دشمن تک نہ پہنچ سکیں۔ یہی احتیاط غیر صحت مند افواہوں کو روکنے کا وسیلہ بھی بن سکتی ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: لا تتخذوا بطانۃ من دونکم۔

ترجمہ: "اپنوں کے علاوہ کسی کو اپنا راز داں نہ بناؤ۔"

اس حکم کے ضمن میں "اپنوں" کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یہاں اپنوں سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے لئے رازوں سے آگاہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہ کہ وہ لوگ جو ذاتی طور پر راز کے امین کے قریب ہوں۔ راز قوم کی امانت ہیں۔ ہم سب کو چاہئے کہ سہواً بھی اس امانت میں خیانت نہ کریں۔ اور اپنے عزیز و

اقارب' دوستوں یا غیر متعلق لوگوں پر عام گفتگو کے دوران کوئی راز ظاہر نہ کریں۔ مبادا ان کی دانستہ یا نادانستہ غلطی سے یہ راز دشمن تک پہنچ جائیں۔

حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: من کتنم سرہ بلغ مرادہ ترجمہ: جس نے اپنا راز چھپایا اس نے اپنا مقصد پایا۔

انہی تمام اصولوں پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امن اور جنگ کے دنوں میں عمل فرمایا جیسا کہ نیچے دی گئی مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

اسلام کے ابتدائی دور ہی میں مسلمانوں کا اندرونی اور بیرونی مخالفین سے واسطہ پڑا۔ مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ کی یہودی آبادی کے ارادوں کے بارے میں تشویش ہو گئی تھی' چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں کی سازشوں اور قریش مکہ سے ان کے باہمی مراسم کا توڑ کرنے کی غرض سے یہودیوں کی مناسب نگرانی کا بندوبست فرمایا۔ حضرت زیدؓ بن ثابت کو عبرانی سیکھنے کا حکم اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ یہی طریقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منافقین کے لئے استعمال کیا جو بظاہر مسلمانوں کے ساتھ تھے لیکن بباطن قریش کی مدد کرتے تھے۔

فتح مکہ کے دور کا ایک واقعہ کاؤنٹر انٹیلی جنس کے اسلامی اصول سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب فتح مکہ کے لئے تیاری فرما رہے تھے تو ایک صحابی حضرت حاطبؓ نے اس تیاری کے بارے میں سرداران مکہ کے نام خط لکھ کر اسے ایک عورت کے ہاتھ مکہ بھجوانے کی کوشش کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا علم ہو گیا' آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت زبیرؓ کو حکم دیا "جاؤ فلاں مقام پر تمہیں ایک عورت ملے گی۔ اس کے پاس ایک خط ہے وہ اس سے حاصل کر کے لے آؤ۔" چنانچہ وہ گئے اور خط لا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جنگ کے زمانے میں دشمن کو اپنی فوج کے ایک اہم راز کی خبر دینا اور اسے حملے سے متعلق قبل از وقت آگاہ کر دینا انتہائی خطرناک فعل تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حاطبؓ کو بلا کر مسجد نبویؐ میں ان سے باز پرس کی اور حضرت عمرؓ نے حضرت حاطبؓ کے لئے موت کی سزا تجویز کی (تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ تجویز منظور نہ فرمائی۔) اس واقعہ سے کاؤنٹر انٹیلی جنس کے رموز واضح ہو جاتے ہیں۔ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بروقت یہ اطلاع مل جانا کہ ایسا کوئی خط سرداران مکہ کو لکھا گیا ہے' اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخبر مدینہ میں سرگرم عمل تھے۔ اور وہ صحابہ کرام پر بھی نظر رکھتے تھے)' اس واقعہ سے ہمیں دشمن کے رازوں کی ترسیل

کے ذرائع کو منقطع کرنے کا سبق ملتا ہے اور اپنے رازوں کی حفاظت کا بھی۔

پاکستان کو درپیش خطرات

اسلامی نقطہ نظر سے انٹیلی جنس کی وضاحت کے بعد یہ ضروری ہے کہ پاکستان کو درپیش خطرات کی نشاندہی کر دی جائے۔ تاکہ ہمارے کارکن خطرے کی نوعیت اور شدت سے آگاہ ہو کر اس کا موثر مقابلہ کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہیں۔

بعض علاقائی اور عالمی طاقتیں کھلی جارحیت کی قباحتوں کا احساس کرتے ہوئے ہمیں بلاواسطہ طور پر داخلی انتشار میں مبتلا کر کے کمزور کرنا چاہتی ہیں' تاکہ انہیں ہم پر غلبہ پانے میں آسانی رہے۔ اس قسم کا تجربہ انہوں نے اس سے پیشتر مشرقی پاکستان میں کامیابی سے کر کے دکھا دیا ہے۔

ہمارے دشمن آج بھی علاقائی عصبیت پھیلانے میں کوشاں ہیں اور اس مقصد کے لئے وہ مخالفانہ پروپیگنڈے کے ساتھ ساتھ آج کل کے آزمودہ نسخے "سب ورژن" کو استعمال کر رہے ہیں۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے دشمن کو پاکستان کے اندر خفیہ کام کرانا ہوتا ہے' جو کہ عموماً پاکستانی باشندوں کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ پاکستان کے نظریے کے خلاف پرچار کر کے اور بھائی کو بھائی کے خلاف ابھار کر دشمن لسانی' معاشرتی اور علاقائی عصبیت کو ہوا دے رہے ہیں۔ اس کام کو خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کے لئے وہ پاکستان کے مختلف علاقوں سے اپنے ہم خیال لوگوں کو منتخب کر کے اور ان کی خفیہ طور سے مالی امداد کر کے ہمارے ملکی حالات کا رخ اپنی مرضی کے مطابق موڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ماضی میں افغانستان باوجود مسلمان ملک ہونے کے وقتاً" فوقتاً" پختونستان کے مسئلہ کو اٹھاتا رہتا تھا' جس سے پٹھانوں کے جذبات میں ہل چل پیدا کرنا اور پاکستان میں گڑبڑ پھیلانا مقصود ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ مسلح بغاوتیں کرانے کی کوششیں بھی کی گئیں۔ اسی طرح چند اور طاقتیں ایک مخصوص نظریے کے بل بوتے پر اور وافر مالی امداد سے نام نہاد ترقی پسند طلباء' مزدور یونینوں' اخبار نویسوں اور ہم خیال سیاستدانوں وغیرہ کے ذریعے حالات کا رخ موڑنا چاہتی ہیں۔ الغرض پاکستان کی آبادی کے کچھ طبقے مستقلاً" غیر ملکی مداخلت کا شکار ہیں۔

ان حالات میں کاؤنٹر انٹیلی جنس پر مامور ادارے پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ان تمام غیر محب وطن عناصر کی' بروقت نشاندہی کرے جن میں غیر ملکی نظریوں کے ماننے والے' ذاتی فائدے کے لئے دشمن کی جاسوسی کرنے والے' علاقائی و لسانی عصبیت پھیلانے والے اور

تخریب کاری کرنے والے شامل ہیں' تاکہ ان کا سد باب کیا جا سکے اور خود غرض عناصر کی سرکوبی کے لئے بروقت مناسب اقدامات کئے جا سکیں۔

انٹیلی جنس کے کارکنوں کے فرائض اور ان کی تکمیل کا اسلامی و اخلاقی جواز

جب ہم سے (جو کہ انٹیلی جنس سروس سے متعلق ہیں) یہ کہا جاتا ہے کہ ناپسندیدہ عناصر کی غیر صحت مندانہ سرگرمیوں کی نگرانی کریں اور ان کے متعلق خبریں حکومت وقت کو فراہم کریں تو ہمیں دو بنیادی امور کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اولاً یہ کہ حکومت وقت ملک کے ساتھ مخلص ہے' کیوں کہ کوئی بھی حکومت خود اپنی ذات یا اپنے ملک کے خلاف نہیں ہو سکتی' یہ تو ہو سکتا ہے کہ نادانستہ طور پر حکومت سے کوئی غلطی ہو جائے' لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی حکومت دانستہ طور پر خودکشی کے اقدامات کرے۔ جہاں تک نادانستہ غلطی کے امکان کا سوال ہے تو اس قسم کی غلطیاں لاعلمی کی وجہ سے ہوتی ہیں اور حکومت کی لاعلمی اس کی انٹیلی جنس سروس کی کوتاہی کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے۔

دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ ہمیں اجتماعی اور انفرادی مفاد میں امتیاز کرنا پڑے گا۔ ہماری قوم ملت اسلامیہ کی وحدت کی علمبردار ہے' اس لئے قوم بہر صورت فرد پر فضیلت رکھتی ہے۔ قرون اولیٰ میں بھی کسی مسلمان کو یہ حق کبھی نہیں دیا گیا کہ وہ مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کو ٹھیس پہنچائے۔ آج بھی ہمیں فرد اور قوم میں سے قوم کے مفادات عزیز تر رکھنا ہوں گے۔ چونکہ انٹیلی جنس کے کارکن اپنے ذاتی فائدے کے لئے کسی کی رپورٹ نہیں کرتے' اس لئے اسے چغلی کے مترادف قرار دینا غلط ہے۔ یہاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ' کے بارے میں ایک مشہور واقعہ کا ذکر کرنا مناسب ہو گا۔ جنگ خندق کے دوران جب ابتداء میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عمر بن عبدود کو زیر کر لیا اور اس کے سینے پر بیٹھ کر اس کی گردن پر تلوار پھیرنا ہی چاہتے تھے تو عمر نے آپ کے چہرہ مبارک پر تھوک دیا۔ اس پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اسے چھوڑ دیا۔ کیوں کہ معاملہ جہاد فی سبیل للہ یا خدمت ملت سے ہٹ کر ذاتیات کی طرف آ گیا تھا۔

تحقیق کا حکم

قرآن حکیم کا ارشاد ہے :

یا ایھا الذین امنوا ان جاء کم فاسق جنبا ً فتبینوا ان تصیبوا قوماً بجھالتہ فتصبحوا علی ما فعلتم فدا مین۔

ترجمہ : اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کئے پر پشیمان ہو (سورۃ الحجرت آیت 6)

اس آیت میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ خبر کی تصدیق کرنا ضروری ہے۔ یہ ارشاد ربانی موجودہ دور کی انٹیلی جنس کے اصولوں سے عین مطابقت رکھتا ہے۔ آج کل کی انٹیلی جنس بھی اپنے کارکنوں کی رپورٹ کی صداقت کے بارے میں محتاط رویہ اختیار کرنے کا مشورہ دیتی ہے اور اسی لئے رپورٹ کی گریڈنگ یعنی A-1 ' B-2 وغیرہ کی جاتی ہے۔ تاکہ غلطی یا سہو کے امکان کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ اس ارشاد ربانی سے ہمیں بہت سے سبق ملتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اپنی رپورٹوں کی پڑتال کرو' ان کو پرکھو تاکہ کسی بے گناہ کو نقصان نہ پہنچے' کیوں کہ اسلام کسی شخص کے بیجا نقصان کے حق میں نہیں اور کسی بیگناہ کو زک پہنچانے کی اجازت نہیں دیتا۔ دوسرے یہ کہ ہم میں سے ہی کچھ لوگ ہو سکتا ہے اپنی کم علمی اور کم تجربہ کی وجہ سے' کسی واقعہ کی صحیح طور پر رپورٹ نہ کر سکیں' اس لئے رپورٹ بھیجنے والے کی قابلیت اور تجربہ کی بناء پر اس کی بھیجی ہوئی رپورٹ کی صحیح گریڈنگ کر لینی چاہئے۔ اور اس کے مطابق اس کی رپورٹ کو مناسب فوقیت دینی چاہئے۔

فرائض

پاکستانی انٹیلی جنس دوسرے ملکوں کی انٹیلی جنس کی طرح دو بنیادی فرائض سرانجام دیتی ہے۔ اولاً یہ کہ وہ دشمن یا امکانی دشمن کے ارادوں' حرکات و سکنات' جنگی تیاریوں وغیرہ کے متعلق حکومت پاکستان کو آگاہ کرتی رہتی ہے' جو اسلامی روایات کے عین مطابق ہے۔ دوئم یہ کہ وہ داخلی خلفشار کے خواہاں ناپسندیدہ عناصر' علاقائی و لسانی عصبیت رکھنے والے گروہوں' دشمن کے کار پردازوں' جاسوسوں اور مسلح باغیوں وغیرہ کے متعلق باخبر رہ کر حکومت کو اس قابل بناتی ہے کہ بروقت مذموم کارروائیوں کا سدباب کر سکے۔ دراصل حکومت کو صحیح فیصلے کرنے کے لئے جس خام مواد یعنی انٹیلی جنس کی ضرورت ہوتی ہے وہ ملکی انٹیلی جنس ایجنسیاں ہی فراہم کرتی ہیں۔ حضرت حاطبؓ کا واقعہ اس امر کا شاہد ہے کہ اس قسم کی حرکات کی مخبری اسلامی اصولوں سے ہرگز انحراف نہیں ہے' بلکہ ملک کے استحکام کے لئے اشد ضروری ہے اور بلاواسطہ طور پر اسلام کی خدمت بھی' کیوں کہ یہ ملک اسلام کے نام پر قائم کیا گیا ہے' حکومتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں' لیکن حکومتوں کے ساتھ ملک کے مفادات تبدیل نہیں ہوتے' نہ ملک کا نظریہ تبدیل ہوتا ہے۔

نتائج

اس مختصر سے جائزہ سے ہم جو سبق سیکھ سکتے ہیں وہ یہ ہیں:

ا۔ انٹیلی جنس ہرگز کوئی غیر اسلامی یا غیر اخلاقی فعل نہیں ہے۔

ب۔ کاؤنٹر انٹیلی جنس سے چغلی یا جھوٹ کا کوئی پہلو نہیں نکلتا اور نہ ہی اس کا مقصد کسی محب وطن شخص یا گروہ کو نقصان پہنچانا ہوتا ہے۔ اصل مقصد اجتماعی مفاد کے لئے ناپسندیدہ افراد کی نشاندہی کرنا ہوتا ہے۔

ج۔ انٹیلی جنس کے کارکنوں کے لئے یہ ضروری قرار دے دیا گیا ہے کہ وہ خبروں کی تصدیق کر لیا کریں تاکہ غیر متعلق شخص یا گروہ ناروا عتاب کا شکار نہ ہو جائے۔

د۔ انٹیلی جنس کے جو کارکن محنت' لگن اور دیانتداری سے کام کرتے ہیں' وہ قوم کا گراں بہا سرمایہ ہوتے ہیں اور وہ اسلام کی خدمت کرتے ہیں' جس کا اجر اللہ تعالیٰ انہیں ضرور دے گا' (جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ کو جنت کی بشارت دی تھی)۔

اختتامیہ

آخر میں یہ کہنا مناسب ہو گا کہ مسلمانوں کے لئے انٹیلی جنس اہم ترین فرائض میں سے ایک ہے' کیوں کہ اس کے ذریعے ہم اپنے ملک اور اپنے دین کے استحکام کا باعث بنتے ہیں' اور اپنی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

ہماری صحیح اور بروقت خبر سے ہی ہماری حکومت آنے والے خطرات سے آگاہ ہوتی ہے اور ان سے صحیح طور پر نمٹنے کے لئے تیار ہوتی ہے۔ ہمیں اپنے اس عظیم فرض میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتنی چاہئے بلکہ اپنی جان اور مال تک کی بازی لگانے سے بھی گریز نہیں کرنا چاہئے۔ اپنے ملک کی حفاظت دراصل اسلام کی خدمت ہے' کیوں کہ یہ ملک اسلام کے نام پر معرض وجود میں آیا اور اسی کی بدولت ہمیں آزادانہ طور پر اپنے مذہب اسلام پر قائم رہنے اور اس کے احکامات پر عمل کرنے کا موقع ملا۔ اسی لئے ہمیں یہ سرزمین جان و مال اور دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔

○

امریکہ

امریکہ کالائحہ عمل

""امریکہ سے دشمنی مول لینا خطرناک ہو سکتا ہے' لیکن امریکہ سے دوستی اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔""

(ہنری کسنجر)

آج کی سیاسی اور اقتصادی صورتحال کے تناظر میں اگر ڈاکٹر ہنری کسنجر کی اس بات پر غور کیا جائے تو ان کا کہنا سو فیصد درست معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ اپنے مفادات کے حصول کی خاطر امریکہ کسی بھی ملک کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی اپنا حق سمجھتا ہے اور اپنے مقصد کو پانے میں وہ کسی بھی بین الاقوامی ضابطے یا عالمی قوانین کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھتا اور قطب شمالی سے لے کر قطب جنوبی تک اور مریخ سے لے کر سمندروں کی تہوں تک وہ کسی بھی معاملے سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔

امریکہ اس خطے میں بھی مصروف عمل ہے' اول تو وہ چاہتا ہے کہ اس خطہ کے رہنے والے ہمیشہ اس کے دست نگر رہیں۔ دوم تیل پر کنٹرول ایک ایسا ہتھیار ہے جو اگر امریکہ کے ہاتھ لگ جائے تو وہ تمام تیل استعمال کرنے والے ممالک پر اپنی سیاسی' اقتصادی اور دفاعی پالیسی مسلط کر سکتا ہے' سوم اس خطے کی جغرافیائی حیثیت کو وہ دور دراز علاقوں میں پہنچنے کے لئے بیس کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے امریکہ نے پہلے شاہ ایران کو طاقتور بنایا تاکہ وہ ایک ایسی فوجی قوت بن جائے جس سے تیل پیدا کرنے والے سب ممالک زیر ہیں اور بوقت ضرورت ایران کے تمام وسائل کو کام میں لایا جا سکے۔ اسی مقصد کے تحت امریکہ نے 1920ء کے معاہدۂ الجزائر کے ذریعے ایران عراق کا سرحدی جھگڑا طے کروا دیا۔

ایران کے وزیراعظم امیر عباس ہویدا نے اپنی ایک تقریر کے دوران کہا تھا کہ 1971 میں جب پاکستان ٹوٹا' تو امریکی نہ صرف یہ کہ تماشا دیکھتے رہے بلکہ وہ اس کے توڑنے میں براہ راست شامل بھی تھے۔ گویا ایران کے شہنشاہ کے لئے یہ لمحہ فکریہ تھا' شہنشاہ ایران کو باور ہو گیا کہ امریکی جب چاہیں گے' اس کا تختہ بھی الٹ دیا جائے گا۔

امریکہ' امام خمینی کی انقلابی کارروائیوں سے بھی پوری طرح باخبر تھا' امریکہ کے خیال میں شہنشاہ ایران اپنے قد سے اونچا دکھائی دینے کی کوشش کر رہا تھا اس لئے اسے نکالنا ضروری ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ایک جمہوری حکومت لانے کا منصوبہ بنایا جا چکا تھا' امریکہ نے امام خمینی کے اردگرد بنی صدر جیسے جاسوس اور مجاہدین خلق جیسے کارندے تعینات کر دیئے تھے' تاکہ جیسے ہی انقلاب کامیاب ہو' یہ لوگ فوراً حکومت کی باگ ڈور سنبھال لیں' امام خمینی کو قم میں محصور کر دیا جائے' اور امریکہ کی پسند کی ایک جمہوری حکومت قائم ہو جائے۔ لیکن اس محاذ پر امریکہ بری طرح شکست کھا گیا۔ اور شکست کی وجہ امام خمینیؒ کی شخصیت تھی' امریکہ نہ تو انہیں جان سکا اور نہ ہی انہیں پہچان سکا۔

چنانچہ اسلامی انقلاب کو شکست دینے کے لئے امریکہ نے عراق کے صدر صدام کو اکسایا جس نے 1975 کا معاہدۂ الجزائر یک طرفہ طور پر پھاڑ دیا اور ایران پر چڑھائی کر دی۔

آٹھ سال تک مسلمانوں کا کشت و خون ہوا اور مسلمانوں کی تیل کی دولت کا زیاں ہوا' اسلامی انقلاب کو تو شکست نہ ہو سکی' مگر صدر صدام ایک بہت بڑی قوت بن کر ابھرا' جو امریکہ کے لئے مشکلات پیدا کر سکتا تھا' عراق کی بڑھتی ہوئی قوت کو مٹانے کے لئے اس کو کویت پر حملہ کرنے کے لئے اکسایا گیا' اور پھر جو عراق کا حشر ہوا اور ابھی تک ہو رہا ہے اور جس طرح تیل پیدا کرنے والے ممالک پر امریکہ قابض ہو چکا ہے وہ سبھی دیکھ رہے ہیں' عراقی بچے بھوک اور بیماریوں سے بلک بلک کر مر رہے ہیں سعودی عرب اور کویت مقروض ہو چکے ہیں' اور امریکہ وہاں ایک خونخوار درندے کی طرح دندناتا پھر رہا ہے۔

سابق صدر جنرل ایوب خان کی مشہور کتاب "Friends Not Masters" کی سند کے باوجود یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ پاکستان کے حوالے سے امریکہ کا کردار ہمیشہ سے ایک "آقا" کا رہا ہے۔ اور وہ دوستی کا کوئی تقاضا پورا نہیں کر سکا۔ پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ میں ہم ہر لحہ 'امریکی نگرانی' دباؤ اور اس کی من مانی پالیسیوں کی زد میں رہے ہیں۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کبھی تو امریکہ نے پاکستان کے خلاف امداد کا "ہتھیار" استعمال کیا' کبھی اقتصادی دباؤ کا ہتھکنڈا اور کبھی پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دلوانے کے بہانے ہراساں کیا۔

پاکستان کا جغرافیائی محل وقوع' ایٹمی صلاحیت' زرعی اور تکنیکی ہنرمندی اور خاص طور پر اسلامی نظریاتی بنیاد ایسے عوامل ہیں جو امریکی پالیسی سازوں کی خاص توجہ کا مرکز ہیں۔ امریکہ نے کبھی پاکستان کو اپنے معاملات خود چلانے کی اجازت نہیں دی۔ ہماری تاریخ کے

ابتدائی برسوں میں ہی امریکہ نے ہمارے قومی مفادات کو ہائی جیک کر لیا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ امریکہ نے پاکستانی حکام کے اردگرد ایک ایسا جال بن دیا کہ پاکستان کسی صورت اس سے آزاد نہ ہو سکے۔ کبھی آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے قرضوں کی واپسی کے لئے دباؤ' کبھی ایٹمی ہتھیاروں کی روک تھام کا عزم' کبھی چین اور ایران سے دوستی پر خفگی اور کبھی چرس اور افیون پر پکڑ دھکڑ۔ پاکستان کو ان مسائل میں اس بری طرح سے الجھا کر رکھ دیا گیا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ پاکستان نہ صرف اقوام عالم میں اپنا منفرد مقام اور تشخص کھوتا جا رہا ہے بلکہ سیکورٹی اور اقتصادی لحاظ سے بہت سے خطرات سے بھی دوچار ہوتا جا رہا ہے۔

پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کے دور ہی سے ہر حکومت امریکہ کے ساتھ دفاعی اور اقتصادی معاملے کرنے پر مجبور رہی ہے۔ جن کی بدولت امریکہ کو تو اپنی قومی سلامتی اور دیگر مفادات کے تحفظ میں بدد ملی' مگر امریکی حاسدوں کی وجہ سے پاکستانی قوم آج تک ہر قسم کے مفاد کے حصول سے محروم ہے۔ اس بے سود دوستی کا ہمیں یہ نقصان بھی ہوا کہ امریکہ نے روس کے خلاف جاسوسی کے لئے ہماری سرزمین کو بلا خوف و خطر کھلے عام استعمال کیا۔ امریکہ نے ہمارے عزیز دوست چین اور ایران کے ساتھ ہمارے تعلقات بگاڑنے کی بھی پوری کوشش کی اور آج بھی وہ اپنی اس مذموم کوشش میں مصروف ہے۔ جس کا تازہ ترین ثبوت یہ ہے کہ چین کو میزائل ٹیکنالوجی پاکستان کو کو منتقل کرنے پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ امریکہ کی یہ کوشش بھی ہے کہ ہم برادر اسلامی ملک ایران سے بھی مکمل طور پر کٹ جائیں اور اس مقصد میں ناکامی کے باوجود وہ ابھی تک ہمارے ایران کے ساتھ تعلقات پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے۔

اپنے انتظامی' اقتصادی اور سیاسی اثر کو قائم رکھنے اور شکنجے کو مزید مضبوط بنانے کے لئے امریکہ اپنی خفیہ دہشت گرد تنظیم سی آئی اے کی کارکردگی کو فعال رکھتا ہے۔ یہ امریکی ادارہ دنیا کے دیگر ممالک کے قومی وقار کو زیر نگیں رکھنے اور اس ضمن میں امریکی مفادات کے تحفظ اور حصول کے لئے پوری دنیا میں بدنام ہے۔ اس ادارے کے پاس بے پناہ وسائل ہیں اور اس کے کارکن اپنے مقاصد کی تکمیل میں کسی اخلاقی ضابطے کے پابند نہیں۔ سی آئی اے کے جنونی طریقہ کار کی چند جھلکیاں یہ ہیں:

1- دیگر ممالک کے دفاع' خارجہ امور' سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبہ جات' اقتصادی ترقی اور تعلیمی پروگراموں اور سیاسی اداروں کی خفیہ نگرانی۔

2- پراپیگنڈہ' ڈس انفارمیشن' دہشت گردی' نفسیاتی حربے' قتل و غارت' بلیک میلنگ' رشوت اور ڈرانے دھمکانے جیسے مذموم ہتھکنڈے۔

3- کسی بھی حکومت کو ایسے سیاسی صلاح مشورے دینا کہ وہ امریکی پالیسیاں اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے۔

4- اقلیتوں' طلبہ کی یونینوں اور مزدوروں کے سودا کاری ایجنٹوں کو مالی امداد فراہم کرنا۔

5- سائنس دانوں' دانشوروں اور سکالروں کے لئے سیمینار' لیکچرز اور فلم پروگرام سپانسر کرنا تاکہ ان کے ذہنوں میں امریکی سوچ پیدا کی جا سکے۔ منتخب افراد کو امریکی بیویاں اور شاندار ملازمتیں فراہم کر کے ان کی وفاداریاں خریدنا۔

6- بعض اہم سیاستدانوں' صحافیوں' سرکاری اہل کاروں اور دیگر اہم عہدیداروں کو رشوت' اعزازات' تحائف اور امداد فراہم کرنا۔

7- کسی بھی ملک کے سیاسی نظام کو اپنی منشاء کے مطابق چلانے کے لئے اپنی پسندیدہ سیاسی جماعت یا سیاستدانوں کو مشاورت اور مالی امداد مہیا کرنا۔

8- اپنی پروردہ سیاسی جماعت کو برسراقتدار لانے کے لئے برسراقتدار حکومت کے خلاف پر تشدد مظاہرے کروانا اور اس مقصد کے حصول کے لئے چلائی جانے والی نام نہاد سیاسی تحریک کو بھرپور مالی امداد فراہم کرنا۔

9- مختلف ممالک کے صدور' وزرائے اعظم' وزراء' جرنیلوں اور سینئر مشیروں کی خدمات سی آئی اے کے ایجنٹ کے طور پر حاصل کرنے کی مذموم کوشش کرنا۔

امریکہ اس خطے میں خاص طور سے دلچسپی لے رہا ہے۔ اور اس کی لالچی نگاہیں نہ صرف (سابق) روس کی چھ اسلامی ریاستوں کے خزانوں پر لگی ہوئی ہیں' بلکہ چین سے آگے بھی دیکھتی ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اسرائیلی ریاست کی ناجائز پیدائش ہوئی اور وہ امریکہ کا لے پالک بچہ بن گیا۔ چنانچہ امریکہ کی خارجہ حکمت عملی اور دفاعی منصوبوں میں اسرائیل کی حفاظت اور ترقی کو نمایاں اور ترجیحی مقام حاصل ہو گیا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری تھا کہ امریکہ بذات خود اس خطے میں آ جائے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی ایران کے بادشاہ رضا شاہ پہلوی سے جا ملتی تھی۔ مگر اسلامی انقلاب کے ہاتھوں ایران کے عوام سے شکست کھانے کے بعد امریکہ کی بساط الٹ گئی' اور وہ اس علاقہ سے عملی طور پر خارج ہو

گیا۔ لیکن امریکہ کی خفیہ ایجنسی سی آئی اے نے اپنا ہیڈ کوارٹر تہران سے اسلام آباد منتقل کر لیا۔

پھر جب روسی فوجیں افغانستان میں داخل ہوئیں تو ایک دفعہ پھر امریکہ کو موقعہ مل گیا کہ وہ اس خطے میں واپس آ جائے اور افغان جہاد میں امداد کا بہانہ بنا کر ایک دفعہ پھر پاکستانی حکمرانوں پر چھا جائے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ پاکستان اور افغانستان صرف اسلامی ممالک سے مدد حاصل کرتے' مگر امریکہ نے ہمیں اپنا دست نگر بننے پر مجبور کر دیا۔ اس کا خمیازہ نہ صرف پاکستان اور افغانستان بلکہ ساری اسلامی دنیا ابھی تک بھگت رہی ہے اور نہ جانے ہمیں کب تک اور کتنا خمیازہ ابھی اور ادا کرنا پڑے گا۔

پاکستان میں سی آئی اے کی مداخلت کس حد تک موجود ہے' اس کا اندازہ پاکستان آرمی کے سابق چیف آف سٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ کے ایک مضمون کے اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے جو "دی مسلم" کی 29 جنوری 1994ء کے شمارے میں شائع ہوا:

"امریکہ نے پاکستان کی سابق غیر جمہوری حکومتوں میں اعلیٰ ترین عہدوں پر اپنے ایجنٹس تعینات کر رکھے تھے تاکہ وہ پاکستان کے پورے سیاسی و سماجی نظام کو تہہ و بالا کر سکے اور اسے اپنے مقاصد کے حصول میں آسانی رہے۔ ہمیں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں اور سی آئی اے کے ایجنٹوں اور ان "آقاؤں" سے نجات حاصل کریں۔"

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں۔ کیا ہمارے گرد یہ حلقہ روز بروز اور زیادہ تنگ نہیں کیا جا رہا اور ہم اس دلدل میں زیادہ نہیں دھنستے جا رہے؟



کالی دوپہر

سانحۂ مشرقی پاکستان کے بعد 77-1976ء کا سال بجا طور پر پاکستان کی تاریخ کا سیاہ ترین زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے' کہ اس سال قوم نے ایک منتخب جمہوری حکومت کا تختہ الٹنے اور ملک کو مارشل لاء کے اندھیروں کے حوالے کرنے کا قومی سانحہ دیکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ 1970ء کی دہائی کے ان آخری برسوں میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کی مقبولیت میں تیزی سے کمی آ رہی تھی' جس کی بنیادی وجوہات بڑھتی ہوئی کرپشن' نوکر شاہی کا عوام دشمن کردار' پولیس کی تشدد پسندی اور من مانیاں' اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں بار بار اضافہ اور بعض سیاسی "بوزنوں" کی غیر قانونی سرگرمیاں تھیں۔

دوسری طرف ذوالفقار علی بھٹو کی نیشنلائزیشن کی پالیسی کی وجہ سے صنعتکار اور بیکار پریشانی کا شکار تھے' پرائیویٹ سکولوں' شیلرز' تھریشرز اور چاول چھڑنے کے چھوٹے چھوٹے یونٹوں کے بھی قومیائے جانے کی وجہ سے درمیانے درجے کے صنعتکار اور سرمایہ کار بھی اس پالیسی کی وجہ سے حکومت سے بد دل ہو چکے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے برسر اقتدار آنے کے لئے روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگایا تھا مگر وہ اپنے انتخابی منشور کے مطابق عوام کو یہ سب مہیا نہ کر سکے اور ان کی نیشنلائزیشن کی پالیسی نے ملک کی مڈل کلاس کے لئے بھی پریشانیاں پیدا کر دی تھیں۔ بھٹو کی اس پالیسی کو عوام کی جانب سے تو قبولیت کی سند حاصل نہ ہو سکی مگر پی پی کے چند ارکان اور ٹریڈ اور لیبر یونینوں کے عہدیداران بہرحال اس پالیسی پر بے حد خوش تھے۔ مختلف عوامی حلقوں میں نیشنلائزیشن کے خلاف چہ میگوئیاں اور ردعمل کا اظہار شروع ہو گیا تھا اور وہ اس پالیسی کو تبدیل کرنے کا مطالبہ کرنے لگے تھے۔

اس بحرانی کیفیت سے نکلنے اور بڑھتی ہوئی تنقید اور مخالفت کا زور کم کرنے کے لئے ذوالفقار علی بھٹو نے قوم سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور پانچ برس تک حکومت کرنے کا گرین سگنل حاصل کرنے کے باوجود انہوں نے دسمبر 1976ء ہی میں عام انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا۔ اس اعلان کے فوراً بعد بھٹو کے خلاف ملک کی تمام چھوٹی بڑی

سیاسی جماعتیں متحدہ جمہوری محاذ کے پلیٹ فارم پر اکٹھی ہو گئیں۔ بھٹو کا یہ اچانک فیصلہ ان کے لئے غیر متوقع تھا۔ تاہم انہیں اس موقع کا شدت سے انتظار بھی تھا۔

جنوری 1977ء میں انتخابات کے شیڈول کا اعلان کیا گیا اور قومی اسمبلی کے انتخابات کے لئے 7 مارچ کی تاریخ مقرر کی گئی' جبکہ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے لئے 10 مارچ کا دن مقرر کیا گیا۔ اپوزیشن لیڈر سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور انہوں نے اپنے تمام تر اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر بھٹو دشمنی میں ایک جھنڈے تلے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس نئے اتحاد کا نام پی این اے یعنی پاکستان قومی اتحاد رکھا گیا اور الیکشن کمیشن سے ایک ہی انتخابی نشان کی درخواست کی گئی۔ اس انتخابی اتحاد میں اپوزیشن کی نو جماعتیں شامل تھیں۔ مفتی محمود مرحوم کو اس اتحاد کا صدر' نوابزادہ نصراللہ خان کو نائب صدر' رفیق احمد باجوہ کو سیکرٹری جنرل اور پیر پگاڑا کو مرکزی پارلیمانی بورڈ کا چیئرمین نامزد کیا گیا۔ پیپلز پارٹی کے انتخابی نشان "تلوار" کے مقابلے میں قومی اتحاد کو "ہل" کا انتخابی نشان الاٹ ہوا۔

اپوزیشن کا یہ غیر متوقع اتحاد' جس میں مختلف قسم کے سیاسی اور مذہبی نظریات رکھنے والی پارٹیاں شامل تھیں' بلاشبہ پیپلز پارٹی کے قائدین کے لئے پریشانی کا باعث تھا۔ اب تک پیپلز پارٹی کی کامیابی کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ اس کے سیاسی مخالفین چھوٹے چھوٹے گروہوں اور ٹکڑوں میں بٹے ہوئے تھے' مگر اب پیپلز پارٹی کو ایک مضبوط اور مربوط انتخابی حکمت عملی کے ساتھ میدان میں اترنا تھا۔

بھٹو کے مشیروں نے انہیں مشورہ دیا کہ پیپلز پارٹی کو ہر حال میں قومی اسمبلی میں دو تہائی اکثریت حاصل کرنا ہو گی کیونکہ اسی سے پارٹی کی بقاء اور مزید 5 برس حکومت کرنے کا جواز وابستہ ہے۔ بھٹو نے اپنی انتخابی مشینری کو بھی یہی ٹارگٹ دیا۔ چنانچہ پی پی پی کی اعلیٰ کمان نے اس ٹارگٹ کو حاصل کرنے کے لئے تمام انتظامی اور تنظیمی ہتھکنڈے استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ نہ صرف اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں بلکہ پولیس کے اہلکاروں نے بھی اس امر کو یقینی بنانے کی کوششیں شروع کر دیں کہ پیپلز پارٹی زیادہ سے زیادہ نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

جوں جوں انتخابی مہم زور پکڑتی جا رہی تھی' بھٹو کی شخصیت اور ان کی پارٹی کے خلاف عوامی ردعمل اور ناپسندیدگی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا' اس کے نتیجے میں اپوزیشن کے ووٹ بینک میں خاطر خواہ اضافہ ہو رہا تھا۔ قومی اتحاد کے راہنماؤں کے حوصلے بڑھ رہے تھے اور انہیں یقین ہوتا جا رہا تھا کہ 7 مارچ کے دن عوام کی اکثریت بھٹو کے خلاف اور ان کے حق

میں اپنا حق رائے دہی استعمال کرے گی اور یوں وہ اپنے حق میں اقتدار کی آئینی تبدیلی کے خواب دیکھنے لگے۔ اس صورتحال کے باوجود یہ بھٹو کی شخصیت کا سحر تھا کہ تمام سیاسی تجزیہ نگار اس بات پر متفق تھے کہ قومی اتحاد کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا اور پیپلز پارٹی قومی اسمبلی میں سادہ اکثریت ضرور حاصل کر لے گی۔

اس صورتحال پر آئی ایس آئی کا تجزیہ بھی اس سے مختلف نہ تھا اور پرائم منسٹر سیکرٹریٹ کو اس ضمن میں جو رپورٹ ارسال کی گئی اس میں بھی انہی حقائق کا اظہار کیا گیا تھا۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کی بدقسمتی تھی کہ وہ نیشنل انٹیلیجنس بورڈ اور پرائم منسٹر سیکرٹریٹ میں اپنے بعض "چاہنے والوں" اور اپنی کچن کیبنٹ کی آراء اور مشوروں پر پوری طرح عمل کر رہے تھے جو انہیں ہر حال میں دو تہائی اکثریت حاصل کرنے کا مشورہ دے رہے تھے اور خود اس مقصد کے حصول کے لئے ہر طرح کے غیر سیاسی ہتھکنڈے استعمال کر رہے تھے۔ غالباً" یہی بھٹو کی سیاسی زندگی کے خاتمے کا آغاز تھا۔

آئی ایس آئی کو ملنے والی بعض غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق بعض حاضر سروس اور ریٹائرڈ پولیس اور انٹیلیجنس آفیسرز نے بھی ان تجزیوں پر سیر حاصل بحث کی تھی مگر نتائج کے بارے میں ان کی آراء میں شدید اختلاف تھا۔

بھٹو خود بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ سیاسی زبان میں اسے جمہوری عمل قرار نہیں دیا جاتا' تاہم آئین کے لحاظ سے یہ درست تھا۔ اپوزیشن نے اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا۔ مگر پیپلز پارٹی کے بعض دیگر مرکزی راہنماؤں نے اسے ایک مثال کے طور پر اپنے سامنے رکھ لیا' چنانچہ ممتاز بھٹو' میر مہتاب بجرانی' فتح محمد اور دیگر صاحبان ثروت و اقتدار نے بھی بھٹو کی تقلید کو عین جمہوری جانا اور وہ بھی تمام سیاسی ضوابط اخلاق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خود کو بلا مقابلہ منتخب کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ انتخابی مہم کے دوران میں سیاسی دھونس دھاندلی سے پوری طرح کام لیا گیا اور اپوزیشن کو ہراساں کرنے میں انتظامیہ نے "شاندار" کردار ادا کیا۔ مثلاً:

1- قومی اتحاد کے بعض راہنماؤں کو انتخابی مہم کے دوران نظر بند کر دیا گیا اور متعدد کو اغوا کر کے نامعلوم مقامات پر پہنچا دیا گیا۔

2- پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن اس حد تک مشتعل اور ہنگامہ آرا ہو گئے تھے کہ قومی اتحاد کے راہنماؤں کو جلسہ گاہوں تک پہنچنے سے روکنا اور ان کے کارکنوں پر تشدد کرنا ان کا معمول بن گیا تھا۔

-3 قومی اتحاد کے جلسوں کو خراب کرنے کے لئے پولیس اور ایف ایس ایف کی مدد سے جلسہ گاہوں میں سانپ یا پانی تک چھوڑنے کے واقعات بھی اخبارات میں شائع ہوئے۔

-4 قومی اتحاد کے بہت سے انتخابی دفاتر میں گھس کر توڑ پھوڑ کی گئی' انہیں نذر آتش کیا گیا اور ان پر فائرنگ کر کے اتحاد کے بعض کارکنوں کو ہلاک بھی کیا گیا۔

ان تمام غیر جمہوری اور منفی رویوں اور ہتھکنڈوں کی وجہ سے نہ صرف بھٹو کی شخصیت کے خلاف نفرت میں اضافہ ہوا' بلکہ پیپلز پارٹی کی مقبولیت میں بھی مزید کمی آنے لگی۔

بالآخر 7 مارچ کا دن آن پہنچا۔ ووٹروں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ وہ جوق در جوق پولنگ بوتھوں کی جانب رواں دواں تھے۔ دوپہر کے بعد جوں جوں سورج کی تمازت میں کمی آ رہی تھی پیپلز پارٹی کے کچھ امیدواروں کو یقین ہوتا جا رہا تھا کہ ان کے بیلٹ بکسوں کی صورتحال وہ نہیں جس کی وہ توقع رکھتے تھے۔ انہیں اس حقیقت کا بخوبی علم ہو چکا تھا کہ 1970ء کی طرح یہ "جھاڑو پھرنے" والا معاملہ نہیں تھا اور ان کے قدم میدان سے اکھڑ چکے تھے۔ چنانچہ بہت سے پولنگ سٹیشنوں پر پی پی پی اور قومی اتحاد کے کارکنوں میں جھڑپیں اور ہاتھا پائی بھی ہوئی۔ یہ اطلاعات بھی مل رہی تھیں کہ پیپلز پارٹی کے پولنگ ایجنٹوں نے بیلٹ بکس تک اٹھا کر لے جانے کی کوشش کی تھی تاکہ کسی "محفوظ مقام" پر ان میں جعلی ووٹ ڈالے جا سکیں۔ اس صورتحال کا لازمی نتیجہ مسلح تصادم اور ایک دوسرے پر فائرنگ کے واقعات کی صورت میں سامنے آیا۔ خواتین کے پولنگ سٹیشنوں پر یہ صورت حال اور بھی گمبھیر تھی' جہاں امن و امان کی حالت انتہائی پریشان کن تھی' یہ پولنگ سٹیشن جنگ و جدل کا نظارہ پیش کر رہے تھے۔ خاص طور پر بوڑھے' بیمار اور خواتین ووٹروں کے پاس تو اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنا حق رائے دہی استعمال کئے بغیر اپنی جان بچا کر گھروں کو لوٹ جائیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ دن پاکستان کی سیاسی تاریخ میں انتخابی دھاندلی کے حوالے سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ 1976ء کے وسط میں آئی ایس آئی کے فیلڈ سٹاف کو یہ ہدایت جاری کی گئی تھی کہ وہ ملکی سیاسی صورتحال کا خاکہ تیار کریں اور پیش نظر رجحانات کی روشنی میں قومی سیاسی مستقبل کے حوالے سے اپنی رپورٹیں مرتب کریں۔ ہمیں جب یہ مطلوبہ رپورٹیں موصول ہوئیں تو ان کا خلاصہ ہماری توقعات کے عین مطابق تھا۔ ہماری اطلاع تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو جونہی عام انتخاب کا اعلان کریں گے' اپوزیشن کی تمام جماعتیں

یکجا ہو جائیں گی اور "پی پی پی حکومت ہٹاؤ" کے نعرے کے ساتھ بھٹو حکومت کے خاتمے کی سر توڑ کوششیں شروع کر دیں گی۔ ہم نے ان اطلاعات کی روشنی میں رپورٹ مرتب کر کے وزیراعظم سیکرٹریٹ کو بھجوا دی۔

چنانچہ جوں جوں سیاسی صورتحال خراب ہونے لگی بھٹو صاحب نے ہماری متوازن' دیانتدارانہ اور محققانہ رپورٹنگ کی وجہ سے آئی ایس آئی پر پہلے سے زیادہ اعتماد کرنا شروع کر دیا۔ جس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ میں نے کئی بار ڈی جی آئی جنرل جیلانی کو بعض احکامات کی تعمیل سے بچنے کا مشورہ دیا' کیونکہ وہ احکامات ہمارے دائرہ فرائض میں شامل نہیں تھے' وہ یا تو سپیشل برانچ کے دائرہ اختیار میں آتے تھے یا پھر آئی بی کی ذمہ داری تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے ذرائع بھی اتنے وسیع نہیں تھے کہ ہم بعض احکامات کی کماحقہ تعمیل کر سکتے۔ مگر بھٹو صاحب کا آئی ایس آئی پر اعتماد اس قدر بڑھ چکا تھا کہ وہ اکثر دوسرے اداروں کو نظرانداز کر کے ہماری رپورٹوں پر انحصار کرنے لگے تھے۔ ادارے میں متعدد بار مختلف اہلکاروں اور افسروں کے دھیمے دھیمے احتجاج کے باوجود یہ سلسلہ جاری رہا اور ہم اپنا فرض منصبی سمجھ کر ان احکامات کی ممکن حد تک تعمیل کرتے رہے۔

آئی ایس آئی بہرحال ہمہ وقت کسی نہ کسی چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے مستعد اور تیار رہتی ہے۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ ہم نے سیاستدانوں کی خفیہ نگرانی کا باقاعدہ اہتمام تو نہ کیا' تاہم بعض سیاسی راہنماؤں کی سرگرمیوں کی انتہائی محتاط اور بے ضرر طریقے سے نگرانی ضرور کی' کیونکہ اس کے لئے ہمیں وزیراعظم کی طرف سے براہ راست ہدایات موصول ہوتی تھیں۔ ہماری رپورٹوں میں یہ نگرانی جاری رکھنے یا ختم کرنے کے بارے میں ہماری سفارشات بھی شامل ہوتی تھیں' تاہم زیادہ تر کیسوں میں وہ ہمیں نگرانی ختم کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔

انتخابات کی کوریج کے لئے ہم نے آئی ایس آئی ہیڈ کوارٹرز اور فیلڈ میں خاصے لمبے چوڑے انتظامات کئے تھے۔ آئی ایس آئی کا ہر اہلکار اس ڈیوٹی کے لئے ایک مخصوص ایریا میں موجود تھا اور ہماری ہدایات کے مطابق انتخابات کی مکمل رپورٹنگ کے لئے تمام ممکن ذرائع سے استفادہ کر رہا تھا۔ ہم نے اپنے دفتر میں مواصلات کا ایک مخصوص نظام بھی قائم کیا تھا جس کی مدد سے ہم فیلڈ سٹاف اور مقامی اور غیر ملکی ریڈیو اور ٹیلی ویژن نیٹ ورکس پر انتخابات کے بارے میں نشر ہونے والی خبروں کی مانیٹرنگ کر رہے تھے۔ جونہی ہمیں ان ذرائع سے کوئی نتیجہ یا اہم اطلاع موصول ہوتی ہم اس کو ریکارڈ کر لیتے۔

8 مارچ کو رات کے 2 بجے بھٹو صاحب نے فون پر ہم سے تازہ ترین نتائج کے بارے میں دریافت کیا۔ جنرل جیلانی بذات خود اس وقت دفتر میں موجود تھے' انہوں نے اس وقت تک موصول ہونے والے نتائج کے بارے میں بھٹو صاحب کو تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ ٹیلی فون بند کرنے سے پہلے بھٹو صاحب نے جنرل جیلانی سے کہا:

"Go and kick at the ... of Akram Sheikh (Director IB). He is sleeping and so is his duty officer in IB."

جنرل جیلانی نے فون بند ہوتے ہی آئی ایس آئی کے ایک آفیسر کو شیخ اکرم کے گھر بھیجا اور انہیں آپریشن روم میں بلوا لیا۔ ہم نے شیخ صاحب کو اب تک کے نتائج کے بارے میں بریف کیا اور کہا کہ "پرائم منسٹر صاحب آپ سے ناراض ہیں' آپ انہیں ابھی فون کر کے یہ سب نتائج بتا دیجئے۔" اب اکرم شیخ صاحب کی نیند اڑ چکی تھی' وہ فون کرنے سے ہچکچا رہے تھے' تاہم ہمارے کہنے پر وہ بادل نخواستہ فون کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

8 مارچ کا سورج طلوع ہوا تو پاکستان پیپلز پارٹی "بھاری اکثریت" سے قومی اسمبلی کا انتخاب جیت چکی تھی مگر اپوزیشن کے ارکان نے حسب توقع ان نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور 10 مارچ کو ہونے والے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان بھی کر دیا۔ قومی اتحاد کے منتخب ارکان قومی اسمبلی سے کہا گیا کہ وہ اپنی نشستوں سے استعفے دے دیں۔ اس کے علاوہ 11 مارچ کو انتخابات میں حکومت کی مبینہ دھاندلی کے خلاف ملک گیر ہڑتال کا اعلان کر دیا گیا۔ اس صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے اپنی رپورٹوں کی روشنی میں ایک حتمی رپورٹ مرتب کی' جس میں قومی اتحاد کے ان 33 امیدواروں کے نام بھی درج کیے جن کے حلقوں میں ہماری اطلاعات کے مطابق دھاندلی ہوئی تھی۔ ہم نے اس رپورٹ میں یہ تجویز کیا کہ کسی بھی بڑے سیاسی بحران سے بچنے کے لئے ان 33 نشستوں کے انتخاب کو کالعدم قرار دے کر یہاں نئے سرے سے انتخاب کرانے کا اعلان کر دیا جائے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہو گا کہ قومی اتحاد کا مطالبہ پورا ہو جائے گا' اس کے علاوہ ووٹروں کا حکومت پر اعتماد بھی بڑھے گا اور اپوزیشن میں حکومت کے خلاف غصے کی جو لہر اٹھی ہے وہ بھی سرد پڑ جائے گی۔ مگر ہماری اس تجویز کو تسلیم نہ کیا گیا جس کی درج ذیل وجوہات ہو سکتی ہیں۔

1- ایسا کرنے کا مطلب حکومت کی جانب سے دھاندلی کے الزام کو قبول کرنا تھا اور قومی اتحاد اس کے بعد مزید مطالبات کر سکتا تھا۔

2- پاکستان پیپلز پارٹی کی وہ دو تہائی اکثریت ختم ہو جاتی جس کی بھٹو صاحب کو

شدید خواہش تھی اور جس کے حصول کے لئے ان کے ساتھیوں نے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کئے تھے۔

3- پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار ان 33 حلقوں میں دوبارہ انتخاب لڑنے کے لئے تیار نہیں تھے' کیونکہ انہیں اپنی شکست واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔

4- وزیراعظم سیکرٹریٹ نے ہماری سفارشات کی منطق کو سمجھنے کی کوشش نہ کی اور اس طوفان کا اندازہ لگانے میں ناکام رہا جو بڑی تیزی کے ساتھ بھٹو کی حکومت کے ایوانوں کو ہلانے کے لئے بڑھ رہا تھا۔

11 مارچ کو قومی اتحاد کی ہڑتال کامیاب رہی۔ بھٹو صاحب نے بالاخر اس بات کو تسلیم کر لیا کہ بعض حلقوں میں دھاندلی ہوئی ہے۔ تاہم انہوں نے قومی اتحاد کے اس مطالبے کو سرے سے مسترد کر دیا کہ ایک غیر جانبدار قومی حکومت' فوج کی نگرانی میں نئے سرے سے انتخابات کرائے۔ یہیں سے پاکستان کی سیاسی تاریخ کے اس تاریک باب کا آغاز ہوتا ہے جو بعدازاں ملکی تاریخ کے طویل ترین مارشل لاء پر منتج ہوا۔ اس عرصے میں' قومی اتحاد کے بعض راہنماؤں کا "غیر ملکی آقاؤں" سے رابطہ ہو چکا تھا اور کارکنوں کو سڑکوں پر لانے کا اس سے اچھا موقع شاید کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ احتجاجی جلوس آہستہ آہستہ زور پکڑنے لگے اور یہ روز کا معمول بن گئے۔ کئی ایک مقامات پر دفعہ 144 اور کرفیو کا نفاذ بھی کیا گیا۔ مگر پولیس اور ایف ایس ایف کی غیر محتاط اور جارحانہ کارروائیوں کی وجہ سے صورتحال روز بہ روز بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ قومی اتحاد کے بہت سے راہنماؤں کو نظر بند کر دیا گیا۔ کارکنوں پر لاٹھی چارج اور فائرنگ کے واقعات روز کا معمول بن گئے' جن کے نتیجے میں کئی کارکن ہلاک اور زخمی بھی ہوئے اور پاکستان کی جیلیں ان کارکنوں سے بھرنے لگیں۔ آخر کار قومی اتحاد کی احتجاجی تحریک انتہا کو پہنچ گئی اور صورتحال بجائے خود اپوزیشن کے راہنماؤں کے قابو سے باہر ہو گئی۔

9 اپریل کا دن بھٹو کی حکومت کے خاتمے اور خود ان کے نصیب کے سیاہ ترین دن کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس روز لاہور' کراچی' حیدر آباد' پشاور' گوجرانوالہ' گجرات' راولپنڈی' کوئٹہ' فیصل آباد اور ساہیوال میں بڑے بڑے احتجاجی جلوس نکالے گئے اور پولیس نے "کارروائی" کی انتہا کر دی۔ جہاں کہیں بھی کوئی اجتماع دکھائی دیا' پولیس نے بلا دریغ فائرنگ کی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے انہیں "دیکھتے ہی گولی مار دو" کا حکم مل گیا ہو۔ ریکارڈ کے مطابق اس روز صرف لاہور میں قومی اتحاد کے 30 کارکن ہلاک ہوئے۔

لاہور میں قومی اتحاد کے جلوسوں میں شامل خواتین سے "نمٹنے" کے لئے پولیس نے ایک خصوصی "خواتین پولیس فورس" قائم کی تھی' جس میں اندرون شہر کے غریب گھروں کی مضبوط اعصاب والی صحت مند' سخت گیر اور کرخت رویے والی خواتین شامل تھیں۔ اس فورس کو عوام نے "نتھ فورس" کا نام دیا۔ یہ خواتین' احتجاجی جلوسوں میں شامل خواتین پر بے دریغ لاٹھی چارج کرتیں اور سرعام ان کے کپڑے پھاڑنے سے بھی گریز نہ کرتیں۔ جلوسوں میں شامل کئی ایک خواتین کو اپنی برہنگی چھپانے کے لئے اپنے پھٹے ہوئے کپڑوں کو سمیٹنے اور پناہ کے لئے بھاگتے ہوئے دیکھا گیا۔ "نتھ فورس" کی ان کارروائیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے پنجاب یونیورسٹی کے ہاسٹل نمبر 2 میں اسلامی جمعیت طلباء کے بعض ارکان نے ایک خصوصی سٹوڈنٹس سیل قائم کیا' جس کے ارکان موقع ملتے ہی ان لیڈی کانسٹیبلوں کو اغوا کر لیتے اور ہاسٹل کے کمروں میں لے جا کر "حساب" برابر کر دیتے۔ بالآخر "نتھ فورس" ختم کر دی گئی' کیونکہ اس کا وجود انتظامیہ کی نیک نامی کے بجائے بدنامی کی وجہ بن رہا تھا۔

اس تحریک کا ایک اور اہم پہلو یہ تھا کہ جمعیت العلمائے پاکستان نے "بھٹو ہٹاؤ" تحریک کو نظام مصطفیٰؐ کے نعرے کے حوالے سے ہائی جیک کر لیا اور جو تحریک حکومت کی انتخابات میں مبینہ دھاندلی اور دوبارہ انتخابات کرانے کے مطالبے کے حوالے سے شروع ہوئی تھی' وہ نفاذ نظام مصطفیٰؐ کے مطالبے کی تحریک بن گئی۔ یہ نعرہ اس قدر مقبول ہوا کہ قومی اتحاد کے بیشتر حامی اسے اپنے ایمان کا حصہ بنا بیٹھے۔ اب ان کے نزدیک اس نظام کے نفاذ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ذوالفقار علی بھٹو کی ذات سمجھی جاتی تھی۔ اس نعرے کو اس قدر خوبصورتی سے اس سیاسی تحریک کا عنوان بنایا گیا کہ لوگ یہ سمجھنے لگے کہ ملک سے تمام برائیوں کے خاتمے کا انحصار اس نظام کے نفاذ پر ہے۔ یوں بھٹو کی شخصیت ان تحریکوں کا سب سے بڑا نشانہ بن گئی اور اب بظاہر صرف یہی ایک مقصد حیات تھا کہ ہر قیمت پر بھٹو سے چھٹکارا حاصل کیا جائے اور نظام مصطفیٰؐ نافذ کیا جائے۔

اسلامی جمعیت طلباء کے مسعود کھوکھر اس قسم کے نعرے گھڑنے میں خاص مہارت رکھتے تھے اور قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل رفیق باجوہ اپنی لچھے دار تقریروں کی وجہ سے عوام میں خاصی مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ تاہم ان کا سیاسی مداری پن زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ جماعت اسلامی جو اس تحریک میں ہر اول دستے کا کردار ادا کر رہی تھی' باجوہ کی مصروفیات پر بھی کڑی نظر رکھے ہوئے تھی۔ چنانچہ پروفیسر خورشید احمد نے قومی اتحاد کی قیادت کو اسلام آباد میں باجوہ کی بھٹو سے ہونے والی ملاقات کی مکمل تفصیلات فراہم کر دیں۔

نتیجتاً نظام مصطفیٰ کے نعرے کے خالق رفیق باجوہ کو اتحاد کی سیکرٹری جنرل شپ سے الگ کر دیا گیا اور ان کی جگہ جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد کو سیکرٹری جنرل بنا دیا گیا۔

اس تحریک میں جماعت اسلامی کے انتہائی فعال ہونے کے بارے میں خاص طور سے حیرت کا اظہار کیا جا رہا تھا' مگر ہمیں مصدقہ اطلاعات موصول ہو رہی تھیں کہ جماعت اسلامی کے کارکن اور قائدین بھٹو کے خلاف ہونے والے مظاہروں کو کامیاب بنانے کے لئے کثیر سرمایہ خرچ کر رہے ہیں۔ ہماری اطلاعات کے مطابق اسلامی جمعیت طلباء کے کارکن کئی مقامات پر بموں کے دھماکوں میں بھی ملوث تھے۔ ایک طرف تو جماعت اسلامی اور اس کے چند قائدین کے اہل خانہ کو ان مظاہروں کے لئے کثیر رقوم انتہائی خفیہ طریقے سے باہر سے موصول ہو رہی تھیں اور دوسری طرف مقامی صنعتکار اور بزنس مین جو بھٹو کی نیشنلائزیشن پالیسی سے نالاں تھے' اس تحریک کے لئے وافر فنڈز مہیا کر رہے تھے' تاہم اس سرمائے کا زیادہ تر حصہ ان مظاہروں کی قیادت کرنے والوں کی جیبوں میں جا رہا تھا۔ انتظامیہ اس قدر بے بس ہو چکی تھی کہ سرمائے کے اس سیلاب کو روکنا اس کے لئے ناممکن تھا۔

تحریک کو مزید موثر بنانے کے لئے ایک عجیب و غریب طریقہ کار اختیار کیا گیا۔ نظام مصطفیٰ کے حق میں نکالے جانے والے جلوسوں میں دینی مدارس کے نوجوان طلباء جوق در جوق شریک ہو رہے تھے۔ انہوں نے کرفیو کے اوقات اور نماز عشاء کے بعد تسلسل سے مساجد اور اپنے گھروں کی چھتوں پر اذانیں دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہماری اطلاعات کے مطابق بیشتر "معزز موذنوں" کو 15 روپے فی اذان کے حساب سے ادائیگی کی جا رہی تھی۔ یہ طریقہ کار تحریک کے جذبے کو قائم رکھنے کے لئے انتہائی کارگر ثابت ہوا اور آخر نظام مصطفیٰ کے نفاذ کا مطالبہ بھٹو کے مضبوط اعصاب پر حاوی ہو گیا۔

اس پریشر کو زائل کرنے کے لئے بھٹو نے عجلت میں بعض ایسے اقدامات کا اعلان کیا جس سے اسلامی نظام کے نفاذ کا تاثر ملتا تھا مثلاً پورے ملک میں فوری طور پر نائٹ کلب' ریس کلب' جوئے خانے بند کر دیئے گئے اور شراب کی خرید و فروخت پر پابندی لگا دی گئی۔ اتوار کی بجائے جمعہ کو سرکاری تعطیل کا دن قرار دے دیا گیا اور اسلامی نظریاتی کونسل کی از سر نو تشکیل کا اعلان بھی کیا گیا۔ مگر تحریک جس مقام پر پہنچ چکی تھی ان اقدامات نے اس پر کوئی غیر معمولی اثر نہ ڈالا۔ عوام کی بڑی تعداد ان اعلانات سے بھی مطمئن نہ ہوئی اور اب ان کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ بھٹو استعفیٰ دیں' اسمبلیاں توڑ دی جائیں' نظام مصطفیٰ نافذ کیا

جائے اور فوج کی نگرانی میں دوبارہ انتخابات کرائے جائیں۔

18 اپریل کو کراچی کے انسپکٹر جنرل پولیس حاجی حبیب الرحمن نے وزیراعظم کو مشورہ دیا کہ حالات پولیس کے قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں' پولیس دن رات کی مسلسل ڈیوٹی سے تھک چکی ہے' اس لئے یہ بہتر ہو گا کہ فوج کو بلا لیا جائے' کیونکہ فوج کو عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس لئے فوج کے آتے ہی حالات بہتر ہو جائیں گے' انہوں نے اپنی رپورٹ میں مزید کہا کہ اول تو پولیس پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ چند پولیس اہلکاروں نے ائیر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان کو ہاتھ کی انگلیوں سے V کا نشان بھی دکھایا ہے' دوسرے اگر پولیس پچاس یا سو آدمی مار بھی دیتی ہے تو بھی حالات قابو میں نہیں آئیں گے' اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہو گیا ہے کہ قومی اسمبلی کا اجلاس بلایا جائے۔

22 اپریل کو کراچی' حیدر آباد اور لاہور میں فوج کو سول انتظامیہ کی مدد کے لئے بلا لیا گیا اور 14 مئی کو ملتان میں بھی فوج طلب کر لی گئی۔ بھٹو اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے تمام ممکنہ اقدامات کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے 4 اہم فیصلے کئے :

1- سول انتظامیہ کی مدد کے لئے فوج طلب کی گئی۔
2- تحریک کو دبانے کے لئے بھاری تعداد میں پولیس اور ایف ایس ایف کے دستوں کی تعیناتی کی گئی۔
3- پیپلز پارٹی کے متعدد راہنماؤں کو اسلحہ فراہم کیا گیا تاکہ وہ مقامی طور پر قومی اتحاد کے کارکنوں سے مقابلہ کر سکیں۔
4- قومی اتحاد کے راہنماؤں کے ساتھ مذاکرات کا آغاز کیا گیا تاکہ اسمبلیوں کی تحلیل سے ہٹ کر کسی متفقہ فارمولے پر اتفاق حاصل کیا جا سکے۔

بھٹو صاحب کے لئے سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ عوام نے فوج پر بھی کھلم کھلا تنقید شروع کر دی۔ فوج کے خلاف 1971ء کے سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے نعرے بھی لگائے گئے۔ لاہور میں X کے نشان والی پرانی پتلونیں فوجی دستوں پر پھینکی گئیں۔ اور نعرے لگائے گئے "یہ وہ پتلونیں ہیں جو آپ ڈھاکہ چھوڑ آئے تھے۔" (بھارت نے ہمارے فوجی جنگی قیدیوں کو واپسی پر X کے نشان والی پتلونیں پہنائی تھیں۔) یہ سراسر پاک فوج کی تضحیک تھی جو بہرحال ناقابل برداشت تھی۔

ایک دن کراچی میں ریلوے لائن کی حفاظت پر مامور بعض فوجیوں کو نوجوان لڑکیوں کے ایک گروہ نے اس قدر پریشان کیا کہ انہوں نے اپنی ڈیوٹی ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ ہمیں یہ

اطلاعات بھی مل رہی تھیں کہ فوجی دستے ہجوم پر فائر کرنے کے احکامات بھی بجا نہیں لا رہے تھے اور محض ہوائی فائرنگ پر اکتفا کر رہے تھے۔ لاہور میں تین بریگیڈ کمانڈروں' بریگیڈیئر نیاز' بریگیڈیئر اشفاق اور بریگیڈیئر اشرف نے سول انتظامیہ کی مدد سے صاف انکار کر دیا اور انٹرنل سیکورٹی ڈیوٹیز سے اپنے تبادلے کے لئے درخواست بھی دے دی۔ ایک موقع پر بریگیڈیئر اشرف نے ایک بپھرے ہوئے ہجوم کو دیکھ کر اپنی انگلیوں سے وکٹری کا نشان بھی بنایا' جسے دیکھ کر ہجوم نے بھرپور نعرہ بازی کی اور خوشی کا اظہار کیا۔

مسٹر عزیز احمد جو ان دنوں پاکستان کے وزیر خارجہ تھے' کراچی میں گیریژن آفیسرز کے ایک اجتماع سے خطاب کے لئے گئے۔ انہوں نے اپنی تقریر کے اختتام پر حاضرین سے کہا "کوئی سوال۔؟" اتنا کہنا تھا کہ وزیر خارجہ پر سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی۔ افسروں نے ملک کے اندرونی سیاسی صورتحال کے بارے میں ایسے ایسے چبھتے ہوئے سوالات کئے کہ وزیر خارجہ بوکھلا گئے اور ان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ان کی حالت دیدنی تھی۔ بالآخر گیریژن کمانڈر کو مداخلت کرنا پڑی' وزیر خارجہ کو اس مشکل صورت حال سے نکالنے کے لئے انہوں نے یہ اعلان کر کے اجلاس کے اختتام کا اعلان کر دیا کہ "چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے"۔

چند روز بعد خود وزیراعظم بھٹو انہی آفیسروں سے خطاب کے لئے گئے' مگر انہوں نے اپنی تقریر ختم کرتے ہی سٹیج چھوڑ دیا اور کسی کو سوالات کرنے کی دعوت نہ دی کیونکہ وہ اجتماع میں آتے ہی ان افسروں کے چہروں پر لکھے ہوئے سوالات پڑھ چکے تھے۔ اس طرح کے کئی اور واقعات ہم وزیراعظم کے علم میں لا چکے تھے اور ہمارے خیال میں بھٹو صاحب کو سول انتظامیہ کی مدد کے لئے فوجی دستوں کی تعیناتی سے روکنے کے لئے یہی کافی تھا۔ اتنے وسیع پیمانے پر ہونے والی ہنگامہ آرائی اور جلوس بازی کو طاقت سے روکنے کے بجائے اس کا کوئی قابل قبول سیاسی حل ڈھونڈنا ضروری تھا۔ فوج میں اس حوالے سے کسی طرح کی بغاوت کے آثار تو نمایاں نہ تھے' تاہم فوجی جوان اس ناپسندیدہ ڈیوٹی سے کتراتے ضرور تھے۔

مئی میں قومی اتحاد کے سرکردہ لیڈر ایئر مارشل ریٹائرڈ اصغر خان نے افواج کو بغاوت پر آمادہ کرنے کے لئے ایک تفصیلی خط لکھا۔ اس خط کا بعدازاں قومی پریس میں بہت چرچا بھی ہوا۔ اس خط میں انہوں نے افواج پاکستان کو مشورہ دیا کہ وہ حکومت کے احکامات کی تعمیل نہ کریں' کیونکہ یہ حکومت غیر آئینی تھی۔ اس خط کے مندرجات سے یہ بات پوری طرح واضح تھی کہ اصغر خان نے فوج کو نہ صرف بغاوت کا مشورہ دیا تھا بلکہ عنان حکومت سنبھال لینے کی اپیل بھی کی تھی۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے ان کا خط ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:

مئی 1977ء

میرا یہ پیغام چیف آف سٹاف اور پاکستان کی ڈیفنس سروسز کے تمام آفیسوں کے نام ہے!

آپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ آپ پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کریں اور اپنے افسران بالا کے تمام قانونی احکامات بجا لائیں۔ تاہم قانونی اور غیر قانونی احکامات میں فرق کو سمجھنا بھی آفیسرز کی ذمہ داری ہے۔ آپ میں سے ہر ایک کی یہ اخلاقی اور پیشہ ورانہ ذمہ داری ہے کہ آپ کسی بھی حکم کو بجا لانے سے پہلے یہ سوچیں کہ فوج اس وقت جو کر رہی ہے' کیا یہ سب قانونی ہے۔ اگر آپ کا ضمیر یہ کہتا ہے کہ یہ غیر قانونی ہے اور آپ اس کے باوجود اس پر عمل کرتے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ میں اس اخلاقی جوہر کی کمی ہے جو قدرت کی طرف سے سب کو ودیعت ہوا ہے۔ علاوہ ازیں ایسے احکامات پر عمل کرنے کی وجہ سے آپ اپنے ملک اور پاکستان کے عوام کے مجرم اور گنہگار ہیں۔

اب تک آپ کو اندازہ ہو چکا ہو گا کہ مشرقی پاکستان کا فوجی ایکشن ملک کے خلاف ایک سازش تھی اور موجودہ وزیراعظم نے اس سازش میں میکاوئی والا کردار ادا کیا تھا۔ آپ کو یہ بھی علم ہے کہ بلوچستان میں کن حالات میں فوجی کارروائی کی گئی اور یہ اقدام کس حد تک غیر ضروری تھا۔ آپ کو گذشتہ برس صوبہ سرحد کے علاقہ دیر میں کئے گئے انتہائی غیر ضروری فوجی ایکشن کے بارے میں بھی علم ہو گا۔ اگر آپ کو قومی امور میں ذرہ برابر بھی دلچسپی ہے تو آپ کو یقیناً علم ہو گا کہ گذشتہ انتخابی مہم کے دوران میں پاکستان کے عوام نے موجودہ حکومت کو مکمل طور پر مسترد کر دیا تھا۔ مگر عوام کے اس زبردست استرداد کے باوجود کیا یہ بات آپ کے لئے حیرت کا باعث نہیں کہ عوام کی زبردست حمایت کے باوجود قومی اتحاد کو پنجاب سے قومی اسمبلی کی 116 نشستوں میں سے صرف 8 نشستوں کا حقدار قرار دیا گیا۔ یہ حقیقت بھی آپ کے علم میں ہو گی کہ ہمارے متعدد امیدواروں کو کاغذات نامزدگی تک داخل کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ کیا یہ محض ایک اتفاق ہے کہ وزیراعظم اور چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کے خلاف کسی بھی امیدوار نے کاغذات نامزدگی داخل نہیں کرائے؟ حالانکہ اصل صورتحال یہ ہے کہ ایسی کوشش کرنے والوں کو متعدد راتیں پولیس کی حراست میں گزارنا پڑیں اور ان میں سے ایک ابھی تک لاپتہ ہے۔

آپ میں سے جو افراد 7 مارچ کو انتخابی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔ انہیں اس امر سے بھی آگاہی ہو گی کہ ان انتخابات میں مزموم حد تک دھاندلی کی گئی۔ قومی اتحاد کے وہ

سینکڑوں' ہزاروں بیلٹ پیپر جو بیلٹ باکسز سے نکالے گئے تھے پاکستان کی گلیوں اور کھیتوں میں اڑتے ہوئے دکھائی دیئے۔ آپ لوگوں نے 10 مارچ کو قومی اتحاد کے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے بائیکاٹ کے بعد پولنگ سٹیشنوں کی ویرانی بھی دیکھی ہو گی جبکہ سرکاری میڈیا سارا دن یہ پراپیگنڈہ کرتا رہا کہ رائے دہندگان نے بہت بڑی تعداد میں اپنا حق رائے دہی استعمال کیا۔

مجھے یقین ہے کہ آپ نے اس قومی تحریک کو بھی بنظر غور دیکھا ہو گا جو مسٹر بھٹو سے استعفیٰ اور ملک میں نئے انتخابات کا مطالبہ کر رہی ہے۔ آپ ان جلوسوں میں ان سینکڑوں خواتین کی موجودگی کو کیسے فراموش کر سکتے ہیں جو مختلف شہروں اور صوبوں میں اپنے بچے گود میں لئے گھروں سے نکل آئی تھیں۔ یہ وہ خواتین ہیں جن کے بارے میں مسٹر بھٹو کا دعویٰ ہے کہ وہ ان کی ووٹر ہیں۔ چند ہی دنوں میں اس تحریک نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عوام نے مسٹر بھٹو اور ان کی حکومت کو یکسر مسترد کر دیا ہے۔ ہمارے سینکڑوں نوجوانوں کی موت اور ہماری ماؤں اور بہنوں پر وحشیانہ لاٹھی چارج کے مناظر نے یقیناً آپ کی گردنیں شرم اور افسوس سے جھکا دی ہوں گی۔ کیا آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ لوگ خود کو مصیبت میں کیوں ڈال رہے ہیں؟ ہماری مائیں اپنے بچوں کو گود میں لئے گولیاں کھانے کے لئے سڑکوں پر کیوں نکل آئی ہیں؟ والدین بخوشی اپنے بچوں کو پولیس کی لاٹھیاں اور گولیاں کھانے کے لئے گھروں سے جانے کی اجازت کیوں دے رہے ہیں؟ ان سوالات کا صرف ایک ہی جواب ہے کہ ان لوگوں کو یقین ہے کہ ان کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ انہیں گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان سے اپنی مرضی سے اپنے حکمران منتخب کرنے کا بنیادی حق چھینا جا رہا ہے۔ جب ان کو یہ حقیقت بتائی گئی کہ اس آئین کی بے حرمتی کی گئی ہے جس کے دفاع کی انہوں نے قسم بھی کھائی ہے تو انہیں اس حقیقت کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کا آرٹیکل (3) 218 کہتا ہے "انتخابات کے لئے قائم کئے گئے الیکشن کمیشن کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ملک میں انتخابی عمل کے انتظامات کرے اور اس بات کو یقینی بنائے کہ یہ انتخابات دیانتدارانہ' منصفانہ' صاف ستھرے اور قانون کے عین مطابق ہوں۔ الیکشن کمیشن کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ انتخابات میں دھاندلی اور غیر قانونی طریقہ کار کا سدباب بھی کرے۔

مگر میرے دوستو! یہ انتخابات نہ تو دیانتدارانہ تھے اور نہ ہی غیر جانبدارانہ۔ مسٹر بھٹو ملک کے آئین اور عوام کے خلاف ایک مجرمانہ فعل کے مرتکب ہوئے ہیں۔ کیا یہ آپ کا

فرض نہیں کہ آپ نہ تو غیر قانونی حکومت کی حمایت کریں اور نہ ہی آپ کا یہ آئینی فریضہ ہے کہ جب آپ کو اپنے ہی بھائی بندوں پر گولی چلانے کا حکم دیا جائے تو آپ اس کی تعمیل کریں۔ وہ صرف اپنی حکومت کو طول دینے کے لئے ایسے احکامات دے رہے ہیں۔ کیا آپ یہ الزام اپنے سر لینا پسند کریں گے کہ پاکستانی فوج' پاکستانی پولیس کا ایک ذیلی ادارہ ہے جو نہتے عوام پر گولی چلا کر فخر محسوس کرتا ہے۔ آپ اس نوجوان کی موت کو کس طرح جائز قرار دے سکتے ہیں جسے گذشتہ روز لاہور میں فوجی ٹرک کو دیکھ کر "V" کا نشان بنانے کے جرم میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ ہمیں تو اپنے نوجوانوں کے ان فطری جذبوں کو بڑھانے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔ اس قسم کے واقعات فوج کے چہرے پر بھی بدنما داغ لگانے کی کوشش ہیں۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ اس نوع کے داغ مٹانا ناممکن ہوتا ہے۔ اسی طرح کراچی میں ایک نہتے ہجوم پر فوج کی فائرنگ بھی ناقابل معافی جرم ہے۔ آپ اس حقیقت کو کیوں بھول گئے ہیں کہ پاکستان کی تاریخ کے 30 بدترین برسوں میں پاکستان کے غریب اور بھوکے عوام نے ہمیشہ اپنی افواج کو محبت اور عقیدت کی نظروں سے دیکھا ہے۔ یہ عوام اس وقت دھاڑیں مار کر روئے تھے جب آپ نے مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالے تھے۔ عوام نے ہمیشہ آپ کی کامیابی کے لئے دعائیں کی ہیں۔ انہوں نے اپنے اور اپنے بچوں کے پیٹ پر پتھر اس لئے باندھے ہیں کہ آپ کے پیٹ بھرے رہیں اور پاک فوج کے سینئر آفیسرز اور جرنیل اپنے برطانوی اور امریکی ہم عصروں سے بھی بہتر زندگی گزار سکیں' ایک ایسی زندگی برطانوی اور امریکی جرنیل جس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ آپ کے لئے وہ محبت ابھی ختم نہیں ہوئی' نہ ہی وہ محبت ابھی تک نفرت میں تبدیل ہوئی ہے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوتا ہے تو یہ پاکستان کی تاریخ کا ایک ایسا سانحہ ہوگا جس کا ہم زندگی بھر ازالہ نہ کر سکیں گے۔

باضمیر لوگوں کی طرح یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ اپنے فرائض ذمہ داری سے ادا کریں' مگر ان حالات میں ایک غیر قانونی حاکم کی اندھی طاقت بننا آپ کے فرائض کا تقاضا نہیں ہے۔ قوموں کی تاریخ میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب ہر شخص خود سے یہ سوال ضرور کرتا ہے کہ وہ اپنے فرائض درست طریقے پر انجام دے رہا ہے یا نہیں؟ آپ کے لئے بھی یہ وقت آ چکا ہے۔ میری اس اپیل کا جواب ایمانداری سے دیجئے اور پاکستان کو بچا لیجئے!

خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔

ایم اصغر خان"

آئی ایس آئی کے سروے اور اندازوں کے مطابق اس خط کی وجہ سے فوج میں کوئی سنجیدہ رد عمل دیکھنے میں نہ آیا اور اسے ایک پریشان ذہن سیاسی لیڈر کا "پاگل پن" قرار دے کر مسترد کر دیا گیا۔ جس آفیسر کو بھی یہ خط موصول ہوا' اس نے پکڑے جانے کے ڈر سے وہیں اسے ریزہ ریزہ کر دیا' یہاں تک کہ اس خط کی کاپی حاصل کرنا بھی ہمارے لئے مشکل ہو گیا۔ اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ خوش قسمتی سے افواج پاکستان ڈسپلن اور اپنے کمانڈر کی اطاعت کے حوالے سے ایک شاندار روایت کی حامل ہیں۔ تاہم اگر بگڑتی ہوئی سیاسی صورتحال کے تناظر میں دیکھا جائے تو پاک فوج صورتحال کا ایک قابل قبول حل چاہتی تھی' مگر اپنے ہی عوام پر گولی چلانے کے ناخوشگوار فریضے کو ادا کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ یہ عوام کے ساتھ ان کی محبت کا اظہار ہی تھا کہ انہوں نے اپنے بھائیوں کی جانب سے گالیوں اور طعنوں کو انتہائی ہمت اور حوصلے سے سہا اور کہیں بھی کسی انتقامی کارروائی کا ایک بھی واقعہ رونما نہ ہوا۔ بریگیڈیئر نیاز' بریگیڈیئر اشفاق اور بریگیڈیئر اشرف کو سول انتظامیہ کو امداد فراہم کرنے کے سلسلے میں عوامی دباؤ محسوس کرنے کے بعد اپنے ہاتھ کھڑے کر دینے کی بجائے بہترین صلاحیتوں' ڈسپلن اور ذمہ داری کا مظاہرہ کرنا چاہئے تھا۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے' پی پی پی کے چند مقامی لیڈر اپنے طور پر قومی اتحاد کے مظاہرین سے نمٹنے کے لئے بے چین تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہمیں اس بات کی اجازت کے ساتھ اسلحہ بھی فراہم کر دیا جائے تو ہم صرف دو روز میں قومی اتحاد کے ساتھ معاملہ "طے" کر سکتے ہیں۔ اس کا عملی مظاہرہ اس وقت شروع ہوا جب قومی اتحاد کے جلوسوں کے جواب میں پیپلز پارٹی نے بھی جلوس نکالنے شروع کر دیئے۔ یہ جلوس قومی اتحاد کے جلوسوں کے مقابلے میں چھوٹے ہوتے تھے مگر ان کا جوش و خروش بعض اوقات دس گنا زیادہ ہوتا۔ ان جلوسوں کے غیض و غضب سے بھرے ہوئے شرکاء قومی اتحاد سے تعلق رکھنے والوں کے دفاتر اور جائیدادوں کو آگ لگانے سے بھی گریز نہ کرتے۔

ایک اور یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ بھٹو صاحب نے پہلے سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے پاک فوج کے بہت سے سینئر آفیسروں کو ریٹائر کر دیا تھا' جن میں جنرل گل حسن اور ائیر مارشل رحیم بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے تینوں افواج کے ڈھانچے میں بہت سے تبدیلیاں بھی کیں اور آٹھ سینئر جرنیلوں کو نظر انداز کر کے جنرل ضیاء الحق کو چیف آف آرمی سٹاف بنا دیا۔ ان تبدیلیوں کے باوجود انہوں نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ کہیں فوج ان کی کمر میں چھرا نہ گھونپ دے۔ فوج میں ہونے والی روزمرہ تبدیلیوں اور

سرگرمیوں کے بارے میں خود کو باخبر رکھنے' جنرل آفیسرز کے کوائف جمع کرنے اور ان کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنے کے لئے بھٹو نے انٹیلیجنس بیورو میں ایک خصوصی سیل قائم کرنے کے احکامات جاری کئے۔ کرنل ریٹائرڈ مختار کو اس سیل کا انچارج مقرر کیا گیا' جنہوں نے فوجی چھاؤنیوں میں ایک مکمل نیٹ ورک قائم کرنے کے لئے مزید ریٹائرڈ آفیسروں کی خدمات حاصل کیں۔ ہمیں اس بات کا علم نہیں کہ یہ "خوبصورت آئیڈیا" کس کا تھا تاہم اس پر کامیابی سے عمل درآمد نہ ہو سکا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ قیام کے دو روز کے اندر ہی اس خفیہ سیل کے بارے میں آئی ایس آئی اور ایم آئی فیلڈ سٹاف کو تمام معلومات مل گئیں۔ خطرے کی گھنٹی بجادی گئی اور "مختار فورس" کے کارکن جہاں کہیں بھی دکھائی دیتے ان پر آوازے کسے جانے لگے۔ ان ریٹائرڈ افسروں کے پرانے ساتھی جو ابھی تک فوج میں تھے ان سے کنی کترانے لگے' حتیٰ کہ انہیں اپنے یونٹوں اور آفیسرز میس میں بھی جانے کی اجازت نہ دی گئی۔ دیانتداری کا تقاضا تو یہ تھا کہ "مختار فورس" کے یہ آفیسر اپنے ہیڈ کوارٹر کو اس صورتحال سے مطلع کرتے اور اپنے حکام کو بتاتے کہ ہم ان حالات میں اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتے۔ لیکن اس کے برعکس انہوں نے اپنی "نوکریاں" برقرار رکھنے کے لئے ہر طرح کی الٹی سیدھی رپورٹیں تیار کر کے بھجوانا شروع کر دیں۔ جب مارشل لاء لگا تو کرنل مختار پہلے شخص تھے جنہیں ان کی برطرفی کے احکامات ان کے گھر پر بھجوائے گئے۔ ان کے دفتر کو سیل کر کے اس کی مکمل تلاشی لی گئی۔ بلاشبہ مختار فورس کے پاس ایسی کوئی رپورٹ نہیں تھی جس سے اس بات کا علم ہو سکتا کہ مارشل لاء کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ تاہم مختار فورس کے آفیسروں نے فوج کے سینئر آفیسرز کے بارے میں جو رپورٹیں مرتب کی تھیں تلاشی لینے والے انہیں پڑھ کر خاصے محظوظ ہوئے۔

پاکستان کا سیاسی ڈھانچہ تیزی سے دو حصوں میں بٹ رہا تھا۔ اور دونوں حصوں سے ایک دوسرے کے خلاف نفرت کی آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ چنانچہ 4 اور 5 جولائی کی درمیانی شب جنرل ضیاء نے مارشل لاء نافذ کر دیا۔ قوم سے اپنے خطاب کے دوران میں جنرل ضیاء الحق نے کہا:

"سول انتظامیہ کی مدد کرنے کے حوالے سے فوج کے کردار پر مختلف حلقوں کی جانب سے سخت تنقید کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ ہم اس تنقید کو اس امید پر برداشت کر رہے تھے کہ یہ وقت گزر جائے گا۔ ہمیں امید تھی کہ جب ہنگاموں کا موسم ختم ہو گا تو قوم فوج کے آئینی اور درست کردار کی تعریف کرے گی اور خوف کی فضا یکسر ختم ہو جائے گی۔ تاہم اب یہ

حقیقت آپ پر واضح ہو جانی چاہئے کہ جب سیاسی راہنما قوم کو ابتلا سے نکالنے میں ناکام ہو جائیں تو خاموش تماشائی بنے رہنا فوج کے لئے ایک ناقابل معافی جرم ہوتا ہے۔ اس مقام پر فوج کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ ملک کو بچانے کے لئے دخل اندازی کرے۔ میں آپ پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے پیپلز پارٹی اور قومی اتحاد کے درمیان افہام و تفہیم کی کوئی صورت دکھائی نہیں دی' جس کی بنیادی وجہ ان دونوں جماعتوں میں پائی جانے والی غیر ہم آہنگی اور باہمی اعتماد کی کمی تھی۔ یہ اندیشہ بھی تھا کہ پی پی پی اور پی این اے کی کسی قابل قبول نتیجے پر پہنچنے میں ناکامی کی صورت میں افراتفری اور بے چینی میں مزید اضافہ ہو گا' جو ملک کو ایک بدترین سیاسی بحران میں مبتلا کر دے گا۔ اس لئے ملک کے وسیع تر مفاد میں اس لمحے کے انتظار کا رسک نہیں لیا جا سکتا تھا۔ میں فوج کے تمام آفیسروں اور سپاہیوں سے یہ اپیل کروں گا کہ وہ اپنے فرائض غیر جانبداری سے انجام دیں۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ وہ ان لوگوں کو بھی معاف کر دیں گے جنہوں نے ان کے کردار پر کیچڑ اچھالا اور انہیں ہراساں کیا۔ یہی اسلام کی سچی روایات کے عین مطابق ہے۔ پی پی پی اور پی این اے کے تمام راہنماؤں کو حراست میں لے لیا گیا ہے اور انہیں مری میں حفاظت میں رکھا گیا ہے۔ جونہی تناؤ کچھ کم ہو گا ان کو رہا کر دیا جائے گا"۔

تاہم چند ہفتوں کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کو احمد رضا قصوری کے والد نواب محمد احمد خان کے قتل کے الزام میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو پر عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور بالاخر انہیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ متعدد دیگر ایجنسیوں اور اداروں کی طرح جنرل ضیاء نے آئی ایس آئی سے بھی یہ رائے لی تھی کہ بھٹو کو پھانسی دینی چاہئے یا نہیں؟ ہم نے اس سوال کا جواب دینے سے پہلے اپنی فیلڈ سروسز کا ایک مفصل سروے کیا۔ سٹاف ممبرز کے ساتھ بہت سے مباحثے کئے اور صورتحال کا باریک بینی سے تجزیہ کرنے کے بعد جنرل ضیاء کو یہ مشورہ دیا کہ بھٹو کو موت کی سزا نہیں دینی چاہئے۔ ہم نے اپنے اس مشورے کے ساتھ متعدد وجوہات لف کر کے اپنی اس رائے کو مضبوط بنیاد بھی فراہم کی۔

یہ بات کسی بھی شک و شبہے سے بالا تر ہے کہ بھٹو کی قید' پھانسی اور ان کی میت کی تدفین میں کسی مرحلے پر بھی آئی ایس آئی نے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ 4 اپریل کو صبح تقریباً 4 بجے میرے راولپنڈی فیلڈ کمانڈر نے مجھے فون کیا اور کہا کہ "جہاز روانہ ہو گیا ہے۔" میں نے یہ اطلاع فوراً اپنے ڈی جی آئی جنرل محمد ریاض خان کو پہنچا دی۔

یہ حقیقت بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ قومی تاریخ کے اس بدترین سیاسی بحران کے دوران آئی ایس آئی کسی بھی موقع پر پارٹی نہیں بنی۔ ہم نہ تو بادشاہ گر تھے اور نہ ہی کسی پارٹی کے ہاتھوں میں کھلونا تھے۔ ہم نے نہ تو کسی سیاستدان کو گرفتار کیا اور نہ ہی اس ضمن میں کسی قسم کی تفتیش کی۔ ہم نے جب بھی ملک کی اندرونی سیاسی صورتحال اور غیر ملکی مداخلت کے بارے میں کوئی بات نوٹ کی' انتہائی دیانتداری سے تمام حقائق حکام بالا تک پہنچا دیئے۔ ہم نہ تو بھٹو صاحب کے چمچے تھے اور نہ ہی جنرل ضیاء کے ہاتھوں میں ناچنے والی کٹھ پتلیاں۔ ہماری رپورٹیں اپنے آخری حروف تک دیانتدارانہ' حقائق پر مبنی اور ذاتی پسند و ناپسند سے بالا تر تھیں۔



ذوالفقار علی بھٹو کا قتل

پاکستان کے پہلے منتخب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کا دور اقتدار' ہنگاموں' بحرانوں' تنازعات اور عدم اعتماد کے ابواب پر مبنی ایک طویل داستان ہے۔ انہوں نے دسمبر1971ء میں اس وقت اقتدار سنبھالا جب پاکستانی قوم کو اپنے تاریخ کے شدید ترین بحران کا سامنا تھا۔ پاکستان کا وجود پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ اس پر لگنے والے زخموں سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ اور بیرونی جارحیت کے نتیجے میں قوم کے حوصلے بڑی حد تک پست ہو چکے تھے۔ ساری قوم کی نظریں ذوالفقار علی بھٹو پر جمی تھیں جو اس وقت قوم کے مسیحا کے طور پر ابھر کے سامنے آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے بعد پوری قوم کی امیدوں کا واحد مرکز ذوالفقار علی بھٹو ہی تھے۔ انہوں نے قوم کی امنگوں کے عین مطابق ایک بہترین منتظم' زیرک سیاستدان اور قائد کی حیثیت سے بھرپور سیاسی بصیرت کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کیا۔ انہوں نے اپنے تئیں ایک دم توڑتے ہوئے نظام کے وجود میں نئی روح پھونکنے کے لئے بعض انقلابی اصلاحات کا اعلان کیا اور مایوسی اور نامرادی کے اندھیروں سے امید کی کرن پھوٹنے لگی۔

ان کی خارجہ پالیسی اس حد تک کامیاب تھی کہ پاکستان کو بہت جلد قوموں کی عالمی برادری میں اس کا کھویا ہوا اعزاز واپس مل گیا۔ اور یہ بھی انہی کی صلاحیتوں کا معجزہ تھا کہ چین' شمالی کوریا' لیبیا' شام اور پی ایل او' پاکستان کے بہترین دوستوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ 1974ء میں لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد ذوالفقار علی بھٹو اور پاکستان کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ بھٹو کی پوری توجہ خارجہ امور کی طرف مبذول تھی اور خاص طور پر جب بھارت نے ایٹمی دھماکہ کیا تو ایک محب وطن سیاسی و قومی راہنما کی حیثیت سے ان کی یہ سوچ انتہائی مثبت تھی کہ پاکستان کا وجود برقرار رکھنے کے لئے ایٹمی قوت کا حصول ناگزیر ہو گیا ہے۔

اس حوالے سے کئے گئے ان کے فیصلوں اور مختلف اقدامات نے مغرب کے ایوانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجا دیں' کیونکہ ان کے لئے ذوالفقار علی بھٹو تیسری دنیا اور اسلامی دنیا کے لیڈر کی حیثیت سے ابھر رہے تھے اور پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے کی سعی امریکہ اور اس

کے حواریوں کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج تھی جو مستقبل میں ان کے مفادات کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

تاہم کچھ ہی عرصے میں اندرونی محاذ پر بھٹو کی گرفت آہستہ آہستہ ڈھیلی پڑنی شروع ہو گئی اور ان کی بعض پالیسیوں پر تنقید کے نشتر چلنے لگے۔ بھٹو کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ وہ سیاسی مخالفت برداشت نہیں کرتے تھے اور جذبات کی رو میں بہہ کر بعض اوقات سیاسی مخالفین کا ناطقہ بند کر دیتے تھے۔ ان کے اسی انتقامی رویے نے ملک کی مختصر اپوزیشن کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔ اور تمام چھوٹی اور بکھری ہوئی سیاسی جماعتیں یکجا ہو کر عوام کو سڑکوں پر لانے میں کامیاب ہو گئیں۔ کمزور سی اپوزیشن طاقتور سیاسی دھڑے میں تبدیل ہو گئی اور بالآخر ان کا ہاتھ بھٹو کے گریبان تک جا پہنچا۔ یوں پاکستان کی سیاسی تاریخ کے ایک دلیر اور قابل راہنما کو اپنی بعض سیاسی غلطیوں کا بہت بڑا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

انٹیلی جنس کی بعض مصدقہ اطلاعات کے مطابق اس مرحلے پر امریکہ جو بھٹو سے پہلے ہی خوفزدہ تھا' مخالف سیاسی جماعتوں میں پوری طرح شامل ہو گیا۔ اس نے نہ صرف صورتحال کا بھرپور فائدہ اٹھایا' بھٹو کے خلاف نفرت کی آگ پر تیل چھڑکا بلکہ بھٹو کا تختہ الٹنے کی خاطر اپوزیشن کو بھرپور مالی اور سیاسی امداد بھی فراہم کی۔ بھٹو کو اقتدار سے الگ کرنے میں امریکہ کے مفادات مضمر تھے۔ اول یہ کہ بھٹو پاکستان کے لئے ایٹمی طاقت کے حصول کے لئے دیوانہ وار کوششیں کر رہے تھے اور اس مقصد کے لئے ان کو امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی کسی پالیسی کی پرواہ نہیں تھی۔ دوم یہ کہ اپنی ذہانت اور منصوبہ بندی سے وہ اسلامی اور تیسری دنیا کے متعدد ملکوں کی پالیسیوں پر نہ صرف اثر انداز ہی ہو رہے تھے بلکہ ان کی کوشش تھی کہ تیسری دنیا ایک قوت بن کر ابھرے اور روس اور امریکہ کے مقابلے میں اپنے مفادات کی خود حفاظت کر سکے۔ یہ یقینی طور پر عالمی قبضے کے لئے امریکی خواب کی تعبیر کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ بھٹو کی سرگرمیوں نے علاقے میں امریکی مفادات کو سخت گزند پہنچانا شروع کر دیا تھا۔

9- اگست 1976ء کو امریکہ کے وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کسنجر نے لاہور میں ذوالفقار علی بھٹو سے ایک خصوصی ملاقات کی تاکہ پاکستان کو ایٹمی تکنیک کے حصول اور فرانس سے ایٹمی ری پروسسنگ پلانٹ کے سودے سے روکا جا سکے۔ حالانکہ اس وقت تک پاکستان فرانس سے ایٹمی پلانٹ کے حصول کے لئے باقاعدہ معاہدہ کر چکا تھا' اور عالمی ایٹمی توانائی اتھارٹی کو اس ضمن میں تمام تحفظات کی ضمانت بھی دے چکا تھا۔ اس ملاقات کے دوران کسنجر کو اس بات

کا بخوبی اندازہ ہو گیا کہ بھٹو کا فیصلہ اٹل ہے اور وہ ہر حال میں پاکستان کو ایٹمی قوت بنانا چاہتے ہیں۔

مسٹر کسنجر نے جہاز پر سوار ہونے سے پہلے بھٹو سے کہا:

"مسٹر بھٹو ہم تمہیں ایک عبرتناک مثال بنا دیں گے" اپنی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے ایک اور مثال دی:

"مسٹر بھٹو! جب سامنے سے ریل گاڑی آتی دکھائی دے تو عقلمند پٹڑی سے ہٹ جاتا ہے"۔

ذوالفقار علی بھٹو نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا اور ہنری کسنجر کو اپنا موقف منوائے بغیر واپس جانا پڑا۔ یہی ملاقات ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار کے زوال کا نقطہ آغاز تھی۔ امریکہ نے فیصلہ کر لیا کہ ذوالفقار علی بھٹو کا وجود ختم کر دیا جائے اور اس مقصد کے لئے اس نے اپنے "شکاری کتے" چھوڑ دیئے۔ 1976-77ء کے دوران بھٹو کے خلاف جو سیاسی اور اقتصادی بحران پیدا ہوا اس چنگاری کو شعلہ بنانے میں امریکہ نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا' جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

1- امریکہ نے انتہائی چالاکی سے بعض بیوروکریٹس' پاکستان پیپلز پارٹی کے چند مرکزی عہدیداروں' راہنماؤں اور وزراء کو دانستہ یا غیردانستہ طور پر اپنے حلیفوں کی صف میں شامل کر لیا۔ ان ایجنٹوں کے ذریعے سی آئی اے کو نہ صرف اندر کی خبریں مل جاتی تھیں بلکہ وہ ان لوگوں کی مدد سے اپنی سازشوں کے جال بہتر طریقے سے پھیلانے میں کامیابی حاصل کر رہا تھا۔

2- 1976-77ء کے درمیان انہی "قریبی ساتھیوں" کے مشوروں کی وجہ سے بھٹو ایک گہری سیاسی دلدل میں پھنستے چلے گئے۔ جس سے باہر نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ان دوست نما دشمنوں نے بھٹو کو باور کرایا کہ پیپلز پارٹی کے لئے اسمبلی میں دو تہائی اکثریت حاصل کرنا انتہائی ضروری ہے۔ جن دنوں پی این اے کی تحریک زوروں پر تھی اور حالات سنگین سے سنگین تر ہوتے جا رہے تھے ان "قریبی ساتھیوں" نے اس تحریک کو اسلحے کے زور پر دبانے کا مشورہ دیا اور کچھ لوگوں نے تو بھٹو سے باقاعدہ ہتھیار سپلائی کرنے کا مطالبہ بھی کیا تاکہ اسلحے کے زور پر اس تحریک کو ختم کیا جا سکے' اور آخر کار بھٹو نے سنجیدگی سے اس مشورے پر غور کرنا شروع کر دیا۔

3- USMAAG کے بعض افسروں کو جنرل ہیڈ کوارٹرز تک رسائی تو حاصل تھی ہی' اب انہوں نے سروسز ہیڈ کوارٹرز کے چیدہ چیدہ پاکستانی افسروں کو اپنے "قیمتی مشوروں" سے بھی نوازنا شروع کر دیا۔

4- بعض امریکی سفارتکاروں نے پی این اے کے متعدد راہنماؤں سے "براہ راست دوستی" کا شرف حاصل کر لیا اور ہر طرح سے ان کی امداد کرنے لگے۔

جن دنوں پی این اے کی تحریک عروج پر تھی' غیر ملکیوں کا ایک بڑا ریلہ جن میں زیادہ تعداد یہود اور نصاریٰ کی تھی' صحافیوں' فوٹو گرافروں' رپورٹروں اور سیاسی مبصرین کے روپ میں پاکستان آ پہنچا۔ بظاہر یہ لوگ کیمروں اور ٹیپ ریکارڈروں سے "مسلح" تھے۔ مگر درپردہ ان کے مقاصد کچھ اور تھے۔ ان کے پاس ڈالروں کی کمی نہ تھی اور پاکستان میں بھی بعض خفیہ ہاتھ ان کی ہر قسم کی امداد کے لئے پہلے ہی سے موجود تھے۔ ان کے پاس تمام سیاسی راہنماؤں اور کارکنوں کے نام' پتے اور فون نمبر تک موجود تھے۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ گوری چمڑی کا جادو اس قدر چل چکا تھا کہ ہمارے کچھ سیاستدان اور چند بلند اور قد آور قومی رہنما اک نام نہاد سفید فام صحافی کی فون کال کے منتظر رہتے اور اس سے گفتگو کرنا اپنے لئے بڑا اعزاز سمجھتے تھے۔ ہر روز آئی ایس آئی کے پاس ان کی جانب سے بھیجی گئی "خبروں" کے ٹیلی گرام کا ایک ڈھیر لگ جاتا جن کو پڑھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ ہمارے کچھ سیاستدان کس قدر بونے قد کے ہیں' اور وہ ان نام نہاد صحافیوں کو جو دراصل سی آئی اے کے ایجنٹ تھے قومی مفادات کے خلاف کیا کیا رپورٹ کرتے تھے' اور ان کی گفتگو سے آنے والے دنوں میں کیا کیا نقصانات پہنچ سکتے تھے۔

ہمارے چند سیاستدان تو بھٹو دشمنی اور حصول اقتدار کی تگ و دو میں یہ تک بھول گئے تھے کہ یہود و نصاریٰ کے ایجنٹ کبھی اسلام اور پاکستان کے دوست نہیں ہو سکتے۔ ان کی "دوستیوں" سے صرف ذوالفقار علی بھٹو کے زوال کے ڈرامے کے ابواب ہی مرتب نہیں ہو رہے تھے بلکہ پوری پاکستانی قوم کی عزت نفس کے سودے بھی ہو رہے تھے۔

اس بات میں اب کوئی ابہام باقی نہیں رہا کہ متعدد امریکی سفارتکار بھٹو کے خلاف اس مہم میں نہ صرف ملوث تھے بلکہ اس کی مکمل نگرانی بھی کرتے تھے۔ لاہور میں امریکی قونصلیٹ جنرل کے پولٹیکل آفیسر جین این گبن کا کردار اس حوالے سے خاصا فعال تھا۔ کئی ایک مقامی رہنما اس کی بھرپور امداد کر رہے تھے اور مرکزی سطح کے چند سیاستدانوں سے مل کر وہ ایک سیاسی دلال کا کردار ادا کر رہا تھا۔ خاص طور پر جماعت اسلامی کے امیر مولانا

مودودی اور شیرانوالہ گیٹ کے جمعیت علمائے اسلام کے راہنما مولانا عبیداللہ انور کے ساتھ جین نے مسلسل ملاقاتوں اور رابطوں کا اہتمام کر رکھا تھا۔ امریکی مولانا مودودی کی سوچ اور دور اندیشی کو بہت اہمیت دیتے اور سیاسی نوعیت کے مبہم نقطوں پر ان سے اظہار رائے کی درخواست کرتے رہتے۔ اس زمانے میں ذوالفقار علی بھٹو بھی مولانا مودودی سے ملاقات کے لئے گئے۔ اور سیاسی مسائل پر گفتگو کی۔ یہ جین ہی تھا جس نے لاہور سے اسلام آباد میں امریکی سفارتخانے کے چیف آف پولٹیکل آفیسر ہاورڈ بی شیفر کو یہ پیغام دیا تھا' کہ "پارٹی ختم ہو گئی' مال لٹ گیا"۔ جس کے جواب میں بھٹو نے یہ مشہور جملہ کہا تھا۔ "پارٹی ابھی ختم نہیں ہوئی' یاد رکھو ہاتھی کے کان بہت لمبے ہوتے ہیں۔"

انہیں دنوں ہمیں کراچی سے یہ اطلاعات موصول ہو رہی تھیں کہ کھلی منڈی میں امریکی ڈالر کی زر تبادلہ کی شرح بڑی حد تک گر گئی ہے۔ مارکیٹ میں امریکی ڈالروں کا ایک سیلاب آ چکا تھا اور لوگ دھڑا دھڑ امریکی ڈالر کے عوض پاکستانی روپیہ خرید رہے تھے۔ اس حقیقت کو جاننا اب قطعی مشکل نہیں کہ یہ "سیلاب بلا" کہاں سے آیا تھا اور اس کے پیچھے کیا خفیہ مضمرات تھے۔ امریکہ نے فوری طور پر پی ایل 480 کے تحت جمع شدہ رقم کی تجوریاں بھی کھول دیں اور جمہوری اتحاد کے چیدہ چیدہ کارکنوں کی جیبیں راتوں رات امریکی ڈالروں اور پاکستانی روپوں سے بھر دی گئیں' اور بظاہر ملک میں اسلامی حکومت کے قیام کے یہ خواہشمند حضرات پہلی بار پر تعیش زندگی گزارنے لگے۔ یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا' بعض صنعتکار اور تاجر بھی جو بھٹو کی اقتصادی پالیسیوں سے نالاں تھے اس "جہاد" میں شامل تھے اور وہ پی این اے کو بڑی بڑی رقوم چندے کے طور پر دے رہے تھے۔ ان چندوں کا چونکہ کوئی حساب کتاب نہیں تھا اس لئے پی این اے کے بعض مرکزی راہنماؤں نے لاکھوں کمائے۔

30 لاکھ روپے کا ایک چیک جو ایک بیرونی حکومت کی طرف سے جماعت اسلامی کے ایک سربراہ کے نام آیا تھا' حکومتی کارندوں کے ہاتھ لگ گیا' اس کی ایک فوٹو کاپی سندھ کے وزیراعلیٰ غلام مرتضیٰ جتوئی کو دے دی گئی جو انہوں نے وزیراعظم تک پہنچا دی۔

اپریل کے مہینے میں پی این اے کا ایک احتجاجی جلوس کوئینز روڈ (اب شاہراہ فاطمہ جناح) سے گزر رہا تھا۔ جب یہ جلوس امریکن سنٹر کے قریب پہنچا تو یو ایس آئی ایس کے پبلک افیرز آفیسر کرسٹوفر ایل شلز کو اپنے ایک پاکستانی سٹاف ممبر اجمل خان کے ساتھ سنٹر کی چھت پر دیکھا گیا۔ انہیں دیکھ کر جلوس میں شامل امریکی نمک خواروں نے اپنا نمک حلال

کرنے کی خاطر امریکہ کی حمایت میں نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ ردعمل کے طور پر شلز نے بچوں کی طرح خوشی سے ہاتھ ہلا کر ان نعروں کا جواب دیا۔ وہ یقینی طور پر خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا کہ امریکی فنڈز اور منصوبہ بندی بالآخر اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔

اس حوالے سے پاکستان ٹائمز لاہور کی 4 مئی 1977ء کی اشاعت میں ایک لکھاری مسٹر ایم اے بھٹی کا شائع ہونے والا خط قارئین کی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا انہوں نے لکھا:

"زندہ باد مردہ باد"

"میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی 28 اپریل کی قومی اسمبلی میں کی گئی تقریر کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس میں انہوں نے راولپنڈی کے ایک جلوس میں "کارٹر مردہ باد" کے نعروں پر امریکی سفارتخانے کا حکومت پاکستان سے احتجاج کا ذکر کیا تھا۔ 19 اپریل کو امریکن سنٹر کے سامنے سے گزرتے ہوئے پی این اے کے ایک جلوس کے شرکاء نے "کارٹر زندہ باد" کے نعرے لگائے۔ اس وقت سنٹر کی چھت پر سنٹر کے ایک امریکی آفیسر کرسٹوفر شلز اور ایک پاکستانی ملازم محمد اجمل خان موجود تھے۔ جنہوں نے ان نعروں کے جواب میں انتہائی خوشی کا اظہار کیا اور جلوس کے شرکاء کا ان نعروں پر ہاتھ ہلا ہلا کر شکریہ ادا کیا۔ میں امریکی سفارتخانے سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے یہ واقعہ پاکستان کے محکمہ خارجہ کو رپورٹ کیوں نہ کیا اور "کارٹر مردہ باد" کے نعروں پر احتجاج کرتے ہوئے "کارٹر زندہ باد" کے نعروں کو کیوں بھول گئے؟؟"

بھٹو کو برطرف کرنے کا یہ امریکی منصوبہ اس قدر مضبوط تھا کہ 4 جولائی 1977ء کو جب پی این اے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے درمیان مذاکرات کا آخری دور ہوا اور دونوں جماعتیں ایک متفقہ سمجھوتے پر پہنچ گئیں تو پی این اے کی مذاکراتی ٹیم کے ارکان مفتی محمود' نوابزادہ نصراللہ خان اور پروفیسر غفور نے اس بات کا اعلان بھی کر دیا کہ ذوالفقار علی بھٹو نے مذاکرات کے دوران جو تجاویز پیش کی ہیں وہ انہیں قبول ہیں' مگر اس اعلان کے ساتھ ہی ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان' پیر پگارو' بیگم نسیم ولی خان اور مولانا نورانی نے اس معاہدے کو نہ صرف تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا بلکہ ان تینوں راہنماؤں کی حیثیت کو بھی چیلنج کر دیا۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کی ڈور کس کے ہاتھ میں تھی اور کون اس ڈور کے دوسرے سرے پر بیٹھا اپنی خواہش کے مطابق اسے ہلا رہا تھا۔

بھٹو کی پھانسی کے احکامات

جن دنوں پاکستان سپریم کورٹ میں نواب محمد احمد خان کے قتل کے الزام میں لاہور ہائی

کورٹ سے دی جانے والی سزائے موت کے خلاف ذوالفقار علی بھٹو کی اپیل پر بحث ہو رہی تھی' ہمارے ایک "دوست" نے جسے یو ایس آئی ایس کے ٹیلکس روم تک رسائی حاصل تھی مجھے MOST URGENT کا خصوصی کوڈڈ پیغام بھجوایا۔ پیغام کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے میں فوری طور پر طے شدہ مقام پر پہنچا۔

راولپنڈی کے راجہ بازار میں پرانے کپڑے فروخت کرنے والوں کی ایک "سکنڈ ہینڈ" مارکیٹ تھی جہاں اس وقت گاہکوں کا ہجوم تھا۔ میں نے دوست سے آنکھوں ہی آنکھوں میں گفتگو کی' اس نے ایک کاغذ ریڑھی پر رکھے ہوئے ایک کوٹ کی جیب میں ڈال دیا۔ میں نے فوری طور پر وہ کوٹ خرید لیا اور وہ پرچہ لے کر ایک قریبی فوٹو کاپی شاپ پر پہنچا اور فوٹو کاپی کروا کر اصل پرچہ اسی انداز میں ایک دوسری ریڑھی پر پڑے ایک کوٹ کی وساطت سے اسے واپس کر دیا۔ میں فوری طور پر دفتر واپس آیا تاکہ اس پیغام کا متن صحیح طور سے پرکھا جا سکے۔ میں نے راستے میں بھی اس پیغام کو پڑھنے کی کوشش کی مگر صرف اتنا جان سکا کہ یہ واشنگٹن سے بھیجا ہوا ایک ٹیلی گرافک پیغام ہے۔ دفتر آ کر جب میں نے اس پیغام کو ڈی کوڈ کیا تو مجھے یہ پڑھ کر شدید حیرت ہوئی کہ واشنگٹن سے پاکستان میں اپنے دفتر کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ بھٹو کا پھانسی کے تختے تک پہنچنا یقینی بنایا جائے۔ اس پیغام میں بعض جنرل آفیسرز کی ریٹائرمنٹ اور تبادلوں کے بارے میں بھی ہدایات موجود تھیں۔

میرے لئے یہ پیغام انتہائی غم و غصے کا باعث تھا۔ یہ پاکستان کے اندرونی معاملات میں ایک طرح کی کھلی مداخلت کے مترادف تھا۔ ہمارے پاس بھٹو کیس میں امریکی مداخلت اور امریکہ کے ملوث ہونے کے اور بھی کئی ثبوت موجود تھے مگر یہ پیغام بین الاقوامی سفارتی آداب کی خلاف ورزی کی انتہا تھی۔ امریکہ نے اپنے طور پر اس وقت بھٹو کی موت کا پروانہ جاری کر دیا تھا' جبکہ ابھی ان کا کیس پاکستان کی اعلیٰ ترین عدالت میں حتمی فیصلے کا منتظر تھا۔ پہلے بھی ہمارے پاس اس بات کے ثبوت تھے کہ بھٹو کے وکلاء لاہور کے فلیٹیز ہوٹل کے ایک کمرے میں بھٹو کے دفاع کے لئے جو پوائنٹس تیار کرتے تھے ان کی کاپی اگلے روز عدالت شروع ہونے سے پہلے سرکاری وکیل کے پاس پہنچ جاتی تھی۔

بہرحال دفتر پہنچتے ہی میں سیدھا ڈائریکٹر جنرل انٹیلی جنس جنرل ریاض کے پاس گیا اور انہیں وہ پیغام دکھایا۔ انہوں نے اس پیغام کو بار بار پڑھا' ان کا خیال تھا کہ یہ پیغام خود ساختہ اور مقامی طور پر تیار کیا ہوا ہے تاکہ ہمیں غلط راستے پر لگایا جا سکے۔ تاہم یہ فیصلہ کرنا جنرل صاحب کے لئے بھی مشکل تھا کہ اس طرح کے پیغام سے کسی مقامی ادارے یا شخص کو کیا

فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ بہرحال خاصی گفتگو کے بعد ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم پیغام اڑانے والے دوست سے اس کی صداقت کی مزید گواہی طلب کریں۔ میں نے رات گئے اسے بلوا لیا۔ اور جنرل صاحب صبح کی سفیدی نمودار ہونے تک اس سے سوالات کرتے رہے۔ پیغام بالکل درست تھا اور اسے خود ساختہ قرار دینا ہمارے دوست کی "دیرینہ دوستی" کو الزام دینے کے مترادف تھا۔ اس کے باوجود یہ کاغذ کا ٹکڑا ہمارے لئے ابھی تک ایک معمہ تھا۔ جنرل ریاض نے فیصلہ کیا کہ ہمیں کسی سپیشلسٹ سے رجوع کرنا چاہئے۔ چنانچہ ہم دوسری صبح ہی اسے لے کر جنرل جیلانی کے پاس پہنچے جو اس وقت سیکریٹری جنرل ڈیفنس تھے۔ انہوں نے اسے بغور دیکھا اور کہنے لگے "آئی ایس آئی والوں کو انتہائی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ غیر ملکی طاقتیں ہمارے معاملات میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی ہیں۔" جنرل جیلانی کے یہ الفاظ ہمارے ذہنوں کی وہ گرہیں نہ کھول سکے جنہیں لے کر ہم ان کے پاس گئے تھے۔

وہاں سے واپسی پر جنرل ریاض نے کہا کہ ہمیں اس کی قانونی حیثیت پر رائے حاصل کرنی چاہئے۔ مسٹر جسٹس شمیم حسین قادری ان دنوں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ ان کے ساتھ ہمارے پرانے مراسم تھے۔ اور مجھے ان کی ذہانت اور پیشہ ورانہ صلاحیت پر پورا بھروسہ تھا۔ میں اگلی فلائیٹ پر لاہور گیا اور انہیں یہ پیغام دکھلایا۔ وہ بھی یہ فیصلہ تو نہ کر پائے کہ یہ پیغام درست ہے یا خود ساختہ تاہم انہوں نے ان الفاظ میں اس معاملے پر اپنی رائے کا اظہار کیا:

"قانونی طور پر ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی نہیں دی جا سکتی۔ اولاً" اس لئے کہ وہ اس مبینہ قتل میں براہ راست ملوث نہیں ہیں۔ ثانیاً" اگر ہوئی تو بھی موت کی سزا متفقہ نہیں ہوگی۔ ججوں کی آراء میں واضح اختلاف لگتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ عدالت عظمیٰ کے جج بھی متفقہ فیصلہ نہیں دیں گے۔"

چیف جسٹس کے یہ الفاظ پیغام کی صحت کے بارے میں مجھے قائل کرنے کے لئے کافی تھے اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ بھٹو کو ضرور پھانسی دے دی جائے گی۔ اگر بھٹو قانونی طور پر موت کی سزا کے حقدار ہوتے تو اس پیغام کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ پیغام بلاشبہ بھٹو کے عدالتی قتل کا حکم نامہ تھا۔ ہم نے اس پیغام کی کاپی صدر ضیاء کو بھجوا دی۔ ایوان صدر میں اس کا کیا ردعمل ہوا اس بات کا ہمیں علم نہیں۔ بہرحال ظاہری طور سے سب قانونی تقاضے پورے کرنے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا اور یوں امریکہ کے سر سے یہ "بلا" ٹل گئی۔

بھٹو کے قتل میں امریکہ کہاں تک ملوث ہے اور اس میں بھٹو کی پاکستان کو ایک ایٹمی قوت بنانے کی کوششوں کا کیا عمل دخل ہے اس کا اندازہ ایک ٹیلیگرام سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو 19 مئی 1978ء کو امریکہ کے سفیر ہمل نے اسلام آباد سے علاقے کے دوسرے سفارت خانوں کو بھیجا۔ اس ٹیلیگرام کا متن تہران میں اسلامی انقلاب کے بعد "آلانہ جاسوسی" کی دستاویزات میں چھپا' اس کا متن تھا:

خفیہ امریکی سفارتخانہ تہران

باہر سے آنے والا ٹیلی گرام

18 مئی 1978ء

امریکی سفارتخانہ اسلام آباد

برائے سیکریٹری سٹیٹ واشنگٹن۔

امریکی سفارتخانہ پیرس

امریکی سفارتخانہ تہران

موضوع پاکستان' ایران اور ریپروسسنگ

تمہارے پیرا نمبر3 میں اٹھائے گئے نکتہ پر ہماری رائے قدرے مختلف ہے۔

پاکستان فرانس کے ساتھ کئے ہوئے ریپروسسنگ پلانٹ کے معاہدے کی تنسیخ چپ چاپ یا آسانی سے قبول نہیں کرے گا' قطع نظر اس کے کہ بھٹو کی قسمت اس وقت تک سیل ہوتی ہے یا نہیں' یا اس کی قسمت کا کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ حکومت پاکستان' فرانس کے غدارانہ رویئے اور امریکہ کے غیر منصفانہ دباؤ پر جو وہ پاکستان اور فرانس کی حکومتوں پر ڈال رہا ہے' بہت شور و غوغا کرے گی' پاکستان کی موجودہ حکومت ہر ممکن طریقے سے یہ باور کرانے کی کوشش کرے گی کہ وہ اس منصوبے کی تنسیخ میں نہ ہی شامل ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ اتفاق کرتی ہے' جیسا کہ میں نے کہا ہے' حکومت امریکہ کی طرف سے کچھ اقتصادی امداد اور چند ہتھیاروں کی سپلائی سے مطلوبہ مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس سے حکومت پاکستان کا کچھ غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ پاکستان کہیں یہ نہ کہہ دے کہ وہ خود اپنا ریپروسسنگ پلانٹ بنائے گا۔ کیونکہ اس سے ہمارے لئے اور بھی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ اس صورت حال میں ہم امداد بھجوانے سے بھی قاصر رہیں گے۔ بہرحال اس امداد سے حکومت پاکستان کی "مرضی" نہیں خریدی جا سکے گی کیونکہ یہ ناممکن ہے۔"

یہاں یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ اپنے ملکی معاملات میں امریکہ کی کھلی مداخلت کے اتنے سارے ثبوت ہاتھ لگ جانے کے باوجود ہم نے اس مداخلت کو روکنے کے لئے کیا اقدامات کئے' تو اس سوال کا اتنا ہی جواب ہے کہ ہم کچھ بھی نہ کر پائے' ماسوائے اس کے کہ ہم سب موصولہ معلومات صدر ضیاء کو بھجواتے رہے۔ ہماری اس "بے بسی" اور "ناکامی" کی چند وجوہات درج ذیل ہیں :

1- آئی ایس آئی اور آئی بی دونوں ادارے اتنے فعال اور بااختیار نہیں ہیں کہ ازخود سپرپاور کی ایسی منصوبہ بندیوں کا توڑ کر سکیں یا انہیں ناکام بنانے کے لئے عملی اقدام کر سکیں۔

2- قومی سطح پر ایسی دخل اندازیوں اور عالمی سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی بھی ادارہ اس وقت تک کارگر اور کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا جب تک پوری قوم متحد نہ ہو اور اس کا شعور ان اداروں کی ڈھال نہ ہو۔ مگر بدقسمتی سے ماضی میں اور اب جس مقام پر ہم کھڑے ہیں' ہماری حالت جسٹس کیانی مرحوم کے مطابق کچھ یوں ہے : "1947ء میں ایک قوم ایک ملک کی تلاش میں تھی جو اسے مل گیا مگر اب وہی ملک ایک قوم کی تلاش میں ہے' جو اسے آج تک نہیں ملی۔"

ہم اپنی آزادی کی نصف صدی گزر جانے کے باوجود ابھی تک وہ رویہ اور سوچ پیدا نہیں کر سکے جو کسی بھی قوم کے وقار اور ترقی کی اساس ہوتی ہے۔ تاہم جس روز ہم میں یہ سوچ پیدا ہو گئی اسی روز یقیناً ہمارے تمام قومی مسائل حل ہو جائیں گے۔ اور ہم اپنے معاملات کو کسی بھی بیرونی مداخلت یا امداد کے بغیر بطریق احسن حل کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

3- ہماری ناکامی کی بڑی وجہ ہمارے ہاں پائی جانے والے "بکاؤ مال" کی وہ نسل ہے جو ہر دور میں ملکی مفاد اور قومی وقار کا سودا کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہی ہے اور ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ یہ جنس معاشرے کے ہر طبقے میں "برائے فروخت" کی تختی لگائے موجود ہے۔ اور ابھی تک ان ضمیر اور وطن فروشوں کا قلع قمع کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی موثر ہتھیار نہیں۔ یہ لوگ کھمبیوں کی طرح ہر موسم اور ہر قسم کے حالات میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

لاہور میں امریکی قونصلیٹ جنرل ڈاکٹر انڈریو وی کوری نے ایک بار کہا تھا "ایک پاکستانی کی قیمت وسکی کی ایک بوتل سے لے کر امریکہ کی مفت سیر تک

محدود ہے۔" ہمارے کئی امریکی دوست اس حوالے سے ایک پاکستانی کی قیمت کا تعین مختلف انداز میں کرتے ہیں، مگر ہم اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کر سکتے، کیونکہ کئی ایک "اعلیٰ منصب" پر فائز پاکستانیوں کو اس سے بھی کم قیمت پر اپنا ضمیر، وقار، قومی حمیت اور وطن کی عزت کو داؤ پر لگاتے دیکھا گیا ہے۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ ہماری اطلاعات کے مطابق ڈاکٹر کوری جو عمر رسیدہ اور کنوارا تھا، انتہائی پست درجے کا ہم جنس پرست تھا۔ اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل کے عوض اس نے لاہور کے کئی ایک خوبصورت اور سمارٹ نوجوانوں کو امریکہ کی مفت سیر کرائی۔ کبھی کبھی تو اس کی جنسی بھوک کا یہ عالم ہو جاتا کہ جب اسے کوئی فاعل میسر نہ آتا تو وہ اپنے پاکستانی ڈرائیور اشرف کو ہی دعوت دے دیتا۔ ان خدمات کے صلے میں چند ہی ماہ میں اشرف لکھ پتی ہو گیا۔ آئی ایس آئی کے لئے ڈاکٹر کوری کی اس "جبلت" سے فائدہ اٹھانا معمولی بات تھی مگر ہمارا اخلاقی معیار اور شائستگی ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

4- چوتھی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاکستانی بھائی خفیہ اداروں کے ساتھ تعاون سے گریز کرتے ہیں۔ اسرائیل انٹیلی جنس پر میری ایک تحقیق کے دوران معلوم ہوا کہ اسرائیل خفیہ ایجنسی "موساد" کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ دنیا کا ہر یہودی چاہے وہ جہاں بھی ہو، جس پوزیشن میں بھی ہو موساد کے ساتھ بھرپور تعاون کرتا ہے اور موساد کے ایجنٹوں کو دنیا کے کسی خطے میں بھی جس قسم کی مدد درکار ہو وہاں کا آباد کار یہودی اسے ہر طرح کی مدد اور تعاون فراہم کرتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں صورتحال بہت مختلف ہے۔

ایک مرتبہ میں نے اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں امریکی سفارتخانے کے ایک پاکستانی اہلکار سے ایک معمولی نوعیت کی اطلاع فراہم کرنے کی درخواست کی مگر اس کا جواب تھا "برائے کرم آئندہ مجھ سے ایسی بات نہ کہیے۔ میں نے بڑی مشکل سے امریکیوں کے ساتھ اپنے تعلقات بنائے ہیں۔ میرے گھر میں پہلی بار ائیر کنڈیشنر اور فرج آیا ہے۔ جلد ہی مجھے گرین کارڈ ملنے کی بھی امید ہے۔ آپ میرے پاس نہ آئیے گا۔ پاکستان نے مجھے دیا ہی کیا ہے جس کی خاطر میں اپنی اتنی اچھی نوکری کو داؤ پر لگا دوں؟ آپ جائیں میں آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا"۔ میں اپنا سا منہ لے کر واپس آ گیا اور میں نے دوبارہ اس شریف آدمی

سے رابطہ نہیں کیا' مگر میں نے دیکھا کہ جلد ہی اس کے ٹوٹے پھوٹے سکوٹر کی جگہ نئی ٹیوٹا کار نے لے لی اور وہ راولپنڈی کی ایک تنگ گلی میں واقع چھوٹے سے مکان سے نکل کر اسلام آباد کے ایک شاندار بنگلے کا مکین و مالک بن گیا۔

لیکن سب پاکستانی ایسے نہیں۔ بعض ایسے محب وطن لوگ بھی ہیں جنہوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر ہماری مدد کی اور آئی ایس آئی یقینی طور پر ایسے لوگوں کی مرہون منت اور احسان مند رہے گی۔ ان دوستوں کا نام لکھنا مناسب نہیں کیونکہ ان کا "بے نام سپاہی" رہنا ہی ان کے لئے اور ملک کے لئے بہتر ہے۔



پاکستان کا ایٹمی پروگرام اور امریکہ

امریکہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے خائف ہے اور اس کی یہی کوشش رہی ہے کہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہونے کے ناطے ایک ایٹمی قوت نہ بن پائے۔ صفحہ 50 پر امریکی سفیر کی ایک خفیہ ٹیلیگرام کا متن پڑھ کر یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ امریکہ کو فرانس پر دباؤ ڈال کر پاکستان کے لئے ری پروسیسنگ پلانٹ کا سودا منسوخ کروانے کے بعد یہ خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں پاکستان ازخود ری پروسیسنگ پلانٹ نہ بنا لے اور امریکہ سے اتنا نالاں نہ ہو جائے کہ امریکہ سے قطع تعلق ہی کر لے۔ اس لئے پاکستان کو کچھ ہتھیار اور مالی امداد فراہم کر دینی چاہئے۔ امریکہ یہ چال چلنے میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ یہ سودا منسوخ ہونے کے بعد نہ صرف پاکستان پر یک طرفہ طور پر دباؤ ڈالا گیا' بلکہ بھارت کو شہ مل گئی کہ وہ اپنا ایٹمی پروگرام جاری رکھے۔ بھارت 1974ء میں ایٹمی دھماکہ کر چکا تھا اور تیزی سے ایٹمی قوت بننے کی منازل طے کر رہا تھا۔

19 اکتوبر 1976 کو بھٹو نے سعودی عرب کے شاہ خالد کو پاکستان آنے کی دعوت دی۔ بھٹو نے شاہ خالد کو باور کرایا کہ امریکی آپ کے تیل پر قابض ہونا چاہتے ہیں' ہم اور آپ (یعنی پاکستان اور سعودی عرب) مل کر امریکی ارادے خاک میں ملا سکتے ہیں۔ حکومت کے ایوانوں سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ مسٹر بھٹو نے شاہ خالد سے لنڈس سپرہائی وے اور ایٹمی پروگرام کو آگے بڑھانے کے لئے امداد مانگی۔ ساتھ ہی مسٹر بھٹو نے مشورہ دیا کہ آپ (سعودی عرب) روس کو تسلیم کرلیں اور میں اس کے لئے راہ ہموار کر سکتا ہوں۔

یہ خبر امریکہ تک فوراً پہنچ گئی اور امریکہ نے شاہ خالد کو نہ تو روس کو تسلیم کرنے دیا اور نہ ہی لنڈس سپرہائی وے کے لئے یا پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے لئے پاکستان کو امداد دینے کی اجازت دی' البتہ مسٹر بھٹو کی پھانسی پکی ہو گئی۔

7 جولائی 1977 کو امریکہ کا اسسٹنٹ سیکرٹری جوزف نی جو ایٹمی ہتھیاروں کے محکمے کا ذمے دار تھا پاکستان آیا اور اس نے جنرل ضیاء الحق سے کہا کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام کیپ کر

دیا جائے (آج جہاں ہے وہیں روک دیا جائے)۔ جنرل ضیاء الحق نے اپنے مخصوص انداز میں اس کو ٹھینگا دکھا دیا۔

فرانسیسی جیمز بانڈ

1978ء میں فرانسیسی ری پروسیسنگ پلانٹ کا سودا منسوخ کروانے کے بعد امریکہ کی آنکھوں میں کہوٹہ کھٹک رہا تھا۔ وہ یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ پاکستان اس جنگل بیابان میں کیا کر رہا ہے۔ امریکہ نے جہاں اپنے خلائی جہازوں اور جاسوسوں سے کام لیا وہاں اسلام آباد میں مقیم چند سفارتکاروں کو بھی اس بات پر مامور کیا کہ وہ کہوٹہ کے علاقے کی "سیر" کریں اور دیکھیں وہاں کیا ہو رہا ہے۔

کہوٹہ ایٹمی پلانٹ کی سیکورٹی آئی ایس آئی کی ذمہ داری نہ تھی۔ اس مقصد کے لئے ایک علیحدہ سیکورٹی آرگنائزیشن قائم تھی جو کلی طور پر خودمختار سربراہ کی قیادت میں اپنے فرائض انجام دیتی تھی۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں' اس وقت میجر جنرل ریٹائرڈ سید اے زیڈ نقوی کو فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد پی اے ای سی کی سیکورٹی کا سربراہ تعینات کیا گیا تھا۔ جنرل نقوی جب لاہور میں 10 ڈویژن کے جنرل آفیسر کمانڈنگ تھے میں ان دنوں کور ہیڈ کوارٹرز میں جی ایس او۔ 1 (آپریشنز) کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ہمارے باہم تعلقات کا آغاز اسی زمانے میں ہوا مگر بعد ازاں جنرل صاحب کے اسلام آباد آنے پر یہ تعلقات نئے سرے سے استوار ہو گئے۔ ہمارے درمیان پائی جانے والی پیشہ ورانہ ورکنگ ریلیشن شپ کی بنیاد پر وہ کبھی کبھار آئی ایس آئی سے پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کی سیکورٹی کے حوالے سے معاونت کے لئے کہتے یا کبھی ہمیں کسی اہم کیس پر تحقیقات کرنے کے لئے بھی کہہ دیتے۔

ایٹمی ریسرچ کی تنصیبات اور ادارے جن میں پاکستان انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی بھی شامل ہے' روز اول ہی سے ہمارے دشمنوں کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی نظر خاص کا نشانہ ہے اور روز اول ہی سے دشمنوں کی کوشش رہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طور یہ جان لیں کہ کہوٹہ کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ فرانسیسی سفارتکار اس معاملے میں دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہی "متفکر" واقع ہوئے تھے اور اکثر اوقات انہیں کہوٹہ کے قرب و جوار میں "جڑی بوٹیاں" اور "پتھر" تلاش کرتے پایا گیا۔

آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ 26 جون 1979ء کو اسلام آباد میں فرانس کے سفیر

ہزایکسی لینسی گوریرک اور ان کے فرسٹ سیکریٹری جین فورلوٹ اپنی کار میں ایک ایسے ہی خفیہ مشن پر کہوٹہ کی طرف روانہ ہوئے۔ فوٹوگرافی کا جدید سازو سامان ان کے ساتھ تھا اور ان کا ٹارگٹ کہوٹہ کمپلیکس اور اس کے گرد و نواح کی تصویر کشی تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ مشن اتنا حساس اور اہم تھا کہ خود سفیر صاحب علاقے کے سروے کے لئے تشریف لے گئے اور اس سروے پلان میں پلانٹ کی عمارت کو جانے والے راستوں' اس کے در و دیوار' اس کے گرد و پیش سیکورٹی کے سسٹم' حفاظتی انتظامات اور سارے ممنوعہ علاقے کا تفصیلی مطالعہ شامل تھا۔

بنیادی طور پر یہ فوٹوگرافی اور دیکھ بھال کا مشن تھا جو عام طور پر اس علاقے میں کیا جاتا ہے جہاں حملہ کرنا مقصود ہو۔ تاہم یہ بات ابھی تک راز ہی ہے کہ پاکستان کو ایٹمی ری پراسسنگ پلانٹ کی فراہمی سے انکار کے بعد فرانس' کہوٹہ کے بارے میں اس قدر تشویش میں کیوں مبتلا تھا اور کس کے ایماء پر اس نے اس خطرناک مشن پر اپنے دو اعلیٰ ترین سفارتکاروں کی زندگیاں داؤ پر لگانے کا فیصلہ کیا۔ ایسے مشن کسی صورت بھی اعلیٰ اتھارٹی کی اجازت کے بغیر عمل میں نہیں لائے جاتے۔ معلوم نہیں اس مشن کی اجازت فرانس کے صدر سے حاصل کی گئی تھی یا وہ سرے سے اس سے آگاہ ہی نہیں تھے۔ تاہم یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ فرانس کے سفیر کا مقصد محض کہوٹہ کے فطری حسن سے لطف اندوز ہونا اور اس کی تصویر کشی کرنا نہیں تھا۔ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ علاقے کی کیا اہمیت ہے اور وہ کسی صورت بھی اس سیکورٹی زون میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ان کی یہاں آمد کا واحد مقصد علاقے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا تھا تاکہ کہوٹہ پر کسی زمینی یا فضائی حملے کی صورت میں سو فیصد کامیابی کو یقینی بنایا جا سکے۔ انہیں کن حالات' کس چیز اور کن لوگوں نے ایک باعزت سفارتکار سے ایک گھٹیا قسم کا 007 جیمز بونڈ بننے پر مجبور کیا اس کا جواب تو وہی دے سکتے ہیں تاہم ہمارے نزدیک یہ ایک نہایت ہی بچگانہ اور احمقانہ حرکت تھی۔

لی گوریرک اور جین فورلوٹ نے کہوٹہ پہنچ کر اس کے گرد و نواح میں مکانوں اور درختوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے اور شتر مرغ کی چال چلتے ہوئے تصویریں اتارنا شروع کر دیں۔ ان کی اس حرکت کا دیہاتیوں نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔ لیکن چند لڑکیوں نے سمجھا کہ یہ گورے ان کی تصویریں بنا رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ گاؤں

کے کچھ لڑکے جو اردگرد کھیتوں میں کام کر رہے تھے یہ شور سن کر بھاگ کر آ گئے اور لڑکیوں نے چیخ چیخ کر انہیں بتایا "بھیا گورے ہماری تصویریں اتار رہے ہیں۔" پھر کیا تھا۔ لڑکوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ان کی دھنائی شروع کر دی۔ یہ تو ان کی خوش قسمتی تھی کہ گاؤں کے چند بزرگ بھی پہنچ گئے اور انہوں نے بیچ بچاؤ کرا کے ان کی جان چھڑوا دی۔ بہرحال اس وقت تک لڑکے ان کی ہڈیاں پسلیاں توڑ چکے تھے۔ اس "مہمان نوازی" کے باوجود فرانسیسی سفارتکاروں نے ڈھٹائی اور بے شرمی کی انتہا کر دی اور انہوں نے اس واقعہ کے خلاف ہمارے دفتر خارجہ میں جا کر باقاعدہ احتجاج ریکارڈ کروا دیا۔ دفتر خارجہ نے پہلے جنرل نقوی سے اس واقعہ کے بارے میں پوچھا مگر وہ اس سارے معاملے سے لاعلم تھے۔ انہوں نے مجھے فون کیا اور پوچھا "ارشاد میاں کہوٹہ میں کیا ہوا؟" میں نے فوراً جواب دیا "جی کیا ہوا؟ مجھے تو معلوم نہیں، آپ ہی بتایئے؟"

لیکن انہوں نے فون بند کر دیا۔ میں نے سوچا کہوٹہ میں ضرور کوئی نہایت ہی اہم واقعہ رونما ہوا ہے اور ابھی جنرل اختر بھی مجھ سے پوچھیں گے۔ چنانچہ میں نے فوراً اپنا ایک افسر کہوٹہ کی طرف روانہ کیا تاکہ معلومات حاصل کی جا سکیں۔ جب جنرل اختر نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر پوچھا اس وقت تک میرا بھیجا ہوا افسر تمام معلومات حاصل کر کے واپس آ چکا تھا۔

"کہوٹہ میں کیا ہوا ہے؟" ظاہر ہے۔ ہمارے دفتر خارجہ نے صدر صاحب کو رپورٹ کیا ہو گا اور انہوں نے جنرل نقوی کے بعد جنرل اختر سے پوچھا ہو گا۔

میں نے جنرل اختر کو تمام تفصیل بتا دی۔

جنرل اختر چونکہ یہ جانتے تھے کہ ہماری ٹیم کے کان بہت لمبے اور آنکھیں بہت دور تک جاتی ہیں اس لئے انہوں نے ذرا اپنی آنکھیں سکیڑ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تمہارے لڑکے تو وہاں نہیں تھے؟"

میں نے جواب دیا کہ ہماری اطلاع کے مطابق فرانسیسی "جاسوس" اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اسے خود ڈرائیو کرتے ہوئے واپس گئے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہماری ٹیم وہاں نہیں تھی۔ اگر ہمیں یہ علم ہوتا کہ وہ ہمیں کہوٹہ کے تفریحی دورے کا اعزاز "بخش" رہے ہیں تو ہم اس سے بہتر طریقے پر ان کی خاطر تواضع کرتے۔ انہیں بڑے اعزاز کے ساتھ رخصت کرتے اور شاید پھولوں کی دو خوبصورت "چادریں" بھی ان کے ہمراہ فرانس جاتیں۔

میری یہ گفتگو سن کر جنرل اختر کے چہرے پر ایک خاص فخریہ مسکراہٹ آگئی اور انہوں نے یہ سب من و عن صدر صاحب سے کہہ دیا۔

فرانسیسیوں نے ہمارے فارن آفس کے پاس اپنا احتجاج ریکارڈ کراتے ہوئے بیان دیا تھا کہ کہوٹہ کے سیکورٹی سٹاف نے انہیں زد و کوب کیا ہے مگر انہوں نے امریکیوں کو کچھ اور ہی کہانی سنائی' جس کا علم مجھے ایران سے شائع ہونے والی وہ کتاب پڑھ کر ہوا جو ایرانی طلباء کے امریکی سفارت خانے پر قبضے کے بعد حاصل کی جانے والی اہم دستاویزات پر مشتمل تھی اور جو "اسناد الانہ جاسوسی" (45) "پاکستان" جلد 1 "امریکہ کی اسلامی ممالک میں مداخلت" کے عنوان سے شائع کی گئی تھی۔

متعلقہ حصے کا ترجمہ کچھ یوں ہے۔

خفیہ

امریکن سفارتخانہ اسلام آباد 29 جون 1979ء

سیکرٹری آف سٹیٹ' واشنگٹن

عنوان۔ فرانسیسی سفارتکاروں کا اسلام آباد ایٹمی صلاحیت والے کارخانے کے قریب زد و کوب۔

اسلام آباد 12497

مختصراً"۔ فرانس کے سفیر اور اول سیکریٹری جین فورلوٹ کو 26 جون کو کہوٹہ کے قریب کچھ ٹھگوں نے اس وقت زد و کوب کیا جب وہ اپنی گاڑی میں اس گاؤں کے نزدیک سے گزر رہے تھے۔ فورلوٹ جو بیہوش ہو گیا' کہتا ہے کہ پاکستان کی حکومت نہیں چاہتی کہ کہوٹہ کے نزدیک' جہاں یورینیم کا کارخانہ ہے' کوئی غیر ملکی آئے۔

تفصیل۔ جین فورلوٹ نے 28 جون کو ہمیں اطلاع دی کہ 26 جون کی شام تقریباً پونے سات بجے وہ اور اس کا سفیر کہوٹہ کے علاقے سے جو اسلام آباد سے 30 میل کے فاصلے پر ہے واپس اسلام آباد آ رہے تھے کہ راستے میں چند ٹھگوں نے انہیں پیٹا۔ 1978ء میں فورلوٹ اپنے ایک آسٹریلوی سفارتکار کے ہمراہ اس علاقے میں گیا تھا۔ جہاں خیال کیا جاتا ہے کہ پاکستان ایٹم بم بنا رہا ہے۔ اور انہوں نے اس علاقے کی کافی تصویریں اتاریں تھیں۔ فورلوٹ نے اپنے سفیر کے ساتھ پچھلے ہفتے سفرا کی میٹنگ کے دوران پاکستان میں ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ فورلوٹ نے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات

پیش کیں کہ وہ اپنے سفیر کو اس علاقہ میں لے جائے گا اور یہ علاقہ ویسے بھی بڑا خوبصورت ہے اور سیاحت کے کتابچے میں بھی اس کا ذکر ہے۔

فورلوٹ اور اس کا سفیر شام تقریباً 4 بجے اسلام آباد سے کہوٹہ کی جانب روانہ ہوئے اور راستے میں چند ایک "دیدہ زیب" مقللت پر رکے۔ نہ ہی ان کے پاس کوئی کیمرہ تھا اور نہ ہی وہ گاڑی سے باہر آئے۔ مگر جیسے ہی انہوں نے کہوٹہ سے واپسی کا سفر اختیار کیا۔ ایک بسنتی رنگ کی گاڑی جس میں چار آدمی سوار تھے ان کے پاس سے گزری اور آگے جاکر رک گئی۔ آگے سے ایک ٹرک بھی آگیا اور راستہ تقریباً بند ہوگیا۔ فورلوٹ نے کار کو ریورس کرنا چاہا تو پیچھے سے دو موٹر سائیکل سوار آگئے اور راستہ روک لیا۔

چار آدمی گاڑی سے اترے اور دو موٹر سائیکل سے اور انہوں نے فورلوٹ اور بوڑھے سفیر کو کھینچ کر گاڑی سے نکال لیا۔ وہ زیادہ تگڑے نہیں تھے اور شلوار قمیض میں ملبوس تھے۔ فورلوٹ تو پہلے ہی ناک آؤٹ ہوگیا۔ پھر بوڑھے سفیر کی دھنائی شروع ہوئی۔ نہ ہی وہ فوجی لگ رہے تھے اور نہ ہی ان کے پاس کوئی ہتھیار تھے۔ پر ان کی شکلیں غنڈوں جیسی تھیں۔ فورلوٹ بیان کرتا ہے کہ وہ بہت سوچ سمجھ کر مار رہے تھے کہ نشانات کم پڑیں۔ پھر بھی سفیر کا ایک دانت ٹوٹا اور گہری چوٹیں آئیں اور فورلوٹ کے سر کی ہڈی میں کریک آ گیا۔

فورلوٹ کہتا ہے کہ تقریباً دس منٹ بعد جب مجھے ہوش آیا تو حملہ آور جا چکے تھے اور سفیر اپنی چوٹیں سہلا رہا تھا۔ فورلوٹ کی عینک ٹوٹ چکی تھی۔ انہوں نے کار کی چابیاں زمین پر سے اٹھائیں اور اسلام آباد پہنچ کر پولیس کو رپورٹ کی' پولیس نے پوری مدد کا وعدہ کیا۔ پروٹوکول آفیسر اور صدر پاکستان کو بھی اطلاع ہوئی اور صدر نے سفیر کے ساتھ بہت ہمدردی کا اظہار کیا۔

قطع نظر اس کے کہ حکومت پاکستان نے مجرموں کو پکڑنے کا وعدہ کیا ہے فورلوٹ کو یقین ہے کہ یہ لوگ سرکاری غنڈے تھے اور انہوں نے سرکار کے حکم پر ہی ان کی پٹائی کی اور نہایت پھرتی اور صفائی سے یہ کام سرانجام دیا۔ نہ گاڑی توڑی نہ کوئی مال لوٹا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ آئندہ کوئی غیر ملکی اس طرف کا رخ نہ کرے۔

فورلوٹ بتاتا ہے کہ کہوٹہ کے گردو نواح کافی بدل چکے ہیں۔ اس جگہ کو اب گاڑیوں کی ورکشاپ بھی کہتے ہیں۔ اور کافی پرانی فوجی گاڑیاں اردگرد کھڑی ہیں۔ تار کی باڑ کی بجائے

اب اس علاقے کے گرد ایک اونچی دیوار بنائی جا رہی ہے تاکہ باہر سے کچھ دکھائی نہ دے۔
سرکار پاکستان کو یہ علاقہ ممنوعہ قرار دے دینا چاہئے تھا' اور فرانسیسی بیچارے تو یونہی پھنس گئے۔ بہرحال چونکہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہاں پاکستان کی ایٹمی تنصیبات ہیں۔ اور اس کی نگہداشت لازمی ہے شائد اس لئے چند نوجوان افسروں نے جوش میں آ کر ان فرانسیسیوں کی پٹائی کر دی۔

کنگ

بی ٹی 7335"

یہ پڑھنے کے بعد کوئی بھی قاری یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ فرانس کا اول سیکریٹری جین فورلوٹ پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کی جاسوسی کے لئے امریکی جاسوسی ادارے سی آئی اے کا تنخواہ دار ملازم تھا اور اس کا علم شاید فرانس کو بھی نہیں تھا۔
اسی ایرانی کتاب میں ایک اور سفارتی پیغام درج ہے' جو فورلوٹ کی جاسوسی سرگرمیوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ پیغام کا ترجمہ :

"خفیہ"

از طرف۔ امریکی سفارتخانہ اسلام آباد۔
برائے۔ سیکرٹری سٹیٹ واشنگٹن ر قونصلری کراچی ر امریکی سفارتخانہ دہلی ر فرانس ر ہنولولو ر
عنوان۔ فرانسیسی آفیسر کے ساتھ ایٹمی معاملات پر بحث۔

1- جین فورلوٹ فرانس کے سفارت خانہ میں فرسٹ افسر ہے اور ہم ایٹمی معاملات پر اس سے باقاعدہ اطلاعات لیتے رہتے ہیں۔ 19 دسمبر کو ہمارے پولٹیکل قونصل کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ کہوٹہ کے قریب عجیب قسم کی عمارتیں بہت تیز رفتاری سے تعمیر کی جا رہی ہیں۔ کہوٹہ اسلام آباد کے جنوب مشرق میں ایک گاؤں ہے جہاں تقسیم ہند کے وقت بہت سے ہندو مارے گئے تھے۔

2- فورلوٹ کا کہنا ہے کہ اس نے اس جگہ کا بخوبی مطالعہ کیا ہے اور یہ ایک ایٹمی تنصیب والی عمارت لگتی ہے۔ پچھلے چھ ماہ کے دوران یہاں تیزی سے 10 عمارتیں تعمیر ہو چکی ہیں جن میں ایک مستطیل شکل کی بہت بڑی عمارت ہے۔ پاکستان میں عموماً اتنی تیزی سے کام نہیں ہوتا جس تیزی سے اس عمارت پر ہو رہا

ہے۔ فورلوٹ کا کہنا ہے کہ اس نے کافی معلومات حاصل کی ہیں اور یہ پتہ چلا ہے کہ کراچی کی ایک فرم کو 50 لاکھ ڈالر میں اس کی ایئرکنڈیشننگ کا ٹھیکہ ملا ہے۔ فورلوٹ نے ہمارے پولٹیکل کونسلر کو بہت سی تصاویر بھی دکھائی ہیں جو اس نے اور اس کے آسٹریلوی سفارتکار دوست نے اتاری تھیں۔ (یہ ویسی ہی تصاویر ہیں جو آسٹریلیا کے سفارتکار نے ہمیں دی تھیں اور ہم بیگ میں بھجوا چکے ہیں) یقیناً یہ ایٹمی تنصیبات کی تصاویر ہیں۔ فرانسیسی سفیر نے فورلوٹ سے بھی کہا کہ وہ یہ تصاویر پہلے ہمیں دکھائے پھر ملٹری اتاتشی کے ذریعے فرانس بھجوا دے۔

-3 ہمارے پولٹیکل قونصلر نے کہا کہ میں نے بھی سنا ہے کہ کوئٹہ میں کچھ کام ہو رہا ہے لیکن اس سے زیادہ مجھے بھی معلوم نہیں۔ بہرحال ہمارے پولٹیکل کونسلر نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

-4 فرانسیسی ریپروسیسنگ پلانٹ کے متعلق فورلوٹ نے بتایا کہ باقی ماندہ دو افراد میں سے کیمسٹ شاید 2 جنوری کو واپس چلا جائے۔ اور دوسرا جو انجینئر تھا اگر اسے فرانس میں کوئی خاطر خواہ کام نہ ملا تو شاید وہ واپس آ جائے۔ لیکن یہ مشکل معلوم ہوتا ہے کیونکہ انجینئر کی بیوی بچے یہاں خوش نہیں تھے اور انہوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ واپس نہیں آئیں گے۔ سپروائزر جو پاکستان اور فرانس کے درمیان دورہ پر رہتا تھا کراچی گیا ہوا ہے اور شاید واپس نہ آئے۔ فرانس کا ایک قونصلر لاہور میں ہے جو انجینئر ہے۔ لیکن وہ ایٹمی سائنس دان نہیں بلکہ بلڈنگ انجینئر ہے اور اس کی خدمات ایک فرانسیسی فرم S.E.E.E سے مستعار لی گئی ہیں۔ فورلوٹ نے مزید بتایا کہ اسے بھی کبھی کبھی مشورہ کے لئے بلایا جاتا ہے اور شاید وہ یہیں رہے اور واپس نہ جائے۔

-5 فورلوٹ کا ذاتی خیال ہے کہ پاکستان ازخود ریپروسیسنگ پلانٹ بنانے کی کوشش کرے گا جس میں شاید بہت وقت اور پیسہ لگے۔ جب فورلوٹ سے پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے چیئرمین منیر خان کے فرانسیسیوں کے ساتھ روابط کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کچھ نہیں بتایا۔

ہمل

بی ٹی 2497"

کاش ہماری ایجنسیوں کے پاس اس قسم کے ملک دشمن جاسوسوں اور سفارتکاروں سے نمٹنے کے لئے ان کے مقابل کے ذرائع' تکنیک اور قوت آ جائے۔

ڈاکٹر قدیر خان سے ملاقات کی خواہش

یہ قصہ بھی اسی کہانی کا جزو ہے جس میں امریکہ پاکستان کی گلی گلی اور کوچہ کوچہ ایٹم بم ڈھونڈ رہا ہے۔

ایک گورے اخباری نمائندے نے ہمارے دفتر خارجہ سے شکایت کی کہ آپ کی ایک سیکورٹی ایجنسی کے اہلکاروں نے مجھے زد و کوب کیا ہے۔ یہ شکایت باضابطہ طور پر رجسٹر کرائی گئی اور اس کا پس منظر یہ تھا کہ یہ گورا اسلام آباد کی گلیوں میں ڈاکٹر قدیر خان سے خصوصی انٹرویو کے لئے جیمز بونڈ بن کر گھوم رہا تھا کہ غلط جگہ پہنچ گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ اپنی ناک تڑوا کر اپنے ہوٹل کے کمرے میں دو دن لیٹا رہا۔

ہمیں اکثر اوقات اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ یہ گورے ابھی تک 1947ء سے قبل کے دور میں رہ رہے ہیں اور آج بھی ہمیں اپنی رعایا سمجھتے ہیں اور حکمرانی کے اس فوبیا نے انہیں اس غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے کہ وہ ہمارے قومی اور نجی معاملات میں جب چاہیں جہاں چاہیں اپنی ٹانگ اڑا سکتے ہیں۔ اس طرح کے واقعات کو وقوع پذیر ہونے سے روکنے اور اپنے غیر ملکی مہمانوں کے معاملات کو درست رکھنے کے لئے ہم نے دفتر خارجہ کو مشورہ دیا تھا کہ ایسے غیر ملکیوں کو جو سفارتکار نہیں ہیں ایسے خاص کار نمبر الاٹ کئے جائیں جو پہلے سے مستعمل نمبروں سے مختلف ہوں اور آسانی سے پہچانے جا سکیں۔ دفتر خارجہ نے ہمارے اس مشورے کو تسلیم کر لیا اور ابھی تک اس پر عمل بھی ہو رہا ہے۔

بہرحال وزارت داخلہ کے جوائنٹ سیکریٹری ضیاء حسن نے جو میرے اچھے دوست بھی تھے' مجھ سے اس گورے اخباری نمائندے کی پٹائی کے بارے میں پوچھا۔ ہماری نگرانی کرنے والی ٹیم کے ارکان مجھے ساری کہانی سنا چکے تھے' ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم مداخلت نہ کرتے تو اس گورے صاحب کی ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔

واقعہ کچھ یوں تھا کہ اس غیر ملکی صحافی کو جو ڈاکٹر قدیر خان کا انٹرویو کرنا چاہتا تھا ان کی رہائش گاہ کا علم نہیں تھا۔ وہ صرف ان کے رہائشی سیکٹر کے بارے میں جانتا تھا۔ اس نے مخصوص قسمت آزمائی کے لئے ایک گھر کے دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی دبا دی۔ جواب میں

ایک ملازمہ باہر نکلی۔ ہمارے اس صحافی دوست نے ٹوٹی پھوٹی اردو ملی انگریزی میں اس خاتون سے "ڈاکٹر قدیر خان جو ایٹم بم بنا رہے ہیں" ان کا پتہ پوچھا۔ ظاہر ہے یہ سب اس خاتون کے لئے ناقابل فہم تھا۔ اس نے موصوف کو جھاڑ پلائی تو انہوں نے ایک پرانا حربہ استعمال کرنے کا فیصلہ غالباً یہ سوچ کر کیا کہ تیسری دنیا کے ممالک میں کام نکلوانے کا اس سے بہتر طریقہ کوئی اور نہیں ہے۔ چنانچہ اب ان کے ہاتھ میں چند کرارے نوٹ تھے اور وہ زبردستی یہ رقم اس ملازمہ کے ہاتھ میں تھمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بے چاری اس صورتحال سے خاصی نروس ہوئی اور اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخنا شروع کر دیا۔ اس کی یہ غیر متوقع چیخیں سن کر اندر سے اس کا شوہر اور بھائی بھاگتے ہوئے آ گئے۔ نظر آنے والا منظر ان کے لئے ناقابل فہم نہیں تھا۔ خاتون نے بتایا کہ یہ گورا نہ صرف مجھے پیسے دے رہا ہے بلکہ میرا ہاتھ بھی کھینچ رہا ہے۔ ادھر صاحب کے منہ سے شراب کی بو بھی آ رہی تھی۔ لہٰذا خاتون کی مدد کے لئے آنے والوں کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ گورے صاحب ان کی عزیزہ کو "چالو مال" سمجھ کر لے جانا چاہتے تھے' انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ گورے صاحب کا بینڈ باجہ بجانا شروع کر دیا۔ یہ تو اس کے نصیب اچھے تھے کہ ہمارے آدمی اتفاق سے وہاں پہنچ گئے۔ اسی اثناء میں چند ہمسائے بھی گھروں سے باہر نکل آئے۔ گورے صاحب پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش بند ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ میں ایک صحافی ہوں۔ جس پر انہیں باحفاظت ان کے ہوٹل پہنچا دیا گیا۔ اگر وہ بے وقوف آدمی شکایت نہ کرتا تو شاید ہمیں اصل کہانی کا علم ہی نہ ہوتا۔ اگر وہ ہمارے آدمیوں کو بتا دیتا کہ وہ ڈاکٹر قدیر خان کے ہاں جانا چاہتا ہے تو شاید اس کی خاطر مدارت کسی اور طریقے سے ہوتی۔

کہوٹہ کی تصاویر

امریکہ ہمارے ایٹمی پروگرام کی تفصیلات جاننے کے لئے ہر طرح کے ذرائع استعمال کر رہا ہے۔ اپنی معمول کی ڈیوٹی کے دوران ہمیں ایک ایسے پاکستانی نوجوان کے بارے میں علم ہوا جس نے کہوٹہ کی تصاویر بنائی تھیں۔ یہ نوجوان کسی امریکی یونیورسٹی میں ریسرچ سکالر تھا۔ تحقیقات کرنے پر علم ہوا کہ اس کے پروفیسر نے اسے کہوٹہ اور نواحی دیہات اور علاقے کی تصاویر بنا کر لانے کو کہا تھا کیونکہ اس کے تحقیقی مقالے کا موضوع "دیہات کی سماجی زندگی" تھا۔ ہم نے اس نوجوان کو مشورہ دیا کہ وہ اسلام آباد کے گرد و نواح میں کسی ملتے

جلتے علاقے کی تصویریں بنا کر لے جائے اور اپنے پروفیسر سے کہے کہ یہ کہوٹہ کی ہیں۔ اس نے ہمارے کہنے پر عمل کیا مگر جب ہم نے اسے اس کے پروفیسر کے اس مشورے اور خواہشوں کی اصلیت سے آگاہ کیا تو وہ بے حد نروس اور پریشان ہوا۔

اس طرح کی متعدد ناکامیوں کے بعد امریکیوں نے کہوٹہ کی تصاویر کے لئے سی آئی اے کے ماہرین کو پاکستان بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ایک روز مجھے جنرل نقوی نے بتایا:

"ایک امریکی سیاح کو کہوٹہ اور اس کے اردگرد کے علاقے کی مووی اور سٹل کیمروں سے تصاویر بناتے دیکھا گیا ہے' کہوٹہ کے سیکورٹی سٹاف نے اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ انہیں جل دینے میں کامیاب ہو گیا' کہوٹہ کا سیکورٹی سٹاف اس کا پیچھا کرتا ہوا راولپنڈی کے پرل کانٹی نینٹل ہوٹل تک آیا مگر اسے قابو کرنے میں ناکام رہا' دیکھیں! اسے یہ تصاویر لے جانے میں کامیاب نہیں ہونا چاہئے۔"

اس طرح کا ہر مشن خفیہ والوں کے لئے ہمیشہ ایک چیلنج ہوتا ہے۔ مگر یہ ایک خاص مشن تھا کیونکہ ہمیں اپنے ٹارگٹ کا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا۔ ہماری ٹیم فوراً حرکت میں آئی اور تگ و دو شروع ہو گئی' ہم نے ہوٹل کا ریکارڈ چیک کیا۔ اس کا نام مہمانوں کے رجسٹر میں موجود تھا مگر جس وقت تک ہم ہوٹل پہنچے وہ ہوٹل چھوڑ کر جا چکا تھا اور اب اسے تلاش کرنا گھاس کے ڈھیر میں سوئی ڈھونڈنے والی بات تھی۔ لیکن میں نے بہت مرتبہ محسوس کیا کہ اللہ تعالیٰ کا فضل' کوئی غیبی قوت' کوئی غیبی ہاتھ ہر مشکل وقت میں ہماری مدد اور رہنمائی کرتا ہے' وہی قوت پاکستان کی رکھوالی کر رہی ہے اور ہمارے جیسے ناتواں اور نادانوں کو روشنی بخش رہی ہے۔ ہوٹل کی انتظامیہ سے نہ صرف ہمیں اس کے حلئے کا اچھی طرح پتہ چل گیا بلکہ اس کی کار کا نمبر بھی معلوم ہو گیا جو امریکی سفارتخانے سے اسے لینے کے لئے آئی تھی۔ اس سلسلے میں ویٹر اور بیل بوائے کی یادداشت بڑی معاون ثابت ہوئی۔ پہلے اور فوری قدم کے طور پر اس کار کو تلاش کرنے کا پیغام نشر کر دیا گیا اور گھنٹے بھر میں ہمیں اطلاع مل گئی کہ مطلوبہ کار نے اٹک پل پار کیا ہے اور پشاور کی طرف جا رہی ہے۔ ہم نے پشاور میں اپنی ٹیم کو خبردار کر دیا اور ہوٹل کے دونوں لڑکوں کو امریکی سیاح کی حتمی شناخت کے لئے پشاور بھیج دیا۔

سی آئی اے کی کارکردگی کے بارے میں ہمارا تجربہ ہے کہ اس کے ایجنٹ کسی بھی غیر ملک میں صرف ایک خاص مشن پر نہیں جاتے بلکہ ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے

قیام کے دوران ایک سے زیادہ مشن مکمل کر لیں۔ ہمیں ان ہوٹلوں کا بھی علم تھا جہاں عام طور پر امریکی ٹھہرا کرتے تھے اور ان ہوٹلوں کے کارکنوں میں ان کے ایجنٹوں کے بارے میں بھی ہمیں خبر تھی' لہٰذا ان کے لئے ایک خاص کمرہ تیار کرنا ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں تھا۔

پتہ چلا کہ اس نمبر کی گاڑی میں دو امریکی تھے۔ پہلے وہ پشاور میں اپنے افغان ایجنٹوں سے ملاقات کے لئے گئے۔ جن میں افغان مہاجرین کے کیمپوں میں قائم مراکز صحت میں کام کرنے والے کارندے بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ انہوں نے طویل ملاقاتیں کیں' وہ رات گئے پشاور واپس آئے اور ہوٹل میں ان کے لئے خاص طور پر تیار کرائے گئے کمرے میں نادانستہ طور پر پہنچ گئے۔ وہ صبح کاذب تک وہاں رپورٹیں وغیرہ مرتب کرتے رہے۔ ہم ان پر مکمل نظر رکھے ہوئے تھے۔

اگلے روز انہوں نے سفارتی بیگ میں جانے والی ڈاک کے لئے ان سفارتی رپورٹوں پر مبنی لفافے تیار کئے۔ ہمیں یقین تھا کہ کہوٹہ کی تصاویر پر مبنی فلمیں وغیرہ بھی اسی سفارتی بیگ میں بھجوا دی جائیں گی اور ان بیگز کو قابو کرنا ہمارے بس میں نہیں ہوگا۔ ہمیں اپنی ساری محنت رائیگاں جاتی نظر آ رہی تھی۔

صبح سویرے انہوں نے یہ پیکٹ پشاور میں امریکی قونصلیٹ کے عملے کے حوالے کر دیا اور خود ایک بار پھر افغان مہاجرین کے کیمپوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس مشن پر مامور ہمارے نوجوانوں کے لئے یہ صورتحال خاصی مایوس کن تھی۔ یہ ایک طرح سے مشن کی ناکامی تھی۔ پھر بھی وہ امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اسی امید کے سہارے انہوں نے کمرے کی تلاشی لینے کا فیصلہ کیا۔ تلاشی کے دوران سوٹ کیسوں سے 8 ایم ایم کی مووی کے دو سپول اور کیمرے کی آٹھ سیل بند فلمیں برآمد ہوئیں۔ یہ اسی غیبی قوت کا معجزہ تھا کہ امریکیوں نے یہ فلمیں سفارتی بیگ کی بجائے بذات خود لے جانے کا فیصلہ کیا تھا اس لئے یہ ہمارے ہاتھ لگ گئیں۔

صبح دس بجے کے قریب یہ برآمد شدہ مال میری میز پر تھا۔ میں نے اپنے ڈائریکٹر جنرل اور جنرل نقوی کو خبر دی کہ مشن کامیاب رہا ہے۔ جنرل نقوی صدر ضیاء کو پہلے ہی یہ اطلاع دے چکے تھے کہ ایک امریکی نے کہوٹہ کی فلمبندی کی ہے۔ لہٰذا ہم نے انہیں خوشی خوشی یہ اطلاع دی کہ ہم نے فلمیں حاصل کر لی ہیں' تاہم ابھی یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ یہ مطلوبہ فلمیں ہی ہیں یا ہم کچھ اور لے آئے ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر یہ دیکھنے کی بے چینی تھی کہ ان

فلموں میں کیا عکس بند کیا گیا ہے۔ میری خواہش تھی کہ ہم انہیں اپنی فوٹو لیبارٹری میں دھلوائیں مگر ڈی جی نے مجھے ہدایت کی کہ میں انہیں جنرل نقوی کے حوالے کر دوں۔ میں نے جنرل نقوی سے رابطہ کیا تو وہ صدر سے ملنے جا چکے تھے' شاید یہ بتانے کہ آئی ایس آئی کی ٹیم نے فلمیں برآمد کر لی ہیں۔

سہ پہر کو ڈی جی نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور پوچھا۔

"وہ فلمیں کہاں ہیں تم جن کا تذکرہ کر رہے تھے؟"

"میرے پاس ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"انہیں یہاں لے آیئے۔" ڈی جی نے حکم دیا اور میں نے وہ "مال" ڈی جی کی میز پر رکھ دیا۔

"ہمیں یہ امریکیوں کو واپس کرنا ہیں' یہ صدر کا حکم ہے" جنرل صاحب بولے۔

ان کا یہ حکم سن کر مجھے بہت پریشانی ہوئی۔ جس مشن کو ہم نے اتنی محنت اور بھاگ دوڑ کے بعد مکمل کیا تھا اس کے بارے میں صدر مملکت یہ حکم دیں گے یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

میں نے شکستہ دلی سے کہا' "سر! کم سے کم ان فلموں کو روشنی تو دکھا دیں تاکہ ان پر ہماری ایٹمی تنصیبات کا عکس باقی نہ رہے۔" مگر ڈی جی صاحب کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہ تھے۔ انہوں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"صرف وہ کرو جو صدر صاحب نے حکم دیا ہے' وہ بہتر جانتے ہیں۔"

صدر کے حکم کی اس اندھی تقلید پر اپنے ڈی جی کے بارے میں میرے دل میں پہلی بار منفی جذبات پیدا ہوئے مگر میں بے بس تھا۔ وہ فلمیں امریکی سفارتخانے کو واپس کر دی گئیں۔ میں کئی روز تک پریشانی میں مبتلا رہا اور ایک روز میرے استفسار پر جنرل نقوی نے مجھے بتایا:

"تم جانتے ہو میں صدر کو پہلے ہی اطلاع دے چکا تھا کہ ایک امریکی نے کہوٹہ اور اس کے اردگرد کے علاقے کی عکس بندی کی ہے۔ پھر امریکی سفیر نے صدر سے شکایت کی کہ کسی سیکورٹی ایجنسی کے افراد نے پشاور کے ایک ہوٹل میں ایک امریکی سیاح کے کمرے کی تلاشی لے کر اس کے سوٹ کیس سے پاکستان کے قدرتی مناظر کی عکس بندی پر مشتمل کچھ فلمیں چرا لی ہیں۔ ان فلموں میں محض پوٹھوہار کی دیہاتی زندگی کے مناظر ہیں۔ اس کے علاوہ

ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ میں نے جب صدر کو اس واقعہ کی اطلاع دی تھی تو انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ وہ فلمیں حاصل کر لی گئی ہیں اور آئی ایس آئی نے میرے کہنے پر یہ سب کچھ کیا ہے۔ تاہم صدر نے میری ایک نہ سنی اور ان فلموں کو واپس کر دیا۔"

اس واقعہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ امریکی ہمارے ایٹمی پروگرام کے بارے میں کس جنون میں مبتلا تھے' تاہم صدر ضیاء کی مداخلت پر سی آئی اے کے کارندے کہوٹہ کی تصویریں لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ امریکی سفیر نے یقینی طور پر ان فلموں کی واپسی کے لئے صدر کی منت سماجت کی ہو گی' مگر صدر نے ہماری کارکردگی کو سراہنے کے بجائے امریکی سفیر کی درخواست پر عمل کیوں کیا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب کوئی حاضر سروس سرکاری ملازم نہیں دے سکتا۔



فرانس بھی بودا نکلا

1978ء میں فرانسیسی ری پروسیسنگ پلانٹ کا سودا منسوخ ہوا۔ پھر 1990ء میں جب فرانس کے صدر متران پاکستان آئے تو اس وقت تک بھٹو کی قسمت کا فیصلہ امریکہ کی خواہشات کے مطابق ہو چکا تھا' ایران اور عراق جنگ میں تھک ہار چکے تھے' پاکستان کی مدد سے افغانیوں نے اپنے ملک سے روسی افواج کو نکال دیا تھا' دنیائے سیاست کا نقشہ بدل چکا تھا' ان حالات میں انہوں نے پاکستان کو 900 میگاواٹ کا ایٹمی بجلی گھر فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ اور یہ بھی طے پایا کہ پاکستان اور فرانس پرامن ایٹمی توانائی کے علاوہ صحت' کاشتکاری اور دوسری صنعتوں میں بھی ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔

پاکستان کا خیال تھا کہ شاید فرانس امریکہ کے دباؤ سے آزاد ہو چکا ہے اور پاکستان کے گرد جو دیوار کھڑی کی جا رہی ہے اب اسے گرا کر خودمختاری کا ثبوت دے گا' مگر ایسا نہ ہوا۔ حالانکہ ایٹمی بجلی گھر کا منصوبہ انٹرنیشنل ایٹمی توانائی ایجنسی کی اجازت سے اور معین کردہ حدود میں رہتے ہوئے تیار کیا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی امریکہ کو اس سے بہت تکلیف ہوئی' اور اس نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے یہ معاہدہ بھی منسوخ کروا دیا۔

جس وقت یہ معاہدہ ہوا راقم نے اسلام آباد میں موجود چند غیر ملکی سفارتکاروں' خاص طور سے فرانس کے ملٹری اتاشی سے بات چیت کی اور ان کی آراء معلوم کیں۔ ان کا خیال تھا:

"چونکہ یہ ایٹمی پاور پلانٹ' انٹرنیشنل ایٹمی انرجی ایجنسی کے زیر نظر رہے گا' اس لئے امریکہ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے مگر امریکہ' پاکستان اور فرانس کے بڑھتے ہوئے روابط برداشت نہیں کر پا رہا۔ امریکہ صرف اس لئے چون و چرا کر رہا ہے کہ وہ اس خطے میں اپنا اثر و رسوخ کم ہوتے نہیں دیکھ سکتا' اور خطے کا "ماسٹر" رہنا چاہتا ہے۔

جب بھی پاکستان نے چین یا فرانس کے ساتھ ایٹمی توانائی کے سلسلے میں بات چیت

شروع کی ہے' امریکہ راستے میں حائل ہوا ہے اور اس کا کردار ہمیشہ سے منفی رہا ہے۔ امریکہ یہ کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ پاکستان سیاسی' اقتصادی یا دفاعی میدان میں خود کفیل ہو جائے اور امریکہ کے دباؤ سے آزادی حاصل کر لے۔ امریکہ صرف خارجی ہی نہیں بلکہ پاکستان کے اندرونی معاملات میں بھی دخل اندازی کرتا ہے۔

چونکہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اور دوسرے اسلامی مسلم ممالک خاص طور سے ترکیہ' ایران اور افغانستان کے ساتھ دیرپا اور گہرے روابط چاہتا ہے۔ اس لئے امریکہ اس کوشش اور خواہش سے خوفزدہ ہے۔ امریکہ' پاکستان اور فرانس کی بڑھتی ہوئی دوستی کو بھی اسی لئے شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور آنے والے برسوں میں امریکہ مختلف طریقوں سے پاکستان کا بازو مروڑے گا۔"

ایک اور سفارتکار نے کہا:

"چین کے ساتھ ساتھ فرانس بھی پاکستان کا قابل اعتماد اتحادی بن سکتا ہے اور پاکستان کو دفاعی سامان بنانے کی تکنیک منتقل کر سکتا ہے۔ مگر پاکستان کے لئے یہ لازمی ہے کہ اپنے دفاعی ساز و سامان حاصل کرنے اور بنانے کے لئے صرف ایک ہی ملک پر انحصار نہ کرے۔ فرانس پاکستان میں ہلکے ہیلی کوپٹر' گن شپ ہیلی کوپٹر اور بحریہ کے لئے سرنگیں ناکارہ کرنے والے سمندری جہاز بنا سکتا ہے کیونکہ اس معاملے میں فرانس کو خاص مہارت حاصل ہے۔

امریکہ نے دفاعی سامان میں جو کچھ پاکستان کو دیا ہے وہ پاکستان کی ضروریات کے لئے نہیں بلکہ خود اپنی خاص حکمت عملی کے تحت دیا ہے۔ امریکہ تو بس یہی چاہتا ہے کہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک امریکہ کے دست نگر رہیں اور ان کے ہاتھ میں ہمیشہ کاسۂ فقیری رہے۔

پاکستان کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنی بقا اور ترقی کے لئے جدید انڈسٹری قائم کرے۔ اب تک تو پاکستان صرف زندہ رہنے کے لئے بمشکل سانس ہی لیتا رہا ہے۔"

ایک دوسرے سفارتکار کا خیال تھا:

"فرانس نے چونکہ پاکستان کو 900 میگاواٹ کا ایٹمی توانائی کا پلانٹ دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ اس لئے اس پلانٹ کو کم لاگت سے چالو رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پاکستان' فرانس سے ری پروسیسنگ پلانٹ کا دوبارہ تقاضا کرے۔ کیونکہ اتنے بڑے بجلی گھر کے لئے یورینیم کی مانگ کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ استعمال شدہ یورینیم کو دوبارہ قابل

استعمال بنانے کے لئے ریپروسیسنگ پلانٹ لگایا جائے۔ اور جہاں تک پاکستان کے لئے ایٹمی طاقت بننے کا سوال ہے اس سلسلے میں دو آراء نہیں ہو سکتیں کہ پاکستان کو چونکہ اپنے سے پانچ گنا بڑے دشمن کا سامنا ہے' اس لئے اس کے پاس دفاعی ایٹمی ہتھیار کا ہونا لازمی ہے۔ یعنی (nuclear deterrent) پاکستان کی بقاء اور سلامتی کے لئے ضروری ہے۔ اگر کوئی پاکستانی یہ کہے کہ پاکستان کو ایٹمی ہتھیاروں کی ضرورت نہیں تو وہ اپنے قومی مفادات کا سودا کر رہا ہے۔"

بہرحال ہوا وہی جو ہونا تھا۔ فرانس کو امریکہ نے پھر دبا لیا اور اس نے پاکستان سے کیا ہوا یہ سودا پھر یکطرفہ طور پر منسوخ کر دیا۔

امریکہ کسی طور پاکستان کا دوست نہیں' وہ صرف اپنے مفادات کے لئے پاکستان کو استعمال کر رہا ہے اور کرتا رہے گا' پاکستان کو امریکہ سے کبھی کسی خیر کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔



موت کے سوداگر

کسی بھی غیر ملکی سفارت کار کا میزبان ملک میں غیر سفارتی سرگرمیوں اور غیر قانونی حرکات کا مرتکب ہونا یوں تو عام سی بات ہے مگر جنیوا کنونشن کی رو سے یہ معاملہ انتہائی حساس سمجھا جاتا ہے اور اس کے بارے میں کنونشن کی دستاویزات میں ضروری اصول طے کر دیئے گئے ہیں۔ تاہم کسی بھی سفارت کار کی اس طرح کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے سے پہلے مہمان سفارت کار کے ملک اور میزبان ملک کے مابین عمومی تعلقات' ان ممالک کے سیاسی حالات اور ان کے لئے دفاعی خطروں کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

امریکی سفارتخانے کا ایک سیکنڈ سیکرٹری جس کا نام بوب تھا' اسلام آباد کے 7/4 سیکٹر میں رہائش پذیر تھا۔ ہماری معمول کی نگراں ٹیم نے کئی بار ہمیں رپورٹ کیا کہ اکثر رات کے اندھیروں میں بہت سے خان اور ملک صاحبان پیجارو اور دیگر بڑی بڑی گاڑیوں میں بوب کے گھر آتے جاتے ہیں۔ یہ اطلاع ہمارے لئے اس لئے اہم تھی کہ مسٹر بوب کا نام نہ تو آئی ایس آئی کے ساتھ افغانستان کے حوالے سے رابطہ افسران کی فہرست میں شامل تھا اور نہ ہی اس کا تعلق انسداد منشیات کے سکواڈ سے تھا۔ اس لئے بوب ہمارے لئے ایک پر اسرار شخصیت بن گیا۔ بوب کی بیوی تھی نہ بچے اور وہ گھر میں اکیلا رہتا تھا اور مزید یہ بھی مشاہدے میں آیا کہ وہ اکثر پاکستان سے باہر بھی جایا کرتا تھا۔

اس کیس میں دو عناصر خاصے اہم تھے۔ ایک افغانستان کی جنگ۔ جب سے روسی فوجوں کے خلاف افغانستان میں مزاحمت کی جنگ شروع ہوئی تھی امریکہ کی شدید خواہش تھی کہ وہ خود اس جنگ کا کنٹرول حاصل کر لے اور آئی ایس آئی کا کردار محض بارہویں کھلاڑی کا سا ہو کر رہ جائے۔ امریکی سفارتکار ہمیشہ افغان راہنماؤں سے براہ راست ملاقات کی کوشش کرتے یا آئی ایس آئی سے کہتے کہ ان راہنماؤں کے ساتھ ہماری ملاقات کا اہتمام کیا جائے اور ہم ان لوگوں کو امدادی رقوم اور دیگر سامان خود اپنے ہاتھوں سے دیں تاکہ افغان رہنما امریکہ کے مرہون منت رہیں۔ امریکہ کو اس خواہش کی تکمیل سے باز رکھنے کے لئے آئی ایس آئی کو خصوصی منصوبہ بندی کرنا پڑی' کیونکہ ان کی اس خواہش کی تکمیل کا مطلب یہ

تھا کہ امریکہ افغان جدوجہد کو ہائی جیک کر لے۔

دراصل امریکہ براہ راست اس جدوجہد کو کنٹرول کر کے افغانستان میں امریکہ کی حامی ایک ایسی حکومت کے قیام کا خواہاں تھا جو "کلیتاً" سیکولر ہو۔ جب روسی افواج افغانستان میں داخل ہوئیں تو ہم نے فوری طور پر اس کی اطلاع صدر پاکستان کو دی۔ انہوں نے جب اس معاملے پر امریکیوں سے بات کی تو وہ اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان کے نزدیک یہ ناممکن تھا۔ مگر جب تیسرے ہی دن افغان مہاجرین اسلام آباد میں آنا شروع ہو گئے تو امریکیوں کو "علم" ہوا کہ افغانستان پر روسی قبضہ ہو چکا ہے۔ ہمیں یقین تھا کہ انہیں روسی حملے کا بہت پہلے سے علم تھا، مگر امریکی ہمیں یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ یہ حملہ ان کے لئے بھی غیر متوقع تھا۔ روسی فوجوں کی افغانستان میں آمد یقینی طور پر امریکیوں کے ایک بڑے منصوبے کا حصہ تھی، اس جنگ میں امریکہ کے منفی کردار کا تفصیلی تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس نے پوری افغان جدوجہد کا چہرہ مسخ کر کے رکھ دیا اور آئی ایس آئی کے کردار کو بھی سبوتاژ کرنے کی کوشش کی۔ (اس مسئلے پر تفصیلی بحث کے لئے ایک علیحدہ کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔)

دوسرا عنصر منشیات کا تھا۔ یہ بات اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ منشیات نے امریکہ کی خارجہ پالیسی میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ پاکستان میں بھی انہوں نے ہماری قدروں اور اخلاقیات کی تباہی کے لئے منشیات کے ہتھیار کو کامیابی سے استعمال کیا۔ ہمارے پاس یہ اطلاعات بھی موجود تھیں کہ امریکہ، کینیڈا اور دیگر مغربی ممالک کے سفارتخانوں سے منسلک ڈرگ لیزان آفیسرز (DLO) نے بجائے خود اپنی حکومتیں قائم کر رکھی تھیں اور وہ ہمارے دفتر خارجہ کی اجازت کے بغیر پاکستان کے ہر حصے میں گھومتے تھے اور جاسوسوں کا ایک جال بچھا رکھا تھا جو ان کے لئے وہ معلومات بھی اکٹھی کرتے تھے، جن کا انسداد منشیات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے بلیک میلنگ سے لے کر بھاری رشوتیں دینے تک کا سلسلہ جاری رکھا اور کھلے عام پاکستان کے تحفظ کے خلاف سرگرمیوں میں مصروف رہے۔

منشیات کے عالمی سوداگروں کو پکڑنے کے لئے یہ طریقہ کار وضع کیا گیا تھا کہ وہ اپنے منتخب شدہ کسی "کیریئر" کو منشیات کی تھوڑی سی مقدار دے کر باہر بھیجیں گے تاکہ امریکہ اور یورپ میں ان کی مدد سے پورے گینگ کو پکڑا جا سکے۔ مگر انسداد منشیات کے یہ ذمہ دار افسران طے شدہ تھوڑی مقدار سے کہیں زیادہ منشیات ان "کیریئرز" کے ہاتھ باہر بھجواتے

رہے اور خود بھی بلا روک ٹوک جتنی اور جیسی منشیات چاہتے لے جاتے تھے' یوں وہ نہ صرف اس مکروہ دھندے میں خود شامل رہے بلکہ انہوں نے منشیات کی عالمی منڈی میں لاکھوں ڈالر بھی کمائے۔ ہماری بے بسی دیکھئے کہ کسی ایجنسی کو یہ اجازت نہ تھی کہ انہیں یا ان کے بھیجے گئے کسی کیریئر کو چیک کر سکیں۔

افغانستان کی مقدس جنگ پر استعمال ہونے والا امریکی امداد کا بہت بڑا حصہ منشیات کی فروخت سے حاصل شدہ رقم پر مشتمل تھا اور امریکہ اپنے ان ایجنٹوں کو جو پاکستان میں منشیات کے فروغ کی سرگرمیوں میں مصروف تھے اس فنڈ کی لوائیگی کے ذریعے استعمال کر رہا تھا۔ امریکیوں نے اس سرگرمی کی آڑ میں پاکستان کے کونے کونے میں ہیروئن پھیلانے کے لئے جو مذموم کارروائی کی وہ بجائے خود امریکہ کی پاکستان کے ساتھ "دیرینہ دوستی" اور پاکستان کے عوام کے ساتھ "دلی ہمدردی" کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

امریکہ نے منشیات کے کنٹرول کے لئے پاکستان کی امداد کا سلسلہ 80-1979ء میں شروع کیا جب پوست کی کاشت انتہائی محدود پیمانے پر ہوتی تھی اور غریب کاشتکار محض اپنی علاقائی ضرورت کے مطابق یہ پودا کاشت کرتے تھے۔ مگر اس امداد کی آڑ میں امریکہ نے بیورو آف انٹرنیشنل نارکوٹکس کے ذریعے ان کاشتکاروں کو پوست کی کاشت کے لئے خفیہ طریقوں سے اور اپنے ایجنٹوں کے ذریعے جدید ترین تکنیکی سہولتیں' ادویات' عالمی منڈیاں' محفوظ راستے اور سب سے بڑھ کر انہیں براؤن اور سفید "سونے" کی انتہائی دلکش اور شاندار قیمتیں لوا کیں۔ امریکہ کی ان کرم فرمائیوں کی بدولت بوقت تحریر تقریباً 6 ہزار ہیکٹر اراضی پر پوست کاشت ہوتی ہے۔ انتہائی غیر ترقی یافتہ اور دور دراز علاقوں میں ہیروئن تیار کرنے کے 100 کے قریب کارخانے کام کر رہے ہیں۔ مقامی اور عالمی مارکیٹ میں اس وقت ہیروئن کی تجارت کے "معزز پیشے" سے ہزاروں کی تعداد میں "شرفاء" منسلک ہیں اور پاکستان میں ہیروئن کے عادی افراد کی تعداد تیس لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ افیون تباہی اور بربادی کے بجائے دکھوں کا مداوا کرنے کے لئے استعمال کی جا سکتی ہے۔ اس لئے اسے "ایٹم برائے سکون" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس بات کا بھی افسوس ہے کہ امریکی منصوبہ بندی اور ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی کی منفی پالیسیوں اور منفی کردار کی وجہ سے ہم قدرت کے اس عطیے سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ حالانکہ یہی وہ پودا ہے جس سے ہیروئن حاصل کرنے کے بجائے مارفین' کوڈین اور تھیابین جیسے مفید لور کار آمد طبی عناصر حاصل کئے جا سکتے ہیں' جو زندگی بچانے والی لور درد سے

نجات دلانے والی ادویات کا لازمی جزو ہیں۔ اگر ہم پوست کے پودے سے یہ عناصر حاصل کر کے عالمی منڈی میں بین الاقوامی دوا ساز اداروں کو برآمد کر رہے ہوتے تو پاکستان ہر سال لاکھوں ڈالرز کا زر مبادلہ کما سکتا تھا۔ ہمیں آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے بھاری قرضے لینے نہ پڑتے۔ مگر پاکستان کے کروڑوں عوام کی خوشحالی اور ترقی کا خواب ان بیرونی اور اندرونی "خیر خواہوں" کی وجہ سے ہی کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

بہرحال بوب کے بارے میں ان اطلاعات کے بعد ہم نے اسے مستقل نگرانی میں لے لیا مگر ہمارے کارکن ساتھی ان کے گھر آنے جانے والی گاڑیوں کی نمبر پلیٹوں اور بوب کی آمدورفت کے علاوہ اور کوئی مفید معلومات حاصل نہ کر سکے۔ ہم نے بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ بوب کے گھر میں جاسوسی کرنے والے خفیہ آلات نصب کر دیئے جائیں تاکہ مہمانوں کے ساتھ اس کی گفتگو سنی جا سکے۔ یہ فیصلہ بڑا نازک تھا مگر اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ اس کے نتائج ہمیں کسی مصیبت میں بھی گرفتار کروا سکتے تھے' ہم یہ رسک لینے کے لئے تیار ہو گئے۔

چنانچہ ایک دن جب بوب دفتر میں تھا۔ ہمارا ایک آدمی نہایت ہوشیاری سے اس کے گھر میں داخل ہو گیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بوب کے بیڈ روم اور سائیڈ روم کی الماریوں میں انتہائی قیمتی اور جدید ترین رائفلیں' پستول' بندوقیں اور کیمرے بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ایک باتھ روم میں چالو حالت میں ایک وائرلیس سیٹ بھی تھا۔ اسے بوب کے تکیے کے نیچے سے اس کا بٹوہ بھی ملا جو وہ شاید جانے کی جلدی میں بھول گیا تھا۔ اس بٹوے میں اس کا سی آئی اے کا شناختی کارڈ تھا۔ ہمارے آدمی نے سارے گھر کی تصاویر بنائیں کارڈ کی تصویر بھی بنا کر اسے واپس اپنی جگہ رکھ دیا گیا۔ اور خفیہ آلات لگا کر واپس آ گیا۔

اب سوال یہ تھا کہ یہ سارے ہتھیار انسداد منشیات کے حوالے سے جمع کئے گئے تھے یا بوب خود ہتھیاروں کی تجارت میں ملوث تھا؟ ہمارے پاس اس سوال کا کوئی جواب تو نہیں تھا مگر بوب یقیناً غیر قانونی دھندے میں ملوث تھا۔ ہم نے ایک تفصیلی رپورٹ تصاویر کے ساتھ جنرل ضیاء کو اپنی اس رائے کے ساتھ بھجوا دی کہ بوب کو ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر پاکستان سے نکل جانے کا حکم صادر فرمایا جائے۔

چند روز کے بعد ہمیں یہ جواب موصول ہوا کہ صدر پاکستان نے دفتر خارجہ سے اس معاملے میں مشورہ کیا ہے اور ہمارے دفتر خارجہ کا خیال ہے کہ ہمیں یہ سب بھول جانا چاہئے۔ اس وقت پاکستان میں اور بھی بہت سے "بوب" ہیں اور ہم سب کو دھکے دے کر

ملک سے باہر نہیں نکل سکتے۔ اور اس وقت امریکہ کو ناراض کرنا بھی مناسب نہیں۔ اس لئے آئی ایس آئی کو چاہئے کہ بوب پر اپنا وقت ضائع نہ کرے۔

ہمارے ڈی جی' جنرل اختر عبدالرحمٰن کا اس جواب پر ردعمل قابل ستائش تھا' وہ کسی صورت بھی دفتر خارجہ کے مشورے پر آنکھیں موند لینے کے موڈ میں نہیں تھے۔ ہم نے اس صورتحال کے بارے میں کئی روز تک تبادلہ خیالات کیا' بہت سے راستے تلاش کئے' بالآخر جنرل نے کہا کہ "اس بات کو خفیہ رکھتے ہوئے کہ ہم اس سلسلے میں کارروائی کر رہے ہیں آپ جو چاہیں کیجئے مگر اس بات کا خیال رہے کہ کسی بھی کارروائی میں پکڑے جانے کا کوئی احتمال نہ ہو۔"

جنرل صاحب کے اس حکم کے بعد ہم نے ایک تفصیلی منصوبہ تیار کر کے ان کی خدمت میں پیش کیا' جس کی انہوں نے منظوری دے دی۔

یہ منصوبہ کچھ یوں تھا۔ بوب کے گھر کے پچھواڑے ایک چھوٹا سا غیر آباد زمین کا ٹکڑا تھا جس میں خودرو پودوں اور جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ اسلام آباد میں ایسے کئی پلاٹ موجود ہیں۔ ہم نے اپنے منصوبے کے مطابق اس زمین پر بوب کے گھر کی بیرونی دیوار سے ملتی ہوئی' ایک خندق کھودی اور اسے جھاڑیوں اور پودوں سے ڈھانپ دیا۔ ہم نے مقامی پولیس کو یہ "اطلاع" فراہم کی کہ ہم نے اسلام آباد کی سڑکوں پر رات کی تاریکی میں مشکوک لوگوں کو گھومتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہمیں شک ہے کہ دہشت گردوں کا کوئی گروہ کسی بڑی واردات کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ ہم نے پولیس کو یہ بھی بتایا کہ ہمیں شک ہے کہ مختلف وارداتوں میں استعمال کیا جانے والا اسلحہ بھی انہوں نے کسی جگہ چھپا رکھا ہے۔ ہم نے انہیں مشورہ دیا کہ مجسٹریٹ کی قیادت میں ایک چھاپہ مار ٹیم کو کارروائی کے لئے تیار کیا جائے۔ ہم نے وائرلیس سے مسلح آئی ایس آئی کے ایک کارکن کو پولیس کے ساتھ لگا دیا تاکہ جب ہم کہیں وہ پولیس کو متوقع جائے واردات تک لے جائے۔

اس دوران ہم بوب کی حرکات و سکنات پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ اچانک چند دنوں کے لئے پاکستان سے باہر چلا گیا اور منصوبہ روک دیا گیا۔ جب بوب واپس آیا تو کارروائی کا پروگرام اور وقت طے کر لیا گیا۔ حتمی کارروائی کے وقت نگران ٹیم کے ارکان کو منتخب جگہوں پر تعینات کر دیا گیا۔ آئی ایس آئی کے کارکنوں نے ایک بار پھر خاموشی سے بوب کے گھر کے دروازے کھولے اور گھر کے اندر موجود سارا اسلحہ لا کر پہلے سے کھودی گئی خندق میں جمع کر دیا۔ بوب اپنے معمول کے مطابق دفتر سے نکلا اور گھر کی جانب روانہ ہوا۔

ہم نے پولیس کو کارروائی کرنے کا اشارہ دے دیا۔ آئی ایس آئی کا کارکن پولیس پارٹی کو لے کر "جائے واردات" پر پہنچ گیا۔ پولیس پارٹی جب خندق تک پہنچی تو ان کی گاڑیوں کے شور نے پورے علاقے کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اسی اثناء میں بوب بھی پہنچ گیا' اور اپنی گاڑی گیراج میں کھڑی کرنے کے بعد شور سن کر باہر آگیا تاکہ یہ معلوم کر سکے کہ اس کے گھر کے عقب میں کیا معاملہ درپیش ہے؟ وہاں کا منظر اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ پولیس اس کے گھر کے پچھواڑے سے اسلحہ "برآمد" کر رہی تھی۔ ڈیوٹی مجسٹریٹ نے ہتھیاروں کی فہرست بھی بنانا شروع کر دی تھی' اپنے ہتھیار اور کیمرے دیکھ کر بوب کا رنگ فق ہو گیا اور وہ کچھ کہے بغیر خاموشی سے گھر کے اندر چلا گیا۔

اس معاملے میں امریکی سفارتخانے کا ناطقہ بند کرنے کے لئے یہی کافی تھا۔ چنانچہ اگلے دو روز میں بوب پاکستان چھوڑ کر چلا گیا۔

ہمارا اگلا شکار امریکی انٹرنیشنل سکول اسلام آباد کا ایک استاد ریگن کلیگ تھا۔ وہ نہ صرف ہتھیاروں کی تجارت کرتا تھا بلکہ اس نے گھر میں ہتھیاروں کی ایک ورکشاپ بھی بنا رکھی تھی۔ کلیگ سے نمٹنا ہمارے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ اس لئے کہ وہ سفارتکار نہیں تھا۔ ہم نے معمولی سی منصوبہ بندی سے اسے بھی قابو کر لیا اور وہ بھی پاکستان کی سرزمین سے اپنا ناپاک دھندا سمیٹ کر واپس جانے پر مجبور ہو گیا۔

لیکن ہماری پاک سرزمین کے گلی کوچوں اور دفتروں میں واقعی اتنے بوب اور کلیگ پھر رہے ہیں کہ ان سب کا قلع قمع کرنا کسی ایجنسی کے بس کی بات نہیں۔ پاکستان کی حفاظت ہر پاکستانی کا فرض ہے۔ اور یہ ضروری ہے کہ ہم پاکستان میں بیٹھے ہر بوب اور بلیک کو پہچانیں اور جہاں کہیں بھی شک ہو کسی ایجنسی کو اطلاع کر دیں تاکہ دشمن کے ایجنٹوں کا صفایا کیا جا سکے۔ ڈالر کی کھڑکھڑاہٹ سے کتنے ہی قدم لڑکھڑا جاتے ہیں اور اندر کا شیطان قوم اور ملک سے غداری پر "مجبور" سا کر دیتا ہے' لیکن کاش ہم ان موت کے سوداگروں کے ہاتھ کبھی نہ بکیں۔

○

اسلام آباد میں امریکی سفارتخانہ شعلوں کی لپیٹ میں

پاکستان پر طلوع ہونے والا ہر سورج اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی نئی اور انوکھی "خبر" لے کر وارد ہوتا ہے۔ ہماری تاریخ کے اوراق کئی ایک انہونیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اسی طرح کا ایک دن 21 نومبر 1979ء تھا۔ یہ وہ دن تھا جب صدر پاکستان غریب عوام کے ساتھ اپنے لگاؤ اور سادہ زندگی بسر کرنے کا مظاہرہ راجہ بازار راولپنڈی میں سائیکل چلا کر کرنے والے تھے۔ ۔ ا، کی جانب سے پاکستانی قوم کے لئے سادگی کا ایک عملی سبق تھا۔ اسی روز اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے کی بلند و بالا عمارت شعلوں کی نذر ہوگئی۔

خبر یہ آئی کہ ارض مقدس مکہ مکرمہ میں بعض دہشت گردوں نے خدا کے گھر پر قبضہ کر لیا ہے۔ مسلمانوں کو اپنے جذبات کا اندھا دھند اظہار کرنے کے لئے بس اتنی خبر ہی کافی تھی، حالانکہ عالمی میڈیا بار بار یہ اعلان کر رہا تھا کہ یہ بغاوت خدا کے دین یا اس کے گھر کے خلاف نہیں ہے بلکہ چند سرپھروں نے آل سعود کی ملوکیت کے خلاف نفرت کے اظہار کے طور پر یہ قبضہ کیا ہے، مگر ہم پاکستان کے مسلمان اس صورتحال کو سمجھنے کے لئے قطعی طور پر تیار نہیں تھے۔

فرط جذبات میں ہم قرآن پاک کا یہ سبق بھی بھول گئے کہ خدا اپنے گھر کی حفاظت کا خود ذمہ دار ہے۔ پاکستانی مسلمان قرآن پاک کی سورہ الفیل کو بھی بھول گئے تھے۔ اس موقع پر اس سورہ کے تناظر میں اس واقعہ کا بیان مناسب معلوم ہوتا ہے جو تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف میں یوں درج ہے۔

> یہ سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش کا سال تھا۔ ابراہہ، یمن کے بادشاہ کی فوج کا کمانڈر تھا۔ اس نے یمن کے شہر صنا میں ایک عالیشان گرجا تعمیر کروایا تھا، اس کی خواہش تھی کہ یہ گرجا نہ صرف ایک تجارتی مرکز کا درجہ حاصل کر لے بلکہ عرب کے لوگ حج کے لئے کعبہ کے بجائے اس گرجے کا رخ کریں۔ اسی مذموم خواہش کی تکمیل کے لئے اس نے خانہ کعبہ پر حملہ کرنے کا منصوبہ

بتایا۔ ابرہہ کے پاس ہاتھیوں کی ایک فوج ظفر موج تھی اور اس کے پاس پیدل فوج بھی بڑی تعداد میں موجود تھی۔ ابراہہ کی فوج اس قدر قوی تھی کہ اہل مکہ نے زندگی میں پہلی بار ہاتھی دیکھے تھے۔ ان کا خوف فطری تھا۔ ابراہہ کی فوج نے مکہ کے قریب پہنچتے ہی حضورؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب کے سو اونٹ جو قریبی چراگاہوں میں چر رہے تھے، اپنے قبضے میں لے لئے۔ حضرت عبدالمطلب ان دنوں مکہ کے سب سے بڑے سردار تھے۔ ابراہہ نے حضرت عبدالمطلب کو الٹی میٹم دیا کہ میں خانہ کعبہ کو ڈھانے آیا ہوں۔ حضورؐ کے دادا بذات خود ابراہہ سے ملنے گئے۔ گفتگو کا آغاز ہوا۔ حضرت عبدالمطلب نے ابراہہ سے کہا کہ میرے اونٹ واپس کر دیئے جائیں۔ ان کے سوال پر ابرہہ نے ایک زور دار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "میں تمہاری عبادت گاہ، تمہارے خدا کا گھر ڈھانے آیا ہوں اور تم اونٹ واپس کرنے کی بات کر رہے ہو۔" حضرت عبدالمطلب نے کہا "دیکھو! میں ان اونٹوں کا مالک ہوں اور اس حیثیت سے میں ان کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہوں۔ رہی بات خانہ کعبہ کی تو اس کا مالک خدا ہے۔ اور یہ اس کا کام ہے کہ وہ اپنے گھر کی حفاظت کرے یا اسے برباد ہونے کے لئے تمہارے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔"

ابراہہ اس جواب پر ششدر رہ گیا اور اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت عبدالمطلب کے اونٹ واپس کر دیں۔ حضرت عبدالمطلب اپنے اونٹ لے کر واپس شہر آئے اور لوگوں سے کہا کہ تم مکہ کے اردگرد پہاڑوں میں پناہ لے لو کیونکہ کچھ ہونے والا ہے۔

جونہی ابراہہ کا لشکر مکہ معظمہ کے سامنے صف آرا ہوا، آسمان پر ابابیلوں کے غول چھا گئے۔ ہر ابابیل کی چونچ میں ایک چھوٹا سا کنکر تھا۔ ابابیلوں نے یہ کنکر ابراہہ کے لشکر پر برسانے شروع کر دیئے۔ ان کنکروں نے ابراہہ کے لشکر کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا اور ابراہہ کا لشکر ہاتھیوں سمیت کھائے ہوئے چارہ کی طرح بھس بن کر رہ گیا۔

ابرلہہ اکیلا رہ گیا اور وہ اپنے بادشاہ کو اس واقعہ کی اطلاع دینے کے لئے یمن پہنچا۔ سارا واقعہ سن کر اس کے بادشاہ نے پوچھا کہ آخر وہ پرندے کیسے تھے؟ اسی اثناء میں ایک ابابیل نمودار ہوا' اس نے ایک کنکر ابرلہہ پر پھینکا اور ابرلہہ بادشاہ کی نظروں کے سامنے وہیں ڈھیر ہو گیا۔

بہرحال خانہ کعبہ پر قبضہ کرنے والوں کے بارے میں کوئی حتمی طور پر نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کے اصل مقاصد کیا ہیں۔ مگر صدر پاکستان نے سائیکل سواری کے دوران راجہ بازار کے فوارہ چوک میں عوام کے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ "خانہ کعبہ پر قبضہ سعودی عرب کے خلاف امریکی یہودی لابی کی سازش کا نتیجہ ہے۔" انہوں نے اپنی تقریر میں بعض غیر ملکی نشریات کا حوالہ بھی دیا۔ اب شاید عوام کو کسی مزید تصدیق کی ضرورت نہ تھی۔ شہریوں کا ایک سیل بیکراں "شیطان کے گھر" یعنی امریکی سفارتخانے کی جانب رواں دواں ہو گیا۔

امریکی بھی اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہیں اور ہم بھی اس معاملے کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ پاک امریکہ تعلقات کی بنیاد انتہائی نازک اور حساس ہے۔ اور ایک معمولی سی غلط فہمی بھی اس بنیاد کو ہلا سکتی ہے۔ یوں بھی امریکہ کے بارے میں عام پاکستانیوں کی رائے کبھی بھی مثبت نہیں رہی۔ خاص طور پر عالم اسلام کے بارے میں انہوں نے امریکی پالیسی کو کبھی اپنی قومی حمیت کے مطابق نہیں پایا۔ امریکہ کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ مطلب پرست' ذاتی مفاد پرست اور دنیا کو اپنی مرضی سے چلانے کی خواہش رکھنے والا ملک ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت 1965ء اور 1971ء کی پاک بھارت جنگوں میں اس کا وہ کردار ہے جس کی یاد پاکستانیوں کو آج بھی بے چین کر دیتی ہے۔

بہرحال صدر پاکستان کے راجہ بازار میں فرمائے ہوئے ارشادات جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئے اور لوگ جوق در جوق امریکی سفارتخانے کی جانب بڑھنے لگے۔ عوامی ردعمل اس قدر شدید تھا کہ اس طوفان کے آگے بند باندھنا بہت مشکل تھا۔ ہمارے لئے حیران کن بات یہ تھی کہ عوام کے اس سیلاب کی نہ تو کوئی راہنمائی کر رہا تھا اور نہ ہی کوئی انہیں ہدایات دے رہا تھا۔ نفرت اور غم و غصے کی ایک لہر تھی جو اس طوفان بلا کو اس مرکز کی جانب لے جا رہی تھی جو تمام برائیوں کی آماجگاہ' جاسوسی کا بڑا مرکز' اسلام آباد میں

امریکی سفارت خانہ تھا۔

قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی بے بس دکھائی دے رہے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ ان کی نااہلی تھی' بے بسی تھی یا اس کے پیچھے دوسرے عوامل بھی کارفرما تھے؟ بہرحال یہ بات یقینی تھی کہ معاملہ اب کنٹرول سے باہر ہو رہا تھا اور یہ صاف ظاہر تھا کہ ایک ایسی صورتحال پیدا ہو گئی ہے جس کی ہمیں بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ عوام کا ایک بے قابو ہجوم چاروں طرف سے امریکی سفارت خانے کو گھیرے میں لے چکا تھا اور سفارت خانے کی حفاظت پر مامور پولیس کا دستہ بھی بے بس دکھائی دے رہا تھا۔

اسی اثناء میں لوگوں نے یہود و ہنود کے خلاف نعرہ بازی اور عمارت پر پتھراؤ کرنا شروع کر دیا۔ ہجوم کی طاقت کے پیش نظر امریکی میرین گارڈز نے سفارت خانے کی پہلی منزل پر اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ پتھراؤ نے جب شدت اختیار کر لی تو اچانک ان امریکی محافظوں نے ہجوم پر فائر کھول دیا' جس کے نتیجے میں مظاہرین میں سے ایک نوجوان وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کی موت گویا جلتی پر تیل چھڑکنے کا سبب بنی۔ یہ ممکن تھا کہ لوگ نعرہ بازی اور پتھراؤ کے بعد گھروں کو چلے جاتے' لیکن امریکن گارڈز کی فائرنگ اور ایک نوجوان کی ہلاکت سے صورتحال قابو سے باہر ہو گئی۔ سفارت خانے کی حفاظت پر مامور پولیس کا عملہ بھی بوکھلا گیا' وہ سمجھے کہ امریکی میرین نے کنٹرول سنبھال لیا ہے اور انہوں نے وہاں سے کھسک جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ اسی دوران ہجوم میں شامل ایک لڑکے نے ایک پولیس والے سے رائفل چھین لی۔ اس نے یقیناً اپنے سکول میں سو فیصد نمبر لے کر نیشنل کیڈٹ ٹریننگ کورس پاس کیا ہو گا۔ اس نے نشانہ باندھ کر فائر کیا' گولی سیدھی جا کر سفارت خانے کی عمارت کی پہلی منزل پر بیٹھے ایک امریکی میرین گارڈ کے ماتھے میں پیوست ہو گئی۔ اس پر امریکی گارڈ فوراً اپنی پوزیشنیں چھوڑ کر عمارت کے اندر غائب ہو گئے اور ہجوم دیواریں پھلانگ کر سفارت خانے کی عمارت میں داخل ہو گیا اور اس نے احاطہ میں موجود گاڑیوں کو نذر آتش کرنا شروع کر دیا اور پھر عمارت کو بھی آگ لگا دی۔ اسی دوران سفارت خانے کا عملہ' عمارت کے اندر کسی نامعلوم جگہ روپوش ہو گیا۔

امریکی سفارت خانے میں آگ اور خون کا یہ کھیل جاری تھا کہ ہمیں سی آئی اے کے اس افسر کا فون موصول ہوا جو سرکاری طور پر آئی ایس آئی کے ساتھ منسلک تھا۔ اس نے جنرل اختر سے مدد کی درخواست کی' اس نے ہمیں بتایا کہ "سفارت خانے کا عملہ عمارت کے تہہ خانے میں پناہ لئے ہوئے ہے اور ان کی زندگیوں کو شدید خطرہ ہے۔ انہیں کسی طرح وہاں

سے نکالا جائے۔ معاملہ انتہائی تشویشناک ہے اور بہت سے امریکیوں کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔"

جنرل اختر نے مجھے حکم دیا کہ میں خود وہاں جاؤں اور فوری طور پر انہیں مکمل صورتحال سے آگاہ کروں۔ اور یہ بھی دیکھوں کہ ان امریکیوں کو تہہ خانے سے کیسے نکالا جائے۔ انہوں نے 111 بریگیڈ کے کمانڈر' بریگیڈیئر سرفراز سے بھی کہا کہ آپ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ان لوگوں کی جانیں بچانے کے لئے اقدامات کریں۔ بریگیڈیئر سرفراز سفارتخانے پہنچے اور سفارتخانے کی عمارت کا مکمل جائزہ لیا۔ کنٹین کے پاس چند امریکی جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ وہ انہیں وہاں سے نکال کر باہر لے آئے اور اطلاع دی کہ اب سفارتخانے میں کوئی امریکی نہیں ہے۔ جھاڑیوں سے برآمد ہونے والے ان امریکیوں کو بھی اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جس وقت جلوس آیا ہے وہ کنٹین میں دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔

اسی اثناء میں پولیس کی بھاری نفری بھی آ پہنچی جس نے آتے ہی آنسو گیس اور فائرنگ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جس کے نتیجے میں ہجوم میں سے سات افراد مارے گئے' باقی ہجوم تتر بتر ہو گیا اور سفارتخانے کی عمارت خالی کرا لی گئی۔

بسیار تلاش کے باوجود پولیس کو بھی عمارت میں کسی ذی روح کا نشان نہ ملا' تاہم انہیں بتایا گیا کہ بعض طلباء چند امریکیوں کو اغوا کر کے قائداعظم یونیورسٹی کے ہاسٹل میں لے گئے ہیں۔ پولیس ہاسٹل پہنچی اور بغیر کسی مزاحمت کے ان امریکیوں کو طلباء کی قید سے آزاد کروا کے لے آئی۔

بہرصورت جب میں امریکی سفارتخانے پہنچا تو آگ کے شعلے عمارت کی پہلی منزل کی طرف لپک رہے تھے۔ محض چند تماشائی وہاں موجود تھے۔ اور چند لان میں عصر کی نماز ادا کر رہے تھے' دھمیال بیس سے آرمی ایوی ایشن کے دو ایم آئی۔ 8 ہیلی کاپٹر فضا میں چکر لگا رہے تھے' انہیں بھی لاپتہ امریکیوں کی تلاش تھی۔

میں نے سفارتخانے کی عمارت کا چکر لگایا اور تہہ خانے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ امریکی سفارتخانے میں جانے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ میرے قریب کھڑے ایک شخص نے جو مجھے بے چینی کے عالم میں کچھ تلاش کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا مجھ سے پوچھا آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟ میں نے جب اس سے اس کی شناخت پوچھی تو اس نے بتایا کہ میں سفارتخانے کا ایک پاکستانی کارکن ہوں' میں نے اس سے پوچھا "تہہ خانے کا

راستہ کدھر ہے اور کیا عملے کے کچھ افراد وہیں پھنسے ہوئے ہیں؟" اس نے جواب دیا:

"ہم اپنے کام میں مصروف تھے' باہر سے شوروغل کی آوازیں آ رہیں تھیں مگر ہم نے ان نعروں کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور اپنے کام میں مشغول رہے۔ اسی اثناء میں کھانے کا وقفہ ہو گیا اور کچھ لوگ کھانے کے لئے کینٹین کی طرف چلے گئے۔ کچھ لوگ نماز کے لئے اس تہہ خانے میں چلے گئے جسے پاکستانی عملے کے لئے مسجد کے طور پر مخصوص کیا گیا ہے' کچھ کارکن اپنے کام میں مشغول رہے۔ پھر کچھ دیر بعد ہم نے فائرنگ کی آواز سنی۔ اچانک ہمارے کچھ امریکی ساتھی افراتفری کے عالم میں یہاں آئے اور کمروں میں دھوئیں کے بم پھینک کر انہوں نے کمرے مقفل کر دیئے اور خود واپس اوپر بھاگ گئے۔ پاکستانی سٹاف کو چونکہ سیکورٹی وجوہات کی بناء پر اوپر جانے کی اجازت نہیں اس لئے ہم باہر کو دوڑے اور لان میں جمع ہو گئے۔ عملے کے امریکی ارکان نے نہ تو ہمیں کوئی ہدایات دیں اور نہ ہی ہماری زندگیاں بچانے کی ذمہ داری قبول کی۔ وہ لوگ جو تہہ خانے میں نماز ادا کر رہے تھے باہر نکلنے سے معذور تھے' کیونکہ تہہ خانے کا دروازہ باہر سے مقفل کر دیا گیا تھا۔ وہ اندر ہی چیخ و پکار کرتے رہے اور دروازہ کھٹکھٹاتے رہے مگر ان کی آواز سننے والا کوئی نہ تھا۔ تہہ خانے کا روشندان بھی خاصی اونچائی پر تھا۔

انہوں نے ایک دوسرے کے کندھوں پر چڑھ کر باہر جھانکا۔ مدد کے لئے پکارا اور خوش قسمتی سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہجوم میں سے کچھ لوگوں نے جب اپنے پاکستانی بھائیوں کو اس مصیبت میں دیکھا تو انہوں نے سریوں سے روشندان کے شیشے توڑے اور بمشکل تمام ان لوگوں کو باہر نکالا جنہیں امریکیوں نے وقت اور قسمت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ ہمیں علم نہیں ہے کہ ہمیں تہہ خانے میں بند کر کے امریکی عملہ کہاں چھپ گیا ہے۔"

یہ تفصیل سنانے کے بعد اس شخص نے مجھے وہ ٹوٹا ہوا روشندان بھی دکھلایا جہاں سے یہ لوگ باہر آئے تھے۔ میں نے فوری طور پر ڈی جی کو اطلاع دی کہ تہہ خانے میں کوئی امریکی نہیں ہے۔ آپ سی آئی اے کے افسر سے کہیں کہ وہ اگر ہماری مدد چاہتا ہے تو ہمیں بتائے کہ امریکی کہاں چھپے ہوئے ہیں؟ حیرت کی بات ہے کہ اس امریکی افسر کو کچھ معلوم نہیں تھا اور نہ ہی اس کا کسی کے ساتھ کوئی رابطہ تھا۔ وہ برطانیہ کے سفارت خانے میں بیٹھا صرف قیاس آرائیاں کر رہا تھا اور "مدد مدد" پکار رہا تھا۔

میری ذاتی رائے ہے کہ امریکیوں نے اس قسم کی صورتحال سے نمٹنے کے لئے کوئی

منصوبہ بندی نہیں کی ہوئی تھی اور یہ واقعہ امریکیوں کے انتظامی اور اعصابی نظام کی ناکامی کی ایک بدترین مثال تھا۔ میں نے ڈی جی صاحب سے کہا "اب یہاں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے' آپ سی آئی اے کے افسر سے رابطہ کریں اور کہیں کہ وہ یہاں آ جائے۔ اس کی حفاظت کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔" ڈی جی صاحب نے افسر رابطہ کو یہ پیغام دے دیا اور خود بھی سفارتخانے آ گئے۔

سی آئی اے کا امریکی افسر جب آیا تو وہ خوف سے کانپ رہا تھا' ہم تینوں سفارتخانے کی حدود میں داخل ہوئے تو ہم نے عمارت کی دوسری منزل پر لوہے کا ایک دروازہ کھلتا ہوا دیکھا۔ یہاں چھپے ہوئے کچھ امریکی یکے بعد دیگرے باہر آنا شروع ہوئے۔ ہم نے لکڑی کی ایک سیڑھی دیوار کے ساتھ لگائی اور اس کے ذریعے تمام امریکیوں کو عمارت سے باہر لے آئے۔ ان کے ساتھ پاکستانی طالب علم کی گولی کا نشانہ بننے والے بدنصیب گارڈ کی لاش بھی تھی' ان امریکیوں میں چند عورتیں بھی تھیں۔

انہوں نے ہمیں بتایا کہ "عمارت پر حملہ ہوتے ہی ہم نے خود کو عمارت کی اوپر والی منزل پر واقع سٹرانگ روم میں بند کر لیا تھا اور اس کے بعد ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ باہر کیا ہوتا رہا۔ سٹرانگ روم سے باہر نکلنے کا فیصلہ ہم نے اس وقت کیا جب نچلی منزلوں کو لگی ہوئی آگ کے شعلوں کی تپش ہمارے پاؤں کے تلووں کو گرم کرنے لگی۔ پھر ہم سٹرانگ روم سے باہر آ گئے" اگر وہ اور دیر کر دیتے تو سٹرانگ روم کا لوہے کا دروازہ گرمی سے پگھل جاتا اور پھر شاید کھل ہی نہ سکتا' اور وہ چیخ پکار کرتے' مالک حقیقی سے جا ملتے۔

عملے کے ارکان کی گنتی کی گئی تو ایک امریکی کم نکلا' موقع پر موجود اے ایس پی ملک آصف حیات نے بتایا کہ جب میں کنٹین وغیرہ سے امریکیوں کا انخلاء کر رہا تھا تو میں نے ایک کمرے میں ایک امریکی کو دیکھا تھا جو میرے اصرار کے باوجود کمرے سے باہر نکلنے کو تیار نہ تھا۔ ہم اے ایس پی صاحب کے پیچھے اس کمرے کی طرف بھاگے مگر افسوس وہاں ایک اور جلی ہوئی لاش ہماری منتظر تھی۔

اس واقعہ کے نتیجے میں دو امریکی سٹیون ڈبلیو کرالے اور برائن ڈبلیو ایلس اور دو پاکستانی کارکن شرافت احمد اور نذیر حسین (جنہیں ان کے آقا کمرے میں بند کر کے بھاگ گئے تھے) اور ان کے علاوہ سات پاکستانی مظاہرین اپنی جانیں گنوا بیٹھے۔

اس سارے واقعہ کی ذمہ داری پاکستان پر کس حد تک عائد ہوتی ہے اور خود امریکی اس کے کس حد تک ذمہ دار ہیں' اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ اگر امریکی میرین گارڈ گولی

نہ چلاتا تو جانی اور مالی نقصان اس قدر نہ ہوتا۔ جلوس نعرے لگا کر اور پتھراؤ کر کے منتشر ہو جاتا' نہ آگ لگتی اور نہ ہی قیمتی جانوں کا زیاں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ کچھ گاڑیاں جلا دی جاتیں یا توڑ دی جاتیں۔

افسوس کا پہلو یہ ہے کہ جس واقعہ کی ذمہ داری واضح طور پر امریکیوں پر عائد ہوتی ہے اس کی پاداش میں پاکستان کو 540 ملین روپے (آدھے پاک کرنسی میں اور آدھے ڈالرز میں) امریکی حکومت کو ادا کرنے پڑے۔

امریکی سفارتکاروں سے آج تک کسی نے نہیں پوچھا کہ انہوں نے اپنے پاکستانی عملے کو یوں بے یار و مددگار کیوں چھوڑ دیا تھا اور ان کو کس جذبے کے تحت موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا؟ سٹرانگ روم میں بند 70 امریکی اگر وہیں آگ کے شعلوں کی نذر ہو جاتے تو اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی؟ ان پاکستانیوں کی موت کا ازالہ کون کرتا جنہیں تہہ خانے میں مقفل کر دیا گیا تھا؟ امریکی گارڈ کو یہ اجازت کس نے دی تھی کہ وہ پاکستانی مظاہرین پر فائرنگ کرے؟ امریکی سفارتخانے کے پاس اس بات کا کیا جواز تھا کہ اس قسم کی صورتحال سے نمٹنے کے لئے انہوں نے سفارتخانے کی عمارت میں کوئی ہنگامی منصوبہ بندی نہیں کر رکھی تھی۔

تاہم یہ امید کی جا سکتی ہے کہ امریکیوں نے اس واقعہ سے یقیناً کچھ سبق تو سیکھے ہوں گے۔



دشمن یا نادان دوست؟

منیر احمد خان تقریباً 20 برس تک پاکستان اٹامک انرجی کمیشن (پی- اے- ای- سی) کے چیئرمین رہے- اس ادارے کی سیکورٹی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے کچھ عرصہ بعد جنرل نقوی کے مشاہدے میں یہ بات آئی کہ منیر احمد خان کی پالیسیاں نہ تو اس ادارے کے مفاد میں ہیں اور نہ ہی کبھی تھیں- یہ شک پیدا ہو چکا تھا اس لئے اس کی پڑتال لازمی تھی- انہوں نے اپنے طور پر کھوج لگانے کی بہت کوشش کی- کیا منیر احمد امریکہ کے خفیہ دوست ہیں اور اس لئے پی اے ای سی کو پھلنے پھولنے نہیں دے رہے یا بالکل نادان ہیں اور عقل کے کورے یا جان بوجھ کر اسے نقصان پہنچا رہے ہیں؟ جنرل نقوی نے یہ کام ہمیں یہ کہہ کر سونپ دیا کہ "ذرا پتہ تو لگاؤ"_

تحقیقات سے ہمارے علم میں یہ بات آئی کہ پچاس کی دہائی میں امریکہ نے "ایٹم برائے امن" کے عنوان سے ایک پروگرام کا آغاز کیا تھا- جس کا مقصد دنیا بھر کے سائنس دانوں کو یہ ترغیب دینا تھا کہ وہ ایٹمی توانائی کو پرامن مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی راہیں تلاش کریں- حکومت پاکستان نے منیر احمد خان کو اس کورس کے لئے نارتھ کیرولینا سٹیٹ کالج' امریکہ میں سرکاری طور پر بھیجا مگر تربیت مکمل کرنے کے بعد منیر احمد خان نے وطن واپسی کا ارادہ ترک کر دیا- انہوں نے ایک غیر ملکی خاتون سے شادی کر لی اور وہیں ملازمت بھی کر لی- یوں انہوں نے حاصل کردہ علم اور تجربہ پاکستان کے لئے استعمال کرنے کی بجائے زیادہ تنخواہ اور خوشحال زندگی کو ترجیح دی- اگر ان کی جگہ کوئی اور پاکستانی ہوتا تو یقینی طور پر اپنے ذاتی مفاد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے قومی خدمت اور پاکستان کے مفاد کو ترجیح دیتا- اور کورس کے بعد واپس آ کر اپنے ملک و قوم کی خدمت کرتا-

1972ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے ایٹمی پروگرام کے آغاز کا فیصلہ کیا تو انہیں ایک تربیت یافتہ اور تجربہ کار سائنس دان کی تلاش تھی- "کسی" نے بھٹو سے منیر احمد خان کا تعارف کرایا اور بھٹو نے انہیں پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کا چیئرمین بنا دیا تاکہ پاکستان کا یہ شعبہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے- مگر منیر احمد خان کا مشن اور ارادے کچھ اور ہی تھے-

منیر احمد خان کا پہلا نشانہ ہمارا کراچی کا ایٹمی پاور پلانٹ اور ڈاکٹر عثمانی تھے۔ 1966ء میں کینیڈا کے دیئے ہوئے اس ایٹمی بجلی گھر "کانوپ" پر کام شروع کیا گیا تھا۔ عمارت وغیرہ کی تعمیر کا کام 1969ء میں مکمل ہوا۔ اور آزمائشی طور پر بجلی کی پیداوار اور فراہمی 1971ء میں شروع ہوئی۔ مگر منیر احمد خان نے ڈاکٹر عثمانی کو جنہوں نے دن رات کی محنت شاقہ سے کام مکمل کروایا تھا' نکال باہر کیا اور اس پراجیکٹ کا تمام تر کریڈٹ خود لیتے ہوئے 1972ء میں چیرمین کی حیثیت سے اس کا افتتاح کیا۔

تحقیقات کے دوران ہمیں بعض سائنس دانوں نے یہ بھی بتایا کہ منیر احمد خان نے انہیں کبھی کوئی ایٹمی توانائی یا ایٹمی پاور پلانٹ پالیسی تیار کرنے کی نہ تو اجازت دی اور نہ ہی خود ایسی کوئی پالیسی بنائی۔ 1965ء میں پاکستان کے پاس 5 میگاواٹ کا صرف ایک ریسرچ ری ایکٹر تھا مگر 1989ء تک اس میں کوئی اضافہ یا ترقی نہ ہوئی اور صرف 1989ء میں چین سے 28 میگاواٹ کا "ٹوئے ری ایکٹر" خریدا گیا۔

"کانوپ" کے سائنس دانوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ جب 1974ء میں کینیڈا نے ایٹمی ایندھن' بھاری پانی اور سپیرز وغیرہ کی سپلائی پر پابندی کا اعلان کیا تو پاکستانی سائنس دان' انجینئرز اور ٹیکنیشنز نے اس پلانٹ کو پوری حفاظت کے ساتھ اور بھرپور طریقے سے چلانا شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنے طور پر ایندھن کی تیاری اور دیگر مطلوبہ فاضل پرزہ جات بنانے کی صلاحیت بھی پیدا کر لی اور ہم کینیڈا کے دست نگر نہ رہے۔

یہ پلانٹ 95 میگاواٹ بجلی مہیا کر رہا تھا جو ہمارے سائنس دانوں اور ماہرین کی فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ہمارے سائنس دان اس پلانٹ کا ایک ڈپلیکیٹ تیار کرنے کے لئے بے چین تھے مگر منیر احمد خان نے انہیں اس بات کی اجازت نہ دی۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ ٹیکنیکل ایڈوائزری کمیٹی نے جس کے سربراہ خود وزیراعظم ہوتے ہیں پلانٹ کا ڈپلیکیٹ تیار کرنے کی منظوری بھی دے دی مگر منیر احمد خان نے اس فیصلے کو بھی سبوتاژ کر دیا۔

1974ء میں "پاک نور" کے نام سے 40 میگاواٹ کے ایک کینیڈین طرز کے کے این آر ایکس ری ایکٹر کی کاپی تیار کرنے کی تجویز پیش کی گئی مگر منیر احمد خان نے اسے بھی منزل تک نہ پہنچنے دیا۔ 1976ء میں چشمہ کے مقام پر 600 میگاواٹ کے ایک پاور پلانٹ کی منظوری دی گئی مگر یہ بھی چیرمین صاحب کی "شاندار" پالیسیوں اور منصوبہ بندی کی نذر ہو گیا۔

2 جنوری 1974ء کو ذوالفقار علی بھٹو نے ملتان میں اعلان کیا کہ پاکستان دو برس تک

ایٹمی طاقت بن جائے گا۔ ان کے منہ میں یہ الفاظ کس نے ڈالے یہ جاننا مشکل نہیں ہے۔
اس کے بعد پلاٹونیم کے حصول کی لاحاصل کوششوں اور ناکامیوں کا دور شروع ہوا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ پلاٹونیم 240 اور 242 دنیا بھر کی ایٹمی منڈی میں ایٹمی ایندھن کے لئے انتہائی نقصان دہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ مختلف مربوط ردعمل پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا پلاٹونیم کی اس قسم کے حصول کی کوئی بھی منصوبہ بندی کسی طرح بھی مفید اور بامقصد قرار نہیں پا سکتی اور اسے محض وقت' انرجی اور سرمائے کا ضیاع ہی کہا جا سکتا ہے۔ مگر موصوف نے ایک ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ خریدنے کا مشورہ بھی دیا۔ بہت سے سائنس دانوں کی ماہرانہ رائے میں پلانٹ کو قابل عمل بنانے کے لئے استعمال شدہ یورینیم کی بھاری مقدار کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ کانوپ سے جو استعمال شدہ یورینیم حاصل ہوتا ہے اس کی افادیت صفر ہے جسے محض محفوظ کر لیا جاتا ہے۔

یہ ساری "کارروائی" دراصل پاکستان کے جلد ایٹمی طاقت بن جانے کی راہ میں رکاوٹ اور پاکستان اور اس کے عوام کے خلاف بہت بڑی سازش تھی۔

ہم نے اس ضمن میں جتنے سائنس دانوں سے بات کی وہ سب کے سب اس بات پر متفق تھے کہ منیر احمد خان نے جان بوجھ کر غلط پالیسیاں بنائیں اور اپنے ساتھیوں اور ماتحتوں کے لئے تحقیقی کام کو نہ تو کبھی سراہا اور نہ ہی اسے قومی مفاد کے لئے استعمال کرنے کی اجازت دی۔ یہ منیر احمد خان کا معاندانہ رویہ ہی تھا جس کی وجہ سے بہتؔ سے قابل' لائق اور باصلاحیت نوجوان سائنس دان پاکستان چھوڑنے اور بیرون ملک ملازمتیں تلاش کرنے پر مجبور ہو گئے۔ منیر احمد خان کی "آقا پرستی" کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟

مزید تحقیقات سے یہ انکشاف بھی ہوا کہ منیر احمد خان کے امریکیوں کے ساتھ خاصے روابط تھے اور وہ اور اس کے اہل خانہ اکثر امریکی سفارتکاروں کی نجی محفلوں میں دیکھے جاتے تھے' یہاں تک کہ ایک مرتبہ جب منیر احمد خان اور ان کی اہلیہ دو ماہ کی چھٹیاں گزارنے یورپ گئے تو اپنی دو نوجوان بیٹیوں کو اپنے ہمسائے میں رہنے والے ایک امریکی سفارتکار کے پاس چھوڑ گئے جو غیر شادی شدہ تھا۔ یہ دونوں نوجوان لڑکیاں پورے دو ماہ اس امریکی سفارتکار کے ساتھ رہیں اور اس عرصے میں کوئی پاکستانی فیملی نہ تو انہیں ملنے کے لئے آئی اور نہ ہی یہ کسی سے ملنے گئیں۔

ایک مرتبہ منیر احمد خان کی سربراہی میں پاکستانی سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے ایک یورپی ملک کا دورہ کیا اور وہاں تکنیکی تعاون کے حوالے سے بہت سی کارآمد اور مفید

میٹنگیں کیں۔ واپسی پر ٹیم کے ارکان نے رپورٹ دی کہ وطن واپسی کے دوران تمام ممبروں کے سامان سے ان میٹنگوں کے نوٹس اور دیگر دستاویزات چوری کر لی گئی ہیں۔ چنانچہ مجھے اس اہم واقعہ کی تحقیقات کا فرض سونپا گیا۔ میں نے اپنی تفتیش کا آغاز منیر احمد خان سے کیا۔ میں پہلے سے طے شدہ وقت کے مطابق جب منیر احمد خان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ ایک ٹرانسسٹر ریڈیو پر گھبراہٹ کے عالم میں اپنی انگلیاں گھما رہے تھے جیسے کوئی خاص اسٹیشن تلاش کر رہے ہوں۔ میرے کرسی پر بیٹھنے تک وہ اسی کوشش میں مصروف رہے اور پھر اسے بند کئے بغیر مجھ سے ہاتھ ملانے کے لئے اٹھے۔ ریڈیو سے عجیب و غریب آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ ان کی یہ حرکت اس بات کی غماز تھی کہ انہیں کسی نے مشورہ دیا ہو گا کہ اس طرح ان کے اور میرے درمیان ہونے والی گفتگو کو میں خفیہ طور پر ریکارڈ نہ کر سکوں گا۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ ایک کھلی انکوائری ہے آپ کو اپنے بیان پر دستخط کرنا ہوں گے اور میرے پاس ایسا کوئی آلہ بھی نہیں ہے کہ گفتگو ریکارڈ ہو سکے لہٰذا بہتر ہے کہ آپ ریڈیو بند کر دیں مگر انہوں نے میری بات نہ مانی اور ریڈیو چلتا رہا۔ وہ انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں تھے اور اسی عالم میں انہوں نے یہ بیان دیا:

"میں نے جنرل نقوی کو بتا دیا ہے کہ میں کسی بیان پر دستخط نہیں کروں گا۔ ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے میں آپ کو صرف وہی بتاؤں گا جو میرے ماتحتوں نے مجھے بتایا ہے اور مجھے اس بات کا یقین بھی دلایا گیا ہے کہ آپ میرے کسی ماتحت کو تفتیش کے لئے اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے۔ آپ نے جو کچھ بھی پوچھنا ہے یہیں پوچھیں گے۔

کاغذات مجھ سے گم نہیں ہوئے دراصل میں نے تمام کاغذات اپنی ٹیم کے دو ممبران کے سپرد کر دیئے تھے، جنہوں نے مختلف مقامات پر انہیں گنوا دیا۔ میں تو واپسی پر ان کے ساتھ بھی نہیں آیا۔ ہم سب لوگ الگ الگ وطن واپس آئے ہیں۔ کانفرنس کے بعد میں کسی اور ملک میں چلا گیا تھا۔"

منیر احمد خان گھبراہٹ میں بولتے جا رہے تھے "جب ہم اس ملک میں پہنچے جہاں ہماری میٹنگ تھی تو ہم نے وہاں اپنے ناظم الامور سے کہا کہ ہمارے پاس کچھ حساس دستاویزات ہیں جنہیں ہم اپنے سفارتخانے کے لاکر میں رکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ محفوظ رہیں مگر ناظم الامور نے مجھ سے کہا کہ یہ ایک معمولی سا مشن ہے اور یوں بھی یہاں کا معاشرہ اچھا نہیں، سفارتخانے کا عملہ اکثر رات کو یہاں لڑکیاں لے آتا ہے لہٰذا ایسی حساس دستاویزات کا یہاں رکھنا خطرے سے خالی نہیں۔ بہتر ہے آپ انہیں اپنی ذاتی حفاظت میں رکھیں چنانچہ ہم یہ

دستاویزات اپنے پاس رکھنے پر مجبور تھے۔

اپنے قیام کی پہلی ہی رات جب ہم ہوٹل کے ڈائننگ روم سے کھانا کھا کر اپنے کمروں میں واپس آئے تو ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے کاغذات غائب ہیں۔ تاہم کانفرنس کا پہلا اجلاس ہم نے جیسے تیسے نبھا لیا کیونکہ ہم سب اپنے اپنے موضوع پر مہارت رکھتے تھے مگر میٹنگ کے دوران ہم نے اپنے میزبانوں سے چند نوٹس کا تبادلہ کر کے ضروری ریکارڈ نئے سرے سے مرتب کر لیا۔ واپس وطن آنے سے قبل حفاظتی اقدام کے طور پر میں نے یہ کاغذات وفد کے دونوں ارکان میں تقسیم کر دیئے تاکہ اگر دوبارہ انہیں اڑانے کی کوشش کی جائے تو ہم سارے ریکارڈ ہی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔ میں وہاں سے کسی اور ملک کے لئے روانہ ہو گیا اور ان دونوں ارکان کو علیحدہ علیحدہ پروازوں پر وطن روانہ کر دیا گیا۔

واپسی پر مجھے بتایا گیا کہ مسٹر ایکس وائی زیڈ کے کاغذات پرواز کے دوران اس کے بریف کیس سے چرا لئے گئے۔ اس نے مجھے بتایا کہ چونکہ سفر طویل تھا پرواز کے دوران اسے نیند آ گئی اور اسے علم نہیں کہ کس وقت اور کیسے اس کا بریف کیس کھول کر یہ کاغذات اڑا لئے گئے۔

دوسرے رکن مسٹر اے بی سی نے بتایا کہ اسے ہیتھرو ایئرپورٹ پر اپنی پرواز تبدیل کرنا تھی۔ ٹرانزٹ کے دوران لاؤنج میں لگے ٹیلی فون بوتھ سے لندن میں وہ کسی دوست سے بات کر رہا تھا اور اس نے اپنا بریف کیس پاس ہی رکھا ہوا تھا مگر جونہی اس نے ٹیلی فون بند کیا اسے احساس ہوا کہ اس کا بریف کیس وہاں نہیں ہے۔ اس نے چور کو پکڑنے اور بریف کیس تلاش کرنے کی پوری کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ خوش قسمتی سے اس کا ٹکٹ، پاسپورٹ اور پیسے اس کی کوٹ کی جیب میں تھے۔ وگرنہ اسے وطن پہنچنے میں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔ اور آپ تو جانتے ہیں مجھے اپنے ماتحتوں پر یقین ہے اور اس پر بھی کہ کاغذات ایسے ہی گم ہوئے ہیں۔"

وفد کے دوسرے دونوں ارکان نے بھی مجھے یہی کہانی لفظ بہ لفظ سنا دی جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اسے باہمی تبادلہ خیال کے بعد تیار کیا گیا تھا۔ بہرحال میں نے اپنی رپورٹ میں اسے کوتاہی چھپانے اور غیر ذمہ دارانہ رویے کی معراج قرار دیا۔ جو مجھے بتایا گیا وہ سب جھوٹ کے پلندے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میری دوسری رائے یہ تھی کہ ہو سکتا ہے ان اہم قومی دستاویزات کو چند سکوں کے عوض فروخت کر دیا گیا ہو۔

میں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ اگر حکام واقعی حقائق جاننے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو منیر احمد

خان اور اس کی ٹیم کو ہمارے حوالے کر دیا جائے تاکہ ہم اپنے طریقہ کار سے حقائق معلوم کر سکیں مگر شاید کسی مصلحت کی بنا پر اس تجویز کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کر لی گئی۔ صدر مملکت جنرل ضیاء الحق نے منیر خان سے کیا کہا اور کیا نہ کہا ہمیں کچھ معلوم نہیں کیونکہ ہم خوامخواہ ان قومی امور میں جن کا تعلق براہ راست ہم سے نہ ہو دخل اندازی نہیں کرتے۔ بہرحال مجھے آج بھی اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے چیئرمین کو اس کے ضمیر نے کبھی ملامت کیوں نہیں کی۔ کسی بھی دوسرے ملک میں اس جرم کی کم سے کم اور نرم ترین سزا یہ ہوتی کہ اسے فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا۔

جب ڈاکٹر قدیر خان پاکستان آئے تو منیر احمد خان نے بھرپور کوشش کی کہ وہ اس کی ماتحتی میں کام کریں۔ انہوں نے اپنے طور پر ہر طرح کی منصوبہ بندی کی کہ ڈاکٹر قدیر کا پراجیکٹ پی اے ای سی کا ایک سب سیکشن بن کر رہ جائے۔ اس سلسلے میں اس نے جنرل ضیاء سے بھی متعدد بار ملاقاتیں کیں مگر ڈاکٹر قدیر کے بارے میں جنرل ضیاء کے ذہن میں کچھ اور ہی تھا' لہٰذا ایسا اہتمام کروایا گیا کہ منیر احمد خان کو اس بات کا علم نہ ہو سکے کہ ڈاکٹر قدیر خان کیا کر رہے ہیں۔

ایک موقع ایسا بھی آیا کہ جنرل نقوی کو ایسے بہت سے شواہد مل گئے جن کی بناء پر منیر احمد خان کی اٹامک انرجی کمیشن کے چیئرمین کے عہدے سے چھٹی کرائی جا سکتی تھی۔ بہت سے سینئر سائنس دانوں کے انٹرویوز کا سلسلہ شروع ہوا جس میں پاکستان میں اس وقت کے نڑگر ٹیکنالوجی کے واحد ماہر ڈاکٹر سبطین بخاری بھی شامل تھے (جو بعد ازاں ڈیسٹو کے چیئرمین کے عہدے سے ریٹائر ہوئے) جنرل نقوی کے مطابق جنرل ضیاء نے ان شواہد کی مکمل تحقیق کے بعد کئی اعلیٰ سطحی اجلاس منعقد کئے اور ایک اجلاس میں منیر احمد خان کو ریٹائر کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا' اور اس کی جگہ ایک صاحب کو نامزد بھی کر دیا گیا۔ اس اجلاس کے خاتمے پر جب جنرل ضیاء کمرے سے باہر جا رہے تھے تو چند قدموں کے بعد جنرل کے ایم عارف نے ان کو روک لیا اور چند منٹ تک ان سے باتیں کرتے رہے۔ گفتگو ختم کر کے جنرل عارف میٹنگ روم میں واپس آئے اور ایک ایسا اعلان کیا جو میٹنگ کے شرکاء کے لئے انتہائی حیرت کا باعث تھا۔ انہوں نے فرمایا "منیر احمد خان کی ریٹائرمنٹ کا فیصلہ واپس لے لیا گیا ہے' وہ بدستور پی اے ای سی کے سربراہ رہیں گے۔"

بہرحال جہاں تک پاکستان کے ایٹمی طاقت بننے کی خواہش اور اس میدان میں ہماری پیش رفت کا سوال ہے تو اس سلسلے میں منیر احمد خان کا "دی نیشن" اخبار کے 18 ستمبر 1987ء

کے شمارے میں ایک مضمون شائع ہوا جس سے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

"ایٹمی پھیلاؤ بنیادی طور پر ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ ہتھیاروں کا حصول' خاص طور سے ایٹمی ہتھیاروں کا حصول ملک کی سلامتی اور قومی ضرورت سے منسلک ہوتا ہے۔ لیکن ایک ترقی پذیر ملک کے لئے ایٹمی اسلحہ کا حصول اس کی سلامتی اور تحفظ کا ضامن نہیں' بلکہ یہ تو خطرناک ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ دوسرا ملک آپ کے خلاف ایٹمی اسلحہ استعمال کر سکتا ہے جس سے آپ موثر طور پر اپنا دفاع نہیں کر سکتے' اس کے علاوہ اگر کوئی ترقی پذیر ملک ایٹمی طاقت بننے کی کوشش کرے تو اس کے اقتصادی وسائل اس کے متحمل نہیں ہو سکتے اور یہ قوم پر ایک ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیتا ہے' خاص طور سے جب ملک کی زیادہ آبادی زندگی کی بنیادی سہولتوں سے بھی محروم ہو۔ ترقی پذیر ممالک کی ایٹمی طاقت بننے کی خواہش صرف سیاسی ہے یا ایٹمی قوتوں کی پالیسی کا ردعمل جیسا کہ این پی ٹی معاہدے میں کہا گیا ہے۔ تاہم پاکستان کو کسی طور ایٹمی قوت نہیں بننا چاہئے۔"

قارئین آپ نے صفحہ 60 پر بھی ایک امریکی ٹیلیگرام کے حوالے سے یہ پڑھا ہے کہ امریکی فرانسیسی سفارت خانہ کے فرسٹ سیکرٹری فورلوٹ سے جاننا چاہتے تھے کہ اس کے منیراحمد خان سے کیسے روابط ہیں؟ مگر فورلوٹ نے اس کا جواب نہ دیا۔ امریکی شاید اس بات سے ڈر رہے تھے کہ کہیں فرانسیسیوں نے منیراحمد خان کو اپنے ساتھ تو نہیں ملا لیا اور کہیں وہ امریکہ کے ہاتھ سے نکل تو نہیں جائے گا۔

میرے نزدیک اس اہم معاملہ کی تفصیلی تفتیش کی جانی چاہئے۔ صرف اسی طریقے سے ہمیں یہ پتہ چل سکتا ہے کہ آیا منیراحمد خان کا موقف درست تھا' وہ محب وطن تھے یا نااہل' غیرذمہ دار' یا دشمن کے ایجنٹ؟ کیا پاکستان اٹامک انرجی کمیشن نے ان کی سربراہی مین ترقی کی یا تنزلی کا شکار ہوا؟ کوئی ہے جو اب اس سارے معاملے کی چھان بین کرے؟ تاہم میں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کی بنیاد اس تفتیش اور بات چیت سے سامنے آنے والے وہ حقائق ہیں جن میں سے چند میں نے یہاں بیان کر دیئے ہیں۔



دشت کویر کے جنات

"اور یہودیوں نے مکاری کی اور خدا نے اس کے دفعیہ کی تدبیر کی۔
اور خدا سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔"

(القرآن 3 : 53)

علامہ اقبال نے اپنے ساقی نامے میں ممولے کو شہباز سے لڑانے کی بات اپنے لاشعور میں چھپی ایک ایسی خواہش کے اظہار کے طور پر کی تھی جس کے پورے ہونے کا انتظار وہ اپنی زندگی کے آخری سانس تک کرتے رہے' مگر ان کا اس خواہش کی تکمیل کا باب ایرانی قوم نے ایک ایسے اسلامی انقلاب کی صورت میں رقم کیا' جس کی کامیابی پر آج بھی امریکہ اور اس کے مغربی اتحادی تلملا رہے ہیں۔ اس انقلاب کی صورت میں امریکہ کو اپنے عالمی منصوبوں اور قوموں پر حکومت کے ارادوں کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی اور اس کا اقوام عالم پر قبضے کا خواب ادھورا رہ گیا۔ حد تو یہ ہے کہ ایران سے رضا شاہ پہلوی کے فرار کے باوجود امریکی منصوبہ سازوں نے اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں بہت دیر کر دی کہ ان کا منصوبہ اسلامی انقلاب کی آندھی میں خس و خاشاک کی طرح بکھر چکا ہے۔ یہ ایک طرح سے امریکہ کی کھلی شکست تھی' مگر سپرپاور کے لئے اس شکست کو تسلیم کرنا اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شاہ کا ایران' امریکہ کا ایک مضبوط BASE تھا اور اس BASE کو قائم کرنے میں امریکہ نے سخت منصوبہ بندی کی تھی۔ اور ایران ہی کے راستے سارے مشرق وسطیٰ کے تیل کے خزانوں پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھے تھے۔ امریکی انتظامیہ کسی صورت بھی اس ناکامی کو قبول کرنے پر تیار نہ تھی' بلکہ اس کے برعکس ابھی تک ایسی پالیسیوں پر گامزن تھی کہ اسے دنیا کا واحد مالک و مختار تسلیم کر لیا جائے۔ چنانچہ صورت حال سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے امریکہ نے اپنے رویے میں کوئی لچک پیدا نہ کی اور اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لئے ایسا لائحہ عمل اختیار کیا جس کی وجہ سے مسلم دنیا آگ اور خون کے طوفان میں گھر گئی۔ امریکی منصوبہ ساز اسلامی انقلاب کو شکست تو نہ دے سکے مگر انہوں نے مسلمانوں کی افرادی قوت اور دولت کو بہت نقصان پہنچایا اور یہ سلسلہ ابھی تک

جاری ہے۔

اسلامی جمہوریہ ایران کو تسلیم کرنے والا پہلا ملک پاکستان تھا۔ ایران میں موجود ہمارے سفارتکاروں نے ہمیں بتایا کہ ہمارے سفیر نے تہران کی صورت حال کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد صدر جنرل ضیاء الحق سے فون پر طویل گفتگو کی' صدر نے یہ تجزیہ سننے کے بعد اعلان کیا کہ پاکستان امام خمینی کی حکومت کو تسلیم کرتا ہے۔

امریکیوں کو یہ بات بالکل پسند نہ آئی اور امریکی سفارتکار انہیں مجبور کرتے رہے کہ پاکستان اپنا فیصلہ واپس لے کیونکہ اسلامی انقلاب کا رخ بہت جلد موڑ دیا جائے گا اور امریکہ اپنے "لے پالک" شاہ کو ایک بار پھر ایرانی تخت پر بٹھا دے گا۔ امریکہ کی یہ سوچ کس قدر غیر منطقی تھی اس کا اندازہ بعد کے واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ بات آج بھی سیاسی پنڈتوں کے لئے حیرت کا باعث ہے کہ ایران پر اپنے مکمل کنٹرول اور ہر شعبے میں دسترس کے باوجود امریکہ کو اسلامی انقلاب کی حرارت محسوس نہ ہوئی۔ اس صورت حال پر ایک امریکی دانشور ڈاکٹر چارلس ڈبلیو لاری نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا:

"ہمیں بہت جلد اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اب ایران ایک شیعہ اسلامی مملکت ہے' مگر بدقسمتی سے ہم میں سے کسی کو بھی اس حقیقت کا بروقت ادراک نہ ہو سکا کہ ایران کے شیعہ سٹیٹ ہو جانے کی کیا اہمیت ہے اور ہم رضا شاہ پہلوی کی اقتدار سے محرومی اور خمینی کے انقلاب کی حقیقت کو بروقت سمجھ ہی نہ سکے' مجھے ابھی تک امریکی سفارت کاروں اور اعلیٰ عہدیداروں کی اس خوفناک لاعلمی پر تعجب ہے' دراصل ہم تخت طاؤس کے سحر اور رومانس میں گرفتار رہے اور دیہاتوں اور ایران کے دور افتادہ میدانوں میں بسنے والے "دور قدیم" کے انسانوں کو بھول گئے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ رضا شاہ کی اقتدار سے محرومی سے ایک روز پہلے امریکی صدر کارٹر سعد آباد کے محل میں شاہ کا جام صحت نوش کر رہے تھے' جبکہ اگلی صبح کا سورج شاہ کے اقتدار کے خاتمے کی نوید لے کر آ رہا تھا۔ مجھے اکثر اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے سفارت کار کہاں خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے اور ہمارا سفارتخانہ وہاں کر کیا رہا تھا۔"

دی پائلٹ
نارتھ کیرولینا' یو ایس اے
فروری 1990

امریکیوں کی لاعلمی اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ڈاکٹر لاری جیسے عالمی سطح کے دانشور

امریکی سفارتکاروں کی اس تاریخی ناکامی اور ایران کے عوام کے بارے میں محدود معلومات کا تذکرہ کرتے ہوئے آج بھی اس عظیم الشان انقلاب کو "خمینی انقلاب" قرار دیتے ہیں اور اسے ابھی تک اسلامی انقلاب ماننے کے لئے تیار نہیں' اس نوع کے اور بہت سے ایسے واقعات ہیں جن سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ امریکہ اپنی طاقت کے نشے میں مست ہاتھی بنا رہا اور اسے ایران کے بارے میں بہت سے حقائق کا ادراک ہی نہ ہو سکا۔ تہران میں سی آئی اے کا سب سے بڑا ہیڈ کوارٹر اور اس کی دنیا کی بدنام ترین خفیہ ایجنسی' سواک' بھی اس معاملے میں ناکام رہی۔

انقلاب کی کامیابی کے بعد بھی امریکہ نے رضا شاہ کی حمایت جاری رکھی اور انقلاب اسلامی کو شکست دینے کے لئے مختلف تدابیر کرتا رہا۔ امریکہ کے اس رویے کے خلاف ایرانیوں کی نفرت بڑھتی گئی اور وہ امریکہ اور دوسری طاغوتی قوتوں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار جلوسوں کی صورت میں کرتے رہے۔

4 نومبر 1979ء کو ایرانی طلباء نے امریکہ کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا اور انہوں نے تہران میں امریکی سفارتخانے پر قبضہ کر کے عملے کے 53 ارکان کو یرغمال بنا لیا' کیونکہ "لانہ جاسوسی" اور "شیطان بزرگ" سے پیچھا چھڑوانے کا ایک یہی راستہ رہ گیا تھا۔ یہ واقعہ امریکیوں کے لئے ایک اور ذلت آمیز جھٹکا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنی ناکامیوں اور غلطیوں کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ سفارتخانے پر قبضے کے باوجود امریکہ اسلامی جمہوریہ ایران کے مطالبات کا نوٹس تک لینے کے لئے تیار نہ تھا اور ابھی تک اپنے سپرپاور ہونے کے زعم میں مبتلا تھا۔ امریکہ نے یرغمالیوں کی رہائی کے لئے ایران کی ایک بھی تجویز قابل غور اور قابل قبول نہ سمجھی اور انہیں طاقت کے بل بوتے پر چھڑوانے کے منصوبے بناتا رہا۔

امریکہ نے ایک خصوصی مشن کا منصوبہ بھی تیار کیا۔ کمانڈو سٹائل کے اس منصوبے میں مصر کے ایک امریکی اڈے سے پرواز کرنے والے چھ سی 130 جہازوں' ایک امریکی بحری جہاز سے اڑنے والے آٹھ جدید ترین ہیلی کاپٹروں اور 90 تربیت یافتہ کمانڈوز نے حصہ لینا تھا۔ انہیں ایران کے اندر پہلے سے خفیہ طریقے سے بھیجے ہوئے امریکی ایجنٹوں اور شاہ کے حامی چند ایرانیوں کی امداد بھی حاصل ہونا تھی۔ یہ ایک ایسا مشن تھا جسے انتہائی پیچیدہ قرار دیا جا سکتا ہے اور جس کی تکمیل کے لئے زبردست قسم کی پیشہ وارانہ صلاحیت اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔

24 اپریل 1980 کو اس مشن کا آغاز ہوا۔ جیسے ہی امریکی جہاز اور ہیلی کاپٹر اڑے' چند

ہی لمحے بعد دو ہیلی کاپٹروں میں فنی خرابی پیدا ہو گئی اور وہ اپنی "امل" طیارہ بردار سمندری جہاز نمر کے تختے پر واپس اتر گئے۔ باقی کے چھ ہیلی کاپٹر اور چھ سی 130 جہاز، منصوبے کے مطابق تہران کے جنوب مشرق میں 200 میل کے فاصلے پر واقع دشت کویر میں طبس کے مقام پر اترے۔ وہاں ایک ہیلی کاپٹر کے ہائیڈرالک نظام میں خرابی پیدا ہو گئی، چنانچہ کمانڈوز کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور انہوں نے مشن ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ ایرانی انقلاب کی تاریخ کا ایک حیرت انگیز باب ہے کہ مشن کے التوا کے بعد امریکی پائلٹوں کو واپس جانے سے پہلے دشت کویر میں شاید جنات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہوا یوں کہ اسلامی انقلاب کی سرزمین سے افراتفری اور بے چینی کے عالم میں واپسی کے لمحوں میں ایک ہیلی کاپٹر کے پائیلٹ نے اپنی یہ دیوہیکل مشین اپنے ساتھ پرواز کرنے والے ایک سی 130 جہاز سے ٹکرا دی۔ نتیجتاً صحرا میں کمانڈوز کی 9 لاشیں گر گئیں، جبکہ 5 کمانڈوز شدید زخمی ہو گئے۔ اس واقعہ نے انہیں مزید حواس باختہ کر دیا اور انہیں یہ یقین ہو گیا کہ وہاں واقعی کوئی غیر مرئی طاقت موجود ہے اور پورا امریکی بیڑا اس طاقت کی زد میں ہے۔ ان کے خوف کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے اپنے پانچ ہیلی کاپٹرز، ایک سی 130 جہاز، اور اپنے ساتھیوں کی لاشیں صحرا ہی میں چھوڑ دیں اور باقی ماندہ کمانڈوز سی 130 جہازوں کے ذریعے بھاگ نکلے۔ ان کا خیال شاید یہ تھا کہ ویت نام کی طرح وہ اپنے مردہ ساتھیوں کی ہڈیاں لینے واپس آئیں گے، اس آپریشن کو عالمی پریس میں زبردست پبلسٹی ملی اور دنیا بھر میں قارئین کے لئے یہ آپریشن اور اس کی ناکامی حیرت کا باعث بنی۔

اس ناکام آپریشن کی چند اہم تفصیلات جو امریکہ نے عالمی پریس کو خود فراہم کیں:

1- امریکی سفارتخانے پر امریکی طلبہ کے قبضے کے بعد متعدد امریکی پیرا ملٹری ایجنٹوں کو یورپی تاجروں کی بھیس میں جعلی پاسپورٹوں پر تہران میں داخل کیا گیا تاکہ وہ امریکی یرغمالیوں کو رہائی دلانے کے منصوبے میں اپنا مجوزہ کردار ادا کر سکیں۔ ان ایجنٹوں کا تہران میں انقلاب دشمن ایرانیوں سے بھی خفیہ رابطہ تھا اور ان کی مکمل امداد بھی حاصل تھی۔ ان ایجنٹوں نے تہران میں ایک خالی گودام خریدا جسے امریکی سفارتخانے پر آخری حملے کے لئے BASE کے طور پر استعمال کیا جانا تھا۔ امریکیوں نے ایران کی وزارت خارجہ کی عمارت سے تین یرغمالیوں کو بھی رہا کروانا تھا جبکہ 50 یرغمالی امریکہ کے سفارتخانہ کی عمارت میں اسلامی انقلاب کے حامی طلبہ کی حراست میں تھے۔

-2 منصوبے کے مطابق' امریکی ہیلی کاپٹروں اور کمانڈوز نے' دشت کویر سے 25 اپریل کی صبح کو تہران کے قریب دماوند کے پہاڑی علاقے میں اترنا تھا۔ وہاں سے ان کمانڈوز کو خفیہ ایجنٹوں نے ٹرکوں کے ذریعے' جن کے ڈرائیور بھی امریکی سی آئی اے کے ایجنٹ تھے' تہران پہنچانا تھا۔

-3 ان کمانڈوز کی پہلی منزل تہران میں خریدا ہوا گودام تھا جہاں آخری ہدایات دی جانی تھیں۔ پھر پروگرام کے مطابق امریکی سفارتخانے پر حملے کے بعد ایرانی طلبہ پر قابو پانا' یرغمالیوں کو سفارتخانے کے احاطے میں جمع کرنا اور دماوند میں موجود امریکی ہیلی کاپٹروں کو اذن پرواز دینا تھا۔ یہ بھی طے پا چکا تھا کہ اگر امریکی ہیلی کاپٹر سفارتخانے کے احاطے میں نہ اتر سکے تو پھر سفارتخانے کی عمارت سے چند سو گز کے فاصلے پر واقع سٹیڈیم میں اتر جائیں گے' وہاں سے ان یرغمالیوں کو دشت کویر کے قریب ٹھکانے پر لے جایا جائے گا جہاں سی 130 جہاز انہیں ایران کی فضاؤں سے دور لے جانے کے لئے تیار کھڑے ہوں گے۔

مگر شاید ڈالر کے نوٹ پہ IN GOD WE TRUST کا ایمان افروز نعرہ درج کرنے والے امریکی منصوبہ سازوں کو خدائی منصوبہ بندی کا کوئی ادراک نہیں۔

یوں تو دیکھنے میں یہ سارا منصوبہ ہالی وڈ کی کسی جاسوسی فلم کا خوبصورت پلاٹ تو ہو سکتا تھا مگر ان دنوں تہران کی فضاء اس کی خوبصورتی کو سلولائیڈ پر منتقل کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ کچھ لوگ آج بھی اس آپریشن کی ناکامی کو غیر مرئی اور ماورائی قوتوں کی کارروائی قرار دیتے ہیں' مگر صورت حال اس کے برعکس ہے۔ اگر یہ کمانڈوز اپنے منصوبے کے مطابق اپنے ہیلی کاپٹر امریکی سفارتخانے یا اس کے قریبی سٹیڈیم میں اتارنے میں کامیاب ہو بھی جاتے تو بھی مجھے یقین ہے کہ بپھرے ہوئے لاکھوں ایرانی ان سب کی یرغمالیوں سمیت تکہ بوٹی کر دیتے اور اس صورت میں جانی نقصان صرف 9 امریکیوں تک محدود نہ رہتا۔ اس "جنگ" میں امریکی کتنے ایرانیوں کو مار سکتے تھے' سو' دو سو یا اس سے بھی زیادہ مگر وہاں سے ایک بھی امریکی زندہ بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔ اس بات میں بھی اب کوئی ابہام نہیں کہ اس آپریشن کی منصوبہ بندی کرنے والے "ماہرین" کو نہ تو تہران کے جغرافیائی حدود اربعہ سے واقفیت تھی اور نہ ہی اس موقع پر انہیں تہران کے عوام کے جذبات کی شدت' امریکیوں سے ان کی نفرت اور جذبہ جہاد کا اندازہ تھا۔ چنانچہ انہیں اپنی اس طالع آزمائی کا بہت بھاری خمیازہ ادا کرنا پڑا۔ وہ زیادہ جانی نقصان سے تو بچ گئے لیکن ان کی ذلت و رسوائی بہت ہوئی۔

اگلے روز ایرانی ٹی وی پر دشت کویر میں بکھرے ہوئے امریکی ہیلی کاپٹروں اور سی 130 جہاز کے ٹکڑوں اور امریکی کمانڈوز کی لاشوں کی فلم رپورٹ دکھائی گئی۔ ایرانیوں نے ان ہیلی کاپٹروں اور جہاز کو آگ لگا دی جو امریکی کمانڈوز اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے تاکہ امریکی کمانڈوز واپس آ کر انہیں دوبارہ استعمال نہ کر پائیں۔ 9 امریکی کمانڈوز کی لاشیں تہران لائی گئیں اور ٹی وی پر دنیا کو دکھائی گئیں۔ اس موقعہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے آیت اللہ خلخالی نے کہا کہ "ہم یہ لاشیں اس لئے دنیا کو دکھا رہے ہیں کہ دنیا کو کارٹر حکومت کی شیطانیت اور مذموم حرکات سے آگاہ کیا جا سکے اور ان کے نتائج دکھائے جا سکیں۔ اسلامی دنیا کے خلاف یہ امریکی جرائم کے ثبوت کی منہ بولتی دستاویزات ہیں۔"

صدر کارٹر نے اپنی خفت مٹانے کے لئے ان لاشوں کو ٹی وی پر دکھانے کو انسانیت کی توہین اور انتہائی بربریت سے تعبیر کیا۔ کارٹر چاہتا تھا کہ امریکہ کے جرم کا مسخ شدہ چہرہ دنیا کو دکھا کر اسے مزید ذلیل نہ کیا جائے' بہر طور یہ لاشیں عالمی ریڈ کراس کی وساطت سے امریکہ واپس بھیج دی گئیں۔ اس کے بعد امریکہ کو جرات نہ ہوئی کہ پھر خود ایران کے خلاف کوئی کارروائی کرتا۔

اس سلسلے میں جو بات ابھی تک ایک معمہ بنی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ امریکہ نے اعلان کیا کہ اس کے آٹھ آدمی مارے گئے اور انہوں نے آٹھ آدمیوں کے ناموں کا اعلان بھی کیا' لیکن تہران سے وہ 9 تابوت لے کر گئے۔ وہ نویں لاش کس کی تھی' اس کا جواب نہ تو ایران ہی دیتا ہے اور نہ ہی امریکہ۔

اس واقعہ پر عالمی دارالحکومتوں سے طرح طرح کے ردعمل کا اظہار کیا گیا مگر پاکستان نے اس بار پھر ایران کی سالمیت اور خودمختاری کے لئے ایرانی قوم کی جدوجہد کی بھرپور حمایت کا اعادہ کیا۔ پاکستان نے پرزور الفاظ میں اس ایکشن کی مذمت کی اور اعلان کیا کہ اس موقع پر پاکستان ایران کے ساتھ ہے۔

اس سارے جھنجھٹ میں ہم کیوں پڑے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ آئی ایس آئی کو اس آپریشن کی تفصیلات کا علم نیوز ویک اور ٹائمز میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ سے ہوا جس میں بتایا گیا تھا کہ سی آئی اے کے ایک ایجنٹ نے تہران میں امریکی سفارتخانے میں امریکی یرغمالیوں اور سفارتخانے میں موجود ایرانی طلبہ کے بارے میں تمام اہم معلومات امریکی سفارت خانے کے ایک پاکستانی باورچی سے حاصل کی تھیں اور اسی اطلاع کی روشنی میں یہ منصوبہ تیار کیا گیا۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ اس پاکستانی باورچی سے امریکی ایجنٹ کی ملاقات

ایک ہوائی سفر کے دوران ہوئی تھی جب یہ دونوں اتفاقاً" ساتھ ساتھ والی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ امریکہ کی، پاکستان اور ایران کے تعلقات میں رخنہ ڈالنے کی یہ ایک بچگانہ اور بھونڈی کوشش تھی۔ امریکہ اس منصوبے میں پاکستان کو کیوں گھسیٹنا چاہتا تھا اسے سمجھنا مشکل نہیں ہے، لیکن ہمارے لئے حقیقت کو جاننا ضروری تھا۔

جب یہ رپورٹ شائع ہوئی تو راقم الحروف تہران میں پاکستانی سفارتخانے میں ڈیفنس اتاشی تھا۔ میں نے فوری طور پر اس باورچی کی تلاش شروع کر دی۔ سفارتخانے کے پرانے ملازمین اور ریکارڈ سے مجھے چند اہم معلومات حاصل ہوئیں جن کی روشنی میں، میں اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ ان دنوں جرمن سفارتخانے میں ملازم تھا۔ اسے پیغام بھجوا دیا گیا اور اگلے ہی روز وہ میرے پاس آ گیا۔

اس کا بیان انتہائی سادہ اور صاف تھا۔ اس نے بتایا :

"انقلابی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی ہمیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ ایرانی عوام میں امریکیوں کے خلاف نفرت کا جو لاوا پک رہا ہے، امریکی اہل کار اس کی زد میں ضرور آئیں گے۔ امریکہ نے بہت سے سفارتکار اور ان کے اہل و عیال واپس بھجوا دیئے تھے، کچھ برطانیہ اور کینیڈا کی وساطت سے بھاگ گئے تھے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ باقی مغربی ممالک کی طرح امریکہ بھی اپنا سفارتخانہ خالی کر دیتا، لیکن امریکہ نے چونکہ اسلامی انقلاب کو شکست دینے اور شاہ کو واپس لانے کا تہیہ کیا ہوا تھا، اس لئے عملے کے چند لوگ باقی رہ گئے جنہوں نے ایران کے اسلامی انقلاب کے خلاف خفیہ جنگ شروع کر دی اور دشت کویر والا منصوبہ بھی اسی کا ایک حصہ تھا۔ بہرحال جناب! اس واقعہ سے پہلے تین بھاری جلوس امریکی سفارتخانے کی جانب پیش قدمی کر چکے تھے۔ جس روز امریکی سفارتخانے پر قبضہ ہوا، میں معمول کی خریداری کے لئے بازار گیا ہوا تھا۔ میری واپسی تک پورا سفارتخانہ ایرانی طلبہ کے کنٹرول میں آ چکا تھا اور مین گیٹ پر بھی ایرانی گارڈ کھڑے تھے، انہوں نے مجھے اندر جانے کی اجازت نہ دی اور مجھے پاکستان سفارتخانے کو رپورٹ کرنے کو کہا، میں بے سروسامان سیدھا پاکستان ایمبیسی آ گیا، وہاں میرے لئے عارضی سفری دستاویزات تیار کروائی گئیں اور میں پاکستان واپس آ گیا۔

میں نے اپنی تنخواہ اور دیگر مراعات کے حصول کے لئے اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے کے کئی چکر لگائے اور بمشکل تمام کچھ رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ مگر کسی نے بھی مجھ سے یرغمالیوں کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ یوں بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ

میں اس سارے واقعہ سے لاعلم تھا اور میری گواہی کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی تھی۔

سر میرا ایک اور پاکستانی ساتھی بھی وہاں باورچی تھا جو قبضے کے وقت سفارت خانے میں موجود تھا' سر! میں اسے کل آپ کے پاس لے کر آؤں گا۔"

دوسرے روز دوسرے باورچی نے جو کہانی سنائی وہ کچھ یوں تھی:

"جس وقت سفارت خانے پر قبضہ ہوا میں ناشتہ تیار کر رہا تھا۔ معمول کے مطابق ایک جلوس فلک شگاف نعرے لگاتا ہوا سفارت خانے تک آیا' مگر آج اس کے تیور کچھ بدلے بدلے سے تھے۔ ہجوم نے مین گیٹ کو توڑا اور بہت سے لوگ دیواریں پھاند کر بھی عمارت کے اندر آگئے' ان میں سے کچھ کے پاس آتشیں اسلحہ بھی تھا' چند مسلح افراد باورچی خانے میں بھی گھس آئے' جہاں میں اپنے ایک بنگالی ساتھی کے ساتھ معمول کے کام میں مصروف تھا۔ انہوں نے ہم سے ہماری شناخت پوچھی اور ہمیں اپنا کام جاری رکھنے کا حکم دیا۔

اس روز سے ہمارے معمولات میں تبدیلی آگئی۔ ایک مسلح شخص ہر وقت ہمارے سروں پر موجود رہتا' ہمیں عمارت سے باہر جانے یا کسی سے بھی ملنے کی اجازت نہ تھی اور ہماری آمدورفت ہمارے کوارٹر اور باورچی خانے تک محدود تھی' یہ انقلابی گارڈز راشن بھی خود ہی لا کر ہمیں کھانا تیار کرنے کے لئے دیتے تھے۔ گارڈز بھی یہیں کھانا کھاتے اور یرغمالیوں کے لئے بھی لے جاتے۔ ہمیں یرغمالیوں کی تعداد اور حالات کا بھی کچھ علم نہیں تھا۔ باہر کی دنیا سے ہمارے رابطے اور اردگرد کی خبریں جاننے کا ہمارے پاس واحد ذریعہ ایک ریڈیو سیٹ تھا۔

ایک روز ہم نے سنا کہ امریکہ نے ایران پر حملہ کر دیا ہے' مگر شکست کھا کر بھاگ گیا ہے۔ دوسرے ہی روز سفارت خانے میں 9 امریکیوں کی لاشیں لائی گئیں اور بتایا گیا کہ یہ وہ امریکی ہیں جو ایران پر حملہ کرنے آئے تھے۔

اس واقعہ کے بعد نگرانی اور پہرہ انتہائی سخت کر دیا گیا' اس روز سے کھانے کی مقدار بھی بتدریج کم ہونے لگی' ہر روز ہمیں بتایا جاتا تھا کہ ہم نے کتنے آدمیوں کا کھانا تیار کرنا ہے' ایرانی طلباء امریکی یرغمالیوں کو دوسری جگہوں پر منتقل کر رہے تھے۔ پھر کچھ روز بعد ہم سے کہا گیا کہ ہم اپنے اپنے سفارت خانے چلے جائیں' کیونکہ اب اس عمارت میں کوئی امریکی باقی نہیں رہا تھا' چنانچہ میں پاکستانی سفارت خانے چلا گیا' سفری دستاویزات تیار کرائیں اور پاکستان روانہ ہو گیا۔"

اس بیان سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ نیوز ویک اور ٹائمز کی رپورٹ میں کوئی صداقت نہ

تھی اور یہ محض اپنے ایک ناکام مشن میں پاکستان کو ملوث کرنے کی ایک ناکام کوشش تھی اور مخصوص امریکی ذہنیت کی ترجمان بھی۔ میں نے جب یہ قصہ ایرانی چیف آف J-2 کو سنایا (جو ایران کا آئی ایس آئی ہے) تو انہوں نے صرف یہی کہنے پر اکتفا کیا:

"ہم جانتے ہیں' شیطان عظیم امریکہ سب سے بڑا جھوٹا ہے۔"



جاگتے رہنا بھائیو!!

گزرے زمانے کا ذکر ہے کہ راتوں کو چوکیدار گلی محلوں میں پھرتے اور آواز لگاتے "جاگتے رہنا بھائیو" ۔ اس سے شاید ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ بے ہوشی کی نیند نہیں سونا چاہیے اور کہیں سے کوئی غیر معمولی آواز آئے' تو گھروالوں کو اٹھ کر دیکھنا چاہئے کہ کہیں کوئی چور یا ڈاکو تو نہیں آگیا۔ اسی طرح اپنے دشمن اور حریف سے بھی ہر وقت چوکنا اور ہوشیار رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہوشیاری اور دانائی امور سلطنت پر نظر رکھنے کے لئے بھی ضروری ہے۔ جہاں کہیں کوئی خدشے یا شک کی بات ہو دانشوروں' سوچنے اور لکھنے والوں کا فرض ہے کہ قوم کو فوراً ہوشیار کر دیں۔

ایران میں اسلامی انقلاب کے ہاتھوں شکست اور افغانستان سے روسی فوجوں کے انخلاء کے بعد وہاں اپنی پسند کی حکومت قائم کرنے میں امریکہ کی ناکامی کے بعد پاکستان' امریکہ کا خاص ہدف بن گیا ہے۔ امریکہ پاکستان سے کیا کام لینا چاہتا ہے اور پاکستان کو اپنے مفادات کے لئے کیسے استعمال کرنا چاہتا ہے' اس منصوبے کے خدوخال آہستہ آہستہ سامنے آ رہے ہیں۔

فی الحال جو کچھ سامنے آیا ہے' اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ چاہتا ہے کہ پاکستان کمزور رہے' زخمی رہے' اس کا خون رستا رہے اور یہ سسکتا رہے تاکہ پاکستان کی کمزوریوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکے۔

اس لئے امریکہ کے معاملے میں ہمیں بھی "جاگتے رہنے" کی ضرورت ہے۔ ماضی میں اس کی "دوستی" کی چند مثالیں تو اس سے پہلے ناظرین کی نذر کی جا چکی ہیں۔ حال کے چند واقعات پر بھی نظر ڈال لیجئے۔

رابرٹ اوکلے اگست 1988ء سے اگست 1991ء تک پاکستان میں امریکی سفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتا رہا۔ پاکستان سے متعلق متعدد معاملات کے بارے میں اس کا رویہ برطانوی راج کے کسی وائسرائے سے کم نہ تھا۔ اپنے دور سفارت میں اس کا کردار و گفتار مکمل طور پر وائٹ ہاؤس کی ان پالیسیوں کا عکاس تھا جن کے مطابق امریکہ ہمیشہ ہمیں قومی

اور عالمی امور کے بارے میں اپنے نظریات اور موقف کی تائید پر مجبور کرتا رہا ہے۔ اپنی مدت سفارت پوری کرنے کے بعد امریکہ روانگی سے قبل اس نے لاہور میں ایک منتخب اجتماع میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ عالمی سفارتی آداب کی دھجیاں اڑانے کے مترادف تھا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس کے اس غیر سفارتی رویے پر حکومتی اور نجی سطح پر کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہ کیا گیا۔ دوسرے امریکی سفراء اور دانشور پاکستان کے لئے کیا ایجنڈا تیار کئے ہوئے ہیں' ان کے بارے میں راقم نے چند مضامین لکھے' جن سے اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

اوکلے کی چابک دستیاں

رابرٹ اوکلے نے پاکستان میں امریکی سفیر کی حیثیت سے اپنے 3 سالہ دور سفارت میں جس انداز میں پاکستان کے عوام اور حکومت پاکستان کو اپنے "مفید مشوروں" سے نوازا' ان سے اس کی لومڑی جیسی چالاکی' بھیڑیئے جیسی خونخواری اور کوے جیسی دانائی صاف عیاں تھی۔

10 اگست' 1990ء کو لاہور میں پاک امریکہ تعلقات پر پریس انسٹیٹیوٹ آف پاکستان کے زیر اہتمام ایک خصوصی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے اس نے پاکستان کا "چالان" کر دیا کیونکہ اس نے امریکہ کی نصب کی ہوئی "سرخ بتی" کراس کی تھی۔ اس نے پاکستان کی سیاسی قیادت کو بے ایمان قرار دیتے ہوئے کہا کہ پاکستانی قائدین ایٹمی مسئلے پر امریکہ کے ساتھ براہ راست ٹکر لے رہے ہیں۔ اس نے دھمکی دی کہ امریکہ کو اب یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ اس جرم کی پاداش میں وہ پاکستان کے ساتھ وہی سلوک کرے جیسا اس نے عراق اور بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس انٹرنیشنل کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے کہا کہ ایٹمی توانائی کے پروگرام کے بارے میں وائٹ ہاؤس کے فیصلوں کا پابند رہنا ہی پاکستان کے مفاد میں ہے۔ اس نے کہا "اگر پاکستان اس پروگرام کو محدود کرنے' ایٹمی ہتھیار تیار نہ کرنے کی یقین دہانی کرائے اور یک طرفہ طور پر این پی ٹی پر دستخط کرنے کو تیار ہو جائے تو امریکہ سے 4 بلین ڈالر کے امدادی پروگرام کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پاکستان نے چونکہ اپنے ایٹمی توانائی کے پروگرام کے حوالے سے امریکی فیصلے کا احترام نہیں کیا اس لئے اب یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ پاکستان اس "گستاخی" کی وجہ سے اقتصادی بربادی' محرومی' بھوک اور ابتری کے سیاہ دور میں داخل ہو چکا ہے۔"

حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارا ایٹمی پروگرام پاک امریکہ تعلقات کی راہ میں رکاوٹ نہیں

ہے۔ بلکہ رکاوٹ ہمارا اسلامی تشخص ہے جسے امریکہ اس علاقے میں اپنے مفادات کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتا ہے۔ اگر آج ہم اس تشخص کو چھوڑنے کا اعلان کر دیں' پاکستان کو ایک غیر نظریاتی ریاست قرار دے دیں اور مغرب کے "ناجائز فرزند" اسرائیل کو تسلیم کر لیں تو ہمارا یہی ایٹمی پروگرام علاقے کے امن کے لئے انتہائی ضروری قرار دے دیا جائے گا۔ ہمارے ہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگیں گی اور ہم امریکہ کی نظروں میں وہی اہمیت حاصل کر لیں گے اور ہمیں وہی تحفظات حاصل ہو جائیں گے جو امریکی مفادات کی محافظ متعدد اسلامی ریاستوں کو حاصل ہیں۔

امریکی نیو ورلڈ آرڈر کی تہیں بھی آہستہ آہستہ کھل رہی ہیں اور یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ اس ورلڈ آرڈر کی بنیاد ہی مسلم ممالک کو کمزور کرنے' دنیا کے مختلف کونوں میں جاری اسلامی تحریکوں کو دبانے اور مسلمانوں کو ہر ملک اور دنیا کے ہر خطے میں تیسرے درجے کے شہری قرار دینے کے اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ سرد جنگ کے خاتمے اور سوویت یونین کا شیرازہ بکھرنے کے بعد' امریکہ کے لئے سب سے بڑا خطرہ ایران کی جمہوری اسلامی حکومت' افغانستان پر "اسلامی بنیاد پرستوں" کا کنٹرول' وسط ایشیاء کی نومولود اسلامی ریاستوں پر اس کے اثرات اور ملوکیت سے جان چھڑا لینے والے اور جان چھڑانے کی جدوجہد کرنے والے کلمہ گو مسلمان ہیں۔

اس ورلڈ آرڈر کا نقطہ آغاز یہ تھا کہ امریکہ نے عراق کے توسط سے ایران پر ایک طویل جنگ مسلط کر دی اور بظاہر ایک مضبوط ترین روسی حلیف' عراق کو نہ صرف بھرپور طریقے پر اس میں ملوث کر دیا بلکہ تیل کی دولت سے مالا مال کئی عرب ریاستوں کو بھی اس جنگ میں عراق کے قدم مضبوط بنانے پر مجبور کئے رکھا۔ یوں وہ مسلمانوں کا خون مسلمانوں ہی کے ہاتھوں بہانے کے اپنے مذموم منصوبے پر مسلسل آٹھ برس تک عمل کرتا رہا اور بدقسمتی تو یہ ہے کہ اس کی اس سازش کو ہماری بعض عرب ریاستوں کے فرمانروا قطعاً" نہ سمجھ سکے اور یوں اس طویل جنگ میں ایران اور عراق کے مسلمان سپاہی ہزاروں کی تعداد میں مارے گئے اور مسلمان ریاستوں کا پیسہ امریکہ اور اس کے حواریوں کی تجوریوں میں پہنچتا رہا۔ اب تک ایران اور عراق کو ہوا بنا کر امریکہ تیل کی دولت لوٹ رہا ہے۔ امریکہ ایران کے اسلامی انقلاب کے خلاف عراق کے غیر اسلامی عزائم کی اقتصادی اور اخلاقی امداد کرتا رہا' اور یوں وہ اسلامی دنیا کے وسائل اور افرادی قوت کو تہہ و بالا کرنے میں کامیاب رہا۔

مسلمان ریاستوں کے وسائل کو تباہ و برباد کرنے کے علاوہ امریکہ نے ایک اور خوفناک کھیل بھی کھیلا' جس کے اثرات پوری اسلامی امہ کو مختلف حصوں' بلاکوں اور مذہبی گروہوں

میں تقسیم کرنے کی صورت میں نمودار ہوئے۔ امریکہ نے اس ڈرامے کا دوسرا ایکٹ افغانستان میں سٹیج کیا۔ جہاں اسلام کے نام پر لڑی جانے والی جنگ کے فاتح آج بھی گروہی' نسلی اور مختلف عقائد کی بناء پر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں مصروف ہیں۔ وہ اپنی منزل کا نشان کھو چکے ہیں اور ان کی راہیں تاریک ہیں۔

ایران کے محاذ پر ناکامی کے بعد امریکی نیو ورلڈ آرڈر کا اگلا نشانہ وہی عراق تھا جس کی فوج ایران کے خلاف جدید ترین امریکی اسلحہ استعمال کر چکی تھی۔ عراق میں امریکی سفیر اپرل گلیسپی نے صدام حسین کے لئے ایک حسین جال تیار کیا اور وہ کویت پر قبضے کے بعد پوری طرح اس جال میں جکڑا گیا۔ اس منصوبہ بندی کے نتیجے میں امریکہ باآسانی عراق کی تھکی ہوئی فوج پر کاری ضرب لگانے' عربوں کو خوفزدہ کرنے اور دفاعی معاہدوں کی صورت میں بعض عرب ریاستوں کے تیل کے ذخائر اور اقتصادی نظام پر مکمل قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس ساری مشق کا اولین مقصد یہ تھا کہ کویت اور سعودی عرب کے سرمائے کو وسط ایشیاء کی اسلامی ریاستوں تک پہنچنے سے روکا جا سکے اور ترکی' ایران' پاکستان' افغانستان اور وسط ایشیاء کی اسلامی ریاستوں پر مشتمل ایک ممکنہ اسلامی بلاک وجود میں نہ آ سکے۔

پاکستان کو امریکہ کا پرانا حلیف ہونے کا "اعزاز" حاصل ہے' لہٰذا خصوصی سلوک کا مستحق ہے۔ میسرز لوکلے اینڈ کمپنی کی خواہش تھی کہ ان بدلے ہوئے عالمی حالات میں اگر پاکستان' امریکہ کی "نوازشات" سے بہرہ ور ہونا چاہتا ہے تو مکمل طور پر ہتھیار ڈال دے اور تمام قومی اور عالمی امور پر امریکی خواہشات کے مطابق سمجھوتہ کر لے کہ بس یہی ایک راستہ ہے جس سے پاکستان کو علاقے میں امن کا خیر خواہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ امریکہ کی خواہش ہے کہ پاکستان خواہ کیمپ ڈیوڈ ملاقات میں شریک ہو یا نہ ہو' کیمپ ڈیوڈ معاہدے III کو فوری طور پر تسلیم کر لے اور "امریکی نعمتوں" کا لطف اٹھانے کے لئے اسے فوری طور پر اور یک طرفہ اور غیر مشروط طور پر تسلیم کر لے۔ پاکستان کو متعدد بار باعزت طریقے پر تبدیل ہوتے ہوئے عالمی سیاسی حالات کے حقائق کو تسلیم کرنے کی "نصیحت" کے ساتھ ساتھ امریکہ' اسرائیل اور بھارت کے تیار کردہ منصوبے کے مطابق خطے کے تحفظ کے ڈیزائن کو تسلیم کرنے کا مشورہ بھی دیا جا چکا ہے۔

تھامس ڈبلیو سائیمن جونیئر

لوکلے کے بعد سائیمن "تشریف" لائے' انہوں نے 28/29 فروری 1996 کو لاہور میں امریکی ایجنڈے کا اعلان کیا۔ انہوں نے "فرمایا" کہ امریکہ کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی

ہے کہ پاکستان نے خطہ کے ممالک کے ساتھ اقتصادی تعاون شروع کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا

"لاہور کے لوگ واقعی بہت بڑا دل رکھتے ہیں کہ انہوں نے بھارت کے ساتھ تجارت میں ہراول دستے کا کام کیا ہے" سائیمن نے تجارت کے معاملے میں دوسرے SAARC کے ممالک یا چین' ایران' افغانستان' مشرق وسطیٰ اور روس سے آزادی حاصل کرنے والی اسلامی ریاستوں کا ذکر تک نہ کیا اور لاہوریوں کا خاص طور سے ذکر کیا اور انہیں شاباش دی۔ اس کے معنی سب سمجھتے ہیں۔ امریکہ کی یہ خواہش ہے کہ پاکستان اپنی سرحدیں کھول دے اور بھارت سے تجارت کرے اور یوں بھارتی مصنوعات کی منڈی بن جائے۔

سائیمن نے کہا کہ امریکہ نے جو نئی تجارتی پالیسی تشکیل دی ہے اس کا مقصد امریکی مفادات کا دفاع' تجارت کا فروغ اور سلامتی کو یقینی بنانا ہے' سائیمن سمیت امریکہ کی پالیسی بنانے والے سب یہ بھول گئے کہ ہر ملک اپنے لئے یہی چاہتا ہے' اور ایسی پالیسی کی وجہ سے ہی دوسرے ملکوں کے مفادات کے ساتھ تصادم لازمی ہے۔

سائیمن نے کھل کر کہا کہ امریکہ پاکستان کے ساتھ تجارتی روابط بڑھانا چاہتا ہے' اور چاہتا ہے کہ پاکستان سرکار اس کے لئے مناسب حالات پیدا کرے اور اپنی منڈی امریکی مصنوعات کے لئے کھول دے اور خود راستے سے ہٹ جائے' بلکہ حکومت کا تجارت کے ساتھ کوئی سروکار ہی نہ رہے۔

سائیمن کی طرح کے دوسرے امریکی نہ جانے کیوں یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ جو سبق دوسروں کو پڑھاتے ہیں خود عین اس کے برعکس عمل کر رہے ہیں۔ امریکہ کی سی آئی اے نے جاپانی منڈیوں میں خفیہ طور پر کیسے کام کیا وہ سب جانتے ہیں۔ اور امریکہ نے اپنی ان کمپنیوں کو بلیک لسٹ کرنے کی دھمکی کیوں دی جو ایران میں سرمایہ لگانا چاہتی ہیں؟

جب سائیمن سے چند چبھنے سوالات پوچھے گئے تو اس نے بچوں کا سا منہ بنا کر کہا "امریکہ تو بس یہی چاہتا ہے' اگر پاکستان کو امریکہ کی پالیسی ناپسند ہو تو وہ کوئی اور دوست ڈھونڈ لے۔"

امریکہ بس اپنی دھونس ہی جماتا ہے' بے حیائی اور بے شرمی کی حد ہے کہ پاکستان کے پیسے بھی رکھ لئے اور ایف 16 طیارے بھی نہ دیئے۔ اس سے بڑی مکاری اور کیا ہو سکتی ہے اور ایسے مکار سے مزید کیا تجارت کی جا سکتی ہے؟

ڈاکٹر کریگ بیکسٹر

ڈاکٹر کریگ پچھلے دنوں پھر پاکستان آیا ہوا تھا' 1960 کی دہائی میں ڈاکٹر کریگ لاہور کے

امریکی کونصلیت میں پولٹیکل آفسر تھا اور اس دوران وہ جہاں جاتا یہی کہتا کہ دو قومی نظریہ صریحاً" غلط تھا اور ہندوستان کو تقسیم نہیں ہونا چاہئے تھا' وہ کہتا مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں کوئی چیز مشترک نہیں' دونوں کے درمیان 1000 میل سے زیادہ فاصلہ ہے پھر یہ ایک ملک کیسے ہو سکتے ہیں؟

اس سے جب راقم نے سوال کیا کہ کیا بھارت نے مشرقی پاکستان پر یکطرفہ فوج کشی نہیں کی تھی؟ تو اس نے جواب دیا "دوست! جب تمہارے گھر میں آگ لگی ہوئی ہو تو ہمسائے کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ تمہارا سامان لوٹ لے"

اس دفعہ اس کا ہدف کشمیر تھا اور کریگ یہ مشن لے کر آیا تھا کہ کشمیر کو ایک آزاد ریاست ہونا چاہئے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا "بھارت کشمیر پر قبضہ قائم رکھنے کے لئے کروڑوں روپے خرچ کر رہا ہے' اگر کشمیر پاکستان کے ساتھ مل گیا تو یہ تمام رقم پاکستان کو صرف کرنی پڑے گی' مگر پاکستان میں اقتصادی طور پر اتنی ہمت نہیں کہ کشمیر کا بوجھ برداشت کر سکے۔" ڈاکٹر کریگ بڑی اچھی طرح جانتا تھا کہ کشمیر پاکستان کا حصہ ہے' لیکن چونکہ اب امریکہ اس خطے میں قدم جمانا چاہتا ہے اس لئے ضروری سمجھتا ہے کہ کشمیر ایک آزاد ریاست بن جائے جہاں امریکہ اپنے قدم جما سکے۔۔۔۔۔۔ "شرم تم کو مگر نہیں آتی"

70 کی دہائی میں امریکہ ڈاکٹر کریگ کو دوبارہ لاہور میں امریکہ کا کونسل جنرل بنا کر بھیجنا چاہتا تھا' لیکن ذوالفقار علی بھٹو نے اسے پاکستان آنے کی اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا۔

آپ کو یاد ہو گا کہ 1963 میں ذوالفقار علی بھٹو نے امریکہ کے سفیر لینگلے اور اس کے انفرمیشن کونسلر ولیم بی کنگ کو صدر ایوب خان سے کہہ کر اور ناپسندیدہ اشخاص قرار دلوا کر پاکستان سے نکلوا دیا تھا۔ آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ ذوالفقار علی بھٹو پہلا سربراہ مملکت تھا جس نے امریکن انسٹی ٹیوٹ آف پاکستان سٹڈیز کے لئے فنڈز مہیا کئے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس سے امریکیوں کو پاکستان سے متعلق ضروری معلومات حاصل ہوں گی اور یہ ادارہ ریسرچ بھی کرے گا۔ حیرت کی بات ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو نے تو ڈاکٹر کریگ کو لاہور میں امریکی کونسل جنرل بھی نہ بننے دیا مگر اس کی بیٹی وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے ڈاکٹر کریگ کو امریکن انسٹی ٹیوٹ آف پاکستان سٹڈیز کا سربراہ بنا دیا' یا تو محترمہ کو ڈاکٹر کریگ کے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا یا ہماری وزارت خارجہ نے انہیں کچھ بتایا ہی نہیں یا پھر امریکہ کا دباؤ اتنا تھا کہ محترمہ کو ڈاکٹر کریگ جیسے پاکستان دشمن امریکی کو اس انسٹی ٹیوٹ کا سربراہ بنانا پڑا۔

بہرحال اب وقت آگیا ہے کہ حقائق کی روشنی میں پاک امریکہ تعلقات کا از سر نو جائزہ

لیا جائے۔ امریکہ کو پاکستان کی جانب سے کوئی ایٹمی خطرہ نہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم اپنا ایٹمی پروگرام' امریکہ کے ایٹمی پروگرام کی سطح تک نہیں لے جا سکتے۔

اس سے پہلے کہ ہم باہر کی طرف دیکھیں ہمیں اندرونی طور پر بہت سے پیچیدہ مسائل کا سامنا ہے جن کا حل ہونا ہماری خوشحالی اور ترقی کے لئے بے حد ضروری ہے۔ اس حوالے سے امریکہ کی دوستی یقینی طور پر ہمارے لئے اہمیت کی حامل ہے۔ مگر ہمارے امریکی دوستوں کو بھی یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ہم اپنے قومی وقار کو امریکہ کی دوستی پر قربان نہیں کر سکتے۔

امریکہ کو حال ہی میں ماسکو میں ہونے والی فوجی بغاوت سے بھی عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ دنیا میں آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو قومی حمیت کی تذلیل کو برداشت نہیں کرتے۔ یہ بغاوت ایک عالمی سطح کے روسی راہنما گورباچوف کی ہزیمت کا ردعمل تھی جسے ایک معمولی بھک منگا سمجھ لیا گیا تھا۔ یہ ان قوم پرست سپاہیوں کا واضح ردعمل تھا جو دنیا کے نقشے پر اپنی سپرپاور سلطنت کا شیرازہ بکھرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ امریکہ کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ پاکستانی اپنے قومی وقار پر گزند آنے کی صورت میں روسیوں سے بھی زیادہ وحشت ناک ہو سکتے ہیں۔ امریکی منصوبہ سازوں اور دوسرے اسلامی ممالک کے سربراہوں کو جنہوں نے امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اور اپنی کرسی قائم رکھنے کے لئے اپنے قومی وقار کا سودا کر لیا ہے' یاد رکھنا چاہئے کہ ان کے عوام ان سے ضرور بدلہ لیں گے۔

یہ وقت پاکستانی قوم کے لئے بہت سخت اور کڑی آزمائشوں کا وقت ہے۔ ہمارے وہ رہنما جن کے دل میں قوم و ملک کا درد ہے اور جو سیاسی بصیرت رکھتے ہیں وہ قوم کی کشتی کو پار لے جا سکتے ہیں اور وہ جو کمزور اور ناتواں ہیں وہ خود ہی خزاں دیدہ پتوں کی طرح ہوا کے ساتھ اڑتے ہوئے کوڑے کے ڈھیر میں چلے جائیں گے۔

اس لئے "جاگتے رہنا بھائیو!!"



تازہ ترین

امریکہ پاکستان کی خودمختاری اور سلامتی پر متواتر حملے کر رہا ہے' یہ اس لئے بھی ہو رہا ہے کہ پاکستان کے سربراہ شاید امریکہ کے دست نگر ہیں' اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "اسلام آباد (ایوان اقتدار) کا راستہ وائٹ ہاؤس واشنگٹن سے ہو کر آتا ہے" یعنی پاکستان کی سیاست میں امریکہ کا اس قدر عمل دخل ہے کہ جسے چاہے کرسی پر بٹھا دے اور جس کے نیچے سے چاہے اقتدار کی کرسی کھینچ لے۔ یہ تاثر غلط ہے یا صحیح اس سے بحث نہیں۔ محض اس قسم کی افواہوں کا گردش کرنا ہی ملک کے لئے اور خاص طور سے ان کے لئے جو اقتدار میں ہیں' لمحہ فکریہ ہے۔

کچھ عرصہ پہلے لاہور میں امریکی قونصلیٹ کے ایک افسر لوئی ایلبنجر (Lewis Elbinger) نے خفیہ خفیہ اپنے ہم خیال پاکستانی "دوستوں" میں ایک پرچہ تقسیم کیا جس کا نام تھا (VISION)' یعنی "خیال"۔ اس پرچہ میں اس نے وہ باتیں تحریر کیں جو کہ امریکہ کا پاکستان کے متعلق تازہ ترین ایجنڈا ہے' اس نے لکھا:

"پاکستان ایک ٹوٹا ہوا بازو دکھائی دیتا ہے' پاکستان کی سوسائٹی بیکار ہے جس میں سے ابھی تک انگریز کی غلامی کی بو آتی ہے۔ ہر طرف بے ایمانی کا دور دورہ ہے۔ علاقائی تعصب میں پھنسے ہوئے لوگ صرف ایک مذہب پر اکٹھے ہیں' عام آدمی بہت غیر مطمئن ہے اور ہر آدمی دوسرے ملک کی شہریت لینے کی دوڑ میں لگا ہوا ہے"

نہ جانے یہ لکھتے ہوئے ایلبنجر یہ کیوں بھول گیا کہ امریکہ افرادی لحاظ سے اتنا کمزور و ناتواں ہو چکا ہے کہ وہ حیلے بہانے سے تمام دنیا سے ذہین' محنتی اور پڑھے لکھے لوگ اکٹھے کر رہا ہے' تاکہ بغیر ان کی تعلیم و تربیت پر پیسہ خرچ کئے ان کی لیاقت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے' پاکستان کے کئی اچھے اچھے سائنس دان جو امریکہ اور دوسرے یورپی ملکوں میں تعلیم کے لئے گئے وہ وہیں گم ہو گئے' انہیں اچھی تنخواہ اور سفید چمڑی والی بیوی کا جھانسہ دے کر وہیں رکھ لیا گیا۔

جب امریکہ نے روس سے بھی ہنرمند اور پڑھے لکھے لوگ بھرتی کرنا شروع کئے تو

روس کے صدر یلسن نے اپنے خفیہ اداروں کو حکم دیا کہ اسے روکیں کیونکہ کچھ ملک چاہتے ہیں کہ روس ہمیشہ دوسروں کا دست نگر رہے اور دوسروں کی منڈی بن جائے۔

البنجر یہ بھی لکھتا ہے:

"پاکستان میں مذہب کے نام پر ایک دوسرے کو قتل کیا جا رہا ہے' فرقہ واریت حد کو پہنچ گئی ہے اور پاکستان کے مسلمان ایک دوسرے کو قتل کرکے اسی میں جنت کی راہ تلاش کرتے ہیں۔ شاید جانور بھی اس طرح ایک دوسرے کا خون نہیں کرتے۔"

اپنے پراپیگنڈے میں البنجر نے اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ پاکستان میں فرقہ واریت کا قضیہ صرف چند سرپھرے اور ان پڑھ' مجرمانہ ذہنیت والے' دہشت گردوں تک محدود ہے جن کو بھارت کی خفیہ ایجنسی "را" اور اسرائیل کی خفیہ ایجنسی "موساد" پیسے دے کر یہ جرم کرنے کے لئے پاکستان بھیجتی ہے۔ ورنہ پاکستان میں تو مکمل فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

البنجر امریکہ کی اس پود سے تعلق رکھتا ہے جس نے شروع ہی سے پاکستان کے وجود کو نہ مانا اور جو خاص طور سے یہ اعتراض کرتے رہے کہ یہ کیسا ملک ہے جس کے مشرقی اور مغربی بازو کے بیچ 1000 میل کا فاصلہ ہے' نہ جانے امریکی مشرقی اور مغربی پاکستان کی بات کرتے وقت یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ الاسکہ امریکہ سے ہزاروں میل دور ہے اور امریکہ نے اسے 1867 میں روس سے 7200000 ڈالر کے عوض خریدا تھا۔

البنجر امریکی فارمولا پیش کرتا ہے کہ دو قومی نظریہ سراسر غلط ہے اور ہندوستان تقسیم نہیں ہونا چاہئے تھا' اب ہونا یہ چاہئے کہ پاکستان' بنگلہ دیش' نیپال' بھوٹان' مالدیو اور سری لنکا بھارت میں ضم ہو جائیں تاکہ خطہ میں ایک مضبوط ملک بن جائے اور اس طرح کشمیر کا مسئلہ بھی خودبخود حل ہو جائے گا۔

البنجر آگے چل کر کہتا ہے کہ اسلام عرب کے فاقہ کش بدوؤں اور ہندوستان کے خوشحال کاشتکاروں کے ٹکراؤ کا موجب ہے' اور سکھ مذہب ان دونوں عقیدوں کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے متحدہ ہندوستان کا مذہب بھی ایک ہونا چاہئے' سکھوں کو اپنے علیحدہ وطن کے لئے لڑنا نہیں چاہئے چونکہ یہ بابا گرونانک کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

جب البنجر سے سوال کیا گیا کہ اس وقت بھارت کی چودہ ریاستوں میں علیحدگی کی تحریکیں چل رہی ہیں' بھارت میں ذات پات کا جھگڑا اتنا پرانا اور طویل ہے کہ اب نچلی ذاتوں

والے برہمن سے طاقت کے زور پر اپنا حق مانگ رہے ہیں' بھارت کے اخبارات لکھتے ہیں کہ بھارت میں سیاست دہشت گردوں اور غنڈوں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے' کئی وزیروں کے خلاف مقدمات چل رہے ہیں' رشوت' اقربا پروری میں کئی ایک وزیر بھی شامل ہیں اور بہت سوں پر تو قتل اور اس قسم کے گھناؤنے جرائم کے الزام پر مقدمے بھی چل رہے ہیں' بھارت خود ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے' وہاں قیادت کا فقدان ہی نہیں' بھوک' ننگ اور جسم فروشی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے' ان حالات میں اس سارے خطے کا اس ایک ملک میں ضم ہو جانا کیسے ممکن ہے؟ تو اس کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا' بس وہ صرف اپنے آقا کی پڑھائی ہوئی بات کی رٹ لگاتا رہا۔ (His Mastr's Voice)

اس VISION میں اور بھی بہت سے خطرناک اور مذموم عزائم شامل ہیں' جن کا ذکر مناسب نہیں' لیکن بہرطور بات وہیں پر آ جاتی ہے کہ قوم کو صدا دی جائے' "جاگتے رہنا بھائیو"_ ہمارے دشمنوں کے ارادے بہت خطرناک ہیں اور ان کی چالیں بہت گہری۔



بھارت

چانکیا کے چیلے

کسی زمانے میں چندر گپت موریہ ہندوستان پر حکومت کرتا تھا۔ اس کا ایک درباری' ایک ہندو پنڈت چانکیا بھی تھا جس سے موریہ کبھی کبھی صلاح مشورہ کیا کرتا تھا۔ ایک روز بادشاہ چند درباریوں کے ہمراہ شکار کو نکلا۔ رات ہو گئی تو ایک جنگل میں پڑاؤ کیا۔ سپاہی خیمے لگانے اور کھانے پینے کے بندوبست میں مصروف تھے۔ چانکیا بھی ادھر ادھر آ جا رہا تھا کہ اسے ایک جھاڑی سے کانٹا چبھ گیا۔ کانٹے کا لگنا تھا کہ چانکیا غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ ملازم سے کہا کہ فوراً ایک گلاس شربت لے آؤ۔ نوکر سمجھا کہ پنڈت چانکیا کو کانٹے سے بہت تکلیف ہوئی ہو گی۔ وہ جلدی سے شربت کا گلاس لے آیا۔ چانکیا نے شربت کا ایک گھونٹ چکھا اور باقی شربت جھاڑی پر اور اس کی جڑوں میں انڈیل دیا۔ ملازم نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا "حضور کیا اس شربت میں کوئی خرابی تھی یا مجھ سے کوئی خطا ہوئی کہ آپ نے شربت گرا دیا؟ چانکیا بولا "اس کا جواب صبح دوں گا۔"

دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کے کیڑے ہزاروں کی تعداد میں آئے اور صبح تک اس جھاڑی کو چٹ کر گئے۔

صبح' چندر گپت موریہ نے حیرانی سے پوچھا' "رات یہاں ایک اچھی خاصی جھاڑی تھی' اسے کیا ہوا؟" چانکیا نے ہاتھ باندھ کر عرض کی "حضور اس نے میرے ساتھ دشمنی کی تھی اور میں نے اس کا ایسا بندوبست کیا کہ اس کا نام و نشان ہی مٹا دیا" اور پھر اسے بتایا کہ میں نے جھاڑی کو کیسے تباہ کیا۔ چندر گپت اس کی سکیم سن کر بہت خوش ہوا اور اسے وزیراعظم اور مشیر خاص کے عہدے پر ترقی دے دی۔

چونکہ ہندو دھرم میں کسی صحیفے یا آسمانی کتاب کا کوئی تصور نہیں اس لئے ہندو چانکیا کے بتائے ہوئے اصولوں پر آج بھی عمل کرتے ہیں۔ چانکیا نے اپنی مشہور تصنیف آرتھا شاستر میں ہندوؤں کے لئے سیاسی فلسفے کے بنیادی اصول انتہائی تفصیل سے بیان کئے ہیں اور آج بھی بھارت کے پورے سیاسی نظام کا ڈھانچہ جنگ اور امن دونوں حالتوں میں انہی اصولوں پر استوار ہے۔

چانکیا کا نظریہ حکومت میکاولی سے چنداں مختلف نہیں' وہ بھی اپنے پیروکاروں کو چالاک' سازشی' کمینگی کی حد تک بدلہ لینے کے خواہش مند' ہر لحہ اوچھے ہتھ کنڈوں اور بددیانتی سے دشمن کو مات دینے پر تیار اور اس ہنر میں تاک دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے سیاسی فلسفے کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ نتیجہ' طریقہ کار اور ذرائع کو جائز قرار دیتا ہے۔ بھارت نے بھی چانکیا کی معاندانہ سوچ کی روشنی میں اپنا ریاستی نظام وضع کر رکھا ہے۔

یہ چانکیا ہی کی تعلیمات کا حصہ ہے کہ اپنے ہمسائے کو ہمیشہ اپنا دشمن سمجھو۔ پاکستان بھارت کا ہمسایہ ہے' چنانچہ چانکیا کے اقوال کی روشنی میں ہم کبھی بھارت کے دوست نہیں ہو سکتے۔

ہم پاکستانی' چاہے وردی میں ہوں یا سول لباس میں' پاکستان کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی پاسبانی ہمارا اولین فرض ہے۔ چونکہ ہم ہمیشہ بھارت کے اول درجے کے دشمن رہیں گے' اس لئے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنے وطن کے خلاف بھارت کی مذموم سرگرمیوں' سازشوں اور منصوبہ بندیوں کا منہ توڑ جواب دیں۔ ہم نے اپنے کئی سالوں کے تجربے سے بھارت کے خفیہ طریقہ کار' انداز اور عمل کے بارے میں بہت کچھ جانا ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ پاکستان دشمنی کے حوالے سے اپنے مقاصد کی تکمیل میں اپنے اہلکاروں اور خفیہ ایجنٹوں کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔

بھارت کے سفارتخانے اور قونصلیٹ سے منسلک تمام اداروں میں کام کرنے والے بھارتی اہلکاروں کو تمام ممکنہ ذرائع سے پاکستان کے بارے میں "مفید" معلومات حاصل کرنے کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے اور گاہے گاہے سرحد پار سے دہشت گرد' خفیہ ایجنٹ اور تخریب کار بھی پاکستان بھیجے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری ایجنسیوں کے کاؤنٹر انٹیلی جنس کے شعبے کو ہمہ وقت بھارت کی جانب سے ایک مستقل چیلنج کا سامنا رہتا ہے۔ پاکستان میں بھارتی سفارتکاروں اور اہلکاروں کو چار مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو وزارت خارجہ سے تعلق رکھتے ہیں اور بھارتی سفارتخانے اور قونصلیٹ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ یہ لوگ صحافیوں' شہر کے معززین' تاجروں' صنعتکاروں اور اعلیٰ سرکاری حکام کے ساتھ اپنے "سماجی" تعلقات استوار کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں اور گپ شپ کے دوران ان سے معلومات اخذ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ان کا دوسرا پسندیدہ حلقہ سیاستدانوں کا ہے۔ خاص طور سے وہ پرانے سیاستدان جو ہمیشہ اپوزیشن میں رہے ہیں اور ان کی حیثیت بھارت کے سیاسی اور صحافتی

حلقوں میں بھی تسلیم کی جاتی ہے۔

یہ سفارتکار اپنے کام کا آغاز عموماً سماجی تقریبات اور مختلف پارٹیوں کے انعقاد سے کرتے ہیں۔ ان پارٹیوں کا انعقاد یوں تو وہ محض سوشل تعلقات بڑھانے کے لئے کرتے ہیں مگر ان کے پیچھے ان کا اصل مقصد' ٹیلنٹ کی تلاش' فہرست سازی اور مہمانوں کی مختلف حیثیتوں کے مطابق ان کو مختلف درجوں اور گروہوں میں تقسیم کرنا ہوتا ہے۔ ان عمومی تقریبات کے بعد ان "خصوصی دوستوں" کے لئے خاص تقاریب کا اہتمام کیا جاتا ہے جن کے بارے میں انہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ ان کے مقاصد کے حصول کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور جن سے بعض اہم معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ یہ تعلقات بظاہر کھلم کھلا استوار کئے جاتے ہیں اور مہمانوں کو اپنے میزبانوں سے یہ ملاقاتیں انتہائی بے ضرر معلوم ہوتی ہیں مگر یہ ان میزبانوں کا کمال فن ہے کہ وہ اپنی تربیت کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے باتوں ہی باتوں میں "کام" کی معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور یوں ملاقات در ملاقات کا ایک سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔

ان خصوصی دعوتوں کا اہتمام عموماً" سفارتکاروں کی رہائش گاہوں پر کیا جاتا ہے۔ یہاں مہمانوں کو موم بتی کی ہلکی سی روشنی اور کلاسیکی موسیقی کی مدھر دھنوں میں شراب کے جام پیش کئے جاتے ہیں۔ کچھ پاکستانی بھائی اسے جنس نایاب سمجھتے ہیں۔ بھارتی سفارتکاروں کی بیویاں اس سحر انگیز ماحول میں اپنی روایتی ساڑھیوں میں ملبوس اپنے حسن کی نمائش کرتی اور مسکراہٹیں بکھیرتی ایک مہمان سے دوسرے مہمان پر اپنی نیم باز آنکھوں کے جادو چلاتی رہتی ہیں۔ ایسے ماحول میں ان کی زیر لب گفتگو سے بھی پیار اور دوستی کا امرت رس ٹپکتا رہتا ہے۔ یہ اپسرائی ماحول اتنی مہارت اور مکاری سے پیدا کیا جاتا ہے کہ مہمان کے لئے جان بچانے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا اور وہ بہت جلد ہتھیار ڈال دیتا ہے اور اس کے ذہن کے دریچے اپنے میزبانوں کی عین توقع کے مطابق کھلنے لگتے ہیں۔ یوں یہ سفارتکار اپنے مہمانوں کو سیاسی' اقتصادی' سماجی اور دفاعی معاملات پر بحثوں میں الجھا لیتے ہیں اور ان سے نہ صرف ان معاملات پر ان کی آراء حاصل کرتے ہیں بلکہ مختلف امور پر ان کا ردعمل جاننے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں اور بالاخر اس خصوصی اجتماع میں انہیں ایک دو ایسے راز دار بھی مل جاتے ہیں جن کے ساتھ ان کا مستقل رابطہ استوار ہو جاتا ہے۔ ان میں سے بعض کو غیر سفارتی سرگرمیوں کے لئے تحفظات فراہم کرنے کے لئے باقاعدہ مشیر کے طور پر بھی رکھ لیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ سفارتی حلقوں میں پذیرائی کو اپنے لئے اعزاز سمجھتے ہوئے اس خوب

صورت جال میں پھنس جاتے ہیں۔ کچھ محض "اچھا" وقت گزارنے اور اچھی شراب پینے کے شوق میں اس حلقے میں آ جاتے ہیں۔ بعض بزرگان وطن اپنے ان نام نہاد بھائیوں اور بھاوجوں کے فریب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ کچھ کے لئے یہی خوشی کا باعث ہوتا ہے کہ سیاسی حریفوں، حکومت اور اسٹیبلشمنٹ کے بارے میں ان کی آراء کو اہمیت دی جا رہی ہے اور انہیں غور سے سنا جا رہا ہے۔ وہ اپنی گفتگو کو ذہنی فرسٹریشن کے اظہار کے لئے طول دیتے رہتے ہیں اور ان ملاقاتوں کے بعد اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتے ہیں۔

پاکستان کے خفیہ اداروں کے اہلکاروں نے متعدد بار اس قسم کی محفلوں میں شرکت کرنے والے ان معززین اور بزرگوں سے پوچھنے کی کوشش کی کہ ان ملاقاتوں میں زیادہ تر موضوع گفتگو کیا رہا؟ اس پر شہر کے یہ معززین اپنے بنیادی حقوق کی پامالی کا شکوہ بڑے زور و شور سے کرنے لگے اور غصے میں ارباب اختیار سے شکایت بھی کر دی، وہ بڑے فخر سے اپنے ہندو دوستوں سے بھی اس بات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ ایجنسیاں ہماری نگرانی کرتی ہیں، ہمارا پیچھا کیا جاتا ہے اور ہمیں تفتیش کے عمل سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ ان میں سے بہت کم لوگوں کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ملک کا دفاع اور سلامتی انتہائی مقدم شے ہے اور خفیہ ایجنسیوں کو اس کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لئے اپنا کردار ہر حال میں ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس بعض لوگ وطن پرستی کے جذبے کے تحت ان ایجنسیوں کے ساتھ بھرپور تعاون بھی کرتے ہیں۔

دوسری قسم کے لوگ وہ بھارتی سفارتکار اور غیر سفارتکار ہیں جن کا تعلق دفاعی سروسز، پولیس، انٹیلی جنس بیورو یا "را" سے ہوتا ہے اور انہیں مختلف اداروں میں کسی اور روپ میں تعینات کیا جاتا ہے۔ ان کی اکثریت ویزا جاری کرنے والے دفاتر میں کام کرتی ہے اور ان کے نمائندے اکثر اوقات ویزا کے حصول کے لئے آنے والے معصوم شہریوں کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے رویے میں خاصے شاطر اور پراعتماد ہوتے ہیں۔ ان کی حرکات و سکنات مختلف ہوتی ہیں اور ان کا رویہ پراعتماد ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنا وقت ضائع نہیں کرتے، یہ دفتری اوقات کے بعد بھی کسی نہ کسی مشن پر ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی خاص ملاقات کے لئے، کسی خفیہ معاملے کی تکمیل کے لئے، اپنی نگرانی کرنے والوں کو پہچاننے کے لئے یا ان کی توجہ حاصل کرنے کے لئے یا کسی بامقصد ڈرائیو پر یا پھر اپنے کسی ساتھی کو خفیہ والوں سے بچانے کے لئے دھوکہ دہی کے کسی مشن پر جاتے ہیں تاکہ ان کی توجہ حاصل کرکے اپنے ساتھی کو نکل جانے کا موقع فراہم کر سکیں۔

ان لوگوں کی تنخواہیں اور مراعات چونکہ خاصی دلکش ہوتی ہیں اور انہیں شاید سیکرٹ فنڈز سے بھی حصہ ملتا ہے' اس لئے ان کا طرز زندگی پر تعیش اور آرام دہ ہوتا ہے' ان کی بیویاں باتونی اور میک اپ کی دلدادہ ہوتی ہیں اور اکثر اوقات بیوی کے انداز اور نخرے سے اس کے خاوند کی پوزیشن اور حیثیت کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔

تیسرا گروپ ماتحت عملے کا ہے جن کی سرگرمیوں کا دائرہ دفاتر سے گھروں تک ہی محدود رہتا ہے' یہ لوگ اکثر شام ڈھلے مقامی مارکیٹوں میں اپنی بیگمات کے ساتھ روزمرہ کی ضرورت کی اشیاء کی خریداری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی آمدنی اپنے افسران کے مقابلے میں خاصی کم ہوتی ہے' اس لئے وہ دوکانداروں کے ساتھ بھاؤ تاؤ کرتے ہیں اور پاکستان میں دال سبزی گوشت کی قیمتوں کا بھارتی مارکیٹوں میں ان اشیاء کی قیمتوں سے موازنہ کرتے سنائی دیتے ہیں' مگر اکثر اوقات ان کی قوت خرید گوبھی کے پھول یا ایک کلو آلو ہی کی متحمل ہوتی ہے۔ بھارتی سفارتخانے کا یہ ماتحت عملہ انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں زندگی گزارتا ہے۔ ان کا تعلق بھی اکثر اوقات بھارت کے غریب گھرانوں سے ہوتا ہے' ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی تنخواہ میں سے ایک ایک پائی کی بچت کریں تاکہ مدت ملازمت ختم ہونے کے بعد گھر روانگی کے وقت ان کے پاس اتنا سرمایہ جمع ہو جائے کہ وہ اپنی آئندہ زندگی باعزت طریقے سے گزار سکیں۔ بھارت میں چونکہ خالص نمک کمیاب ہے اس لئے یہ لوگ بھارت چھٹی پر جاتے ہوئے اکثر پاکستانی نمک ساتھ لے جاتے ہیں' یہ لوگ مقامی باشندوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ اپنے پڑوسیوں سے بھی ان کی کوئی راہ و رسم نہیں ہوتی۔

چوتھا گروپ ان لوگوں کا ہے جو سفارتخانے یا قونصلیٹ کے ملازمین نہیں ہوتے بلکہ خاص مقاصد کے تحت ایمبیسی سکول' ائیر لائنز کے دفاتر' بینکوں اور اخبارات کے نمائندوں کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ ان گروپوں سے تعلق رکھنے والوں کے علاوہ ہماری طویل سرحدوں سے تخریب کاروں' دہشت گردوں اور خفیہ ایجنٹوں کی آمد کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔

پاکستان کی کاؤنٹر انٹیلی جنس کے لئے بھارتی کارروائیاں ایک مستقل چیلنج ہیں' اور ہم اس چیلنج کا مقابلہ انتہائی وقار' پیشہ وارانہ مہارت اور شاندار منصوبہ بندی سے کرتے ہیں۔ ہم بھارتی خفیہ ایجنسی را RAW کی اس کے اہداف میں کسی حد تک کامیابی کو تسلیم کرتے ہیں مگر جس طرح بھارت کو آئی ایس آئی کا فوبیا ہے ہمیں RAW کی جانب سے اس قسم کی

کسی پریشانی یا دباؤ کا سامنا نہیں۔ آئی ایس آئی بھارتیوں کے لئے "ہبرام آگیا" کے مصداق انتہائی شدید اعصابی دباؤ کا موجب ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ بمبئی سے لے کر آسام تک اور مدراس سے لے کر کشمیر تک جہاں کہیں بھی آزادی کی کوئی تحریک جنم لیتی ہے' کوئی احتجاج ہوتا ہے یا بم کا کوئی دھماکہ ہوتا ہے بھارتی اداروں کو اس کے پیچھے آئی ایس آئی کا خفیہ ہاتھ دکھائی دیتا ہے اور اب تو عالم یہ ہے کہ بھارتی مائیں آئی ایس آئی کا نام لے کر بچوں کو ڈراتی ہیں۔

متعدد بار ایسا ہو چکا ہے کہ بھارت میں سیکورٹی کے اہلکاروں نے تمام عالمی سفارتی ضوابط اور قوانین کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بمبئی اور دہلی میں پاکستانی سفارتکاروں کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ ان واقعات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ بھارتی کاؤنٹر انٹیلی جنس اپنی ناکامی کا غصہ ان سفارتکاروں پر نکالتی ہے اور یہ سراسر ہماری کامیابیوں کے ردعمل کے طور پر بھارتی اہلکاروں میں پیدا ہونے والی فرسٹریشن اور کنفیوژن کا اظہار ہے۔

انہیں جب بھارت میں پاکستانی سفارتکاروں کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا تو وہ پاگلوں کی طرح ان پر چڑھ دوڑتے ہیں' بھرے بازار میں اپنی جنتا کے سامنے گالی گلوچ کرتے ہیں اور مار پیٹ سے بھی گریز نہیں کرتے۔ پاکستان ہائی کمیشن کے عملے کے اراکین اور سفارتکاروں کے خلاف جو بھی کارروائی ہوتی ہے وہ بھارتی ایجنسیوں کی ناکامی اور نااہلی کا کھلا اعتراف ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس قسم کے واقعات سے بھارتیوں کے قومی کردار اور ذہنیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو وہ ان پر تشدد کی کارروائیوں میں اخلاق کی تمام حدود پار کر جاتے ہیں۔ اس ضمن میں میرے ایک دوست مسٹر ملک کی مثال دی جا سکتی ہے جو نئی دلی میں پاکستان ایمبیسی میں فرسٹ سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہو کر گئے تھے۔

وہ 2 دسمبر 1981ء کو اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ نئی دلی پہنچے۔ ان کا قیام سردار پٹیل روڈ پر واقع رچ گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ اپنے قیام کے پہلے ہی روز جب وہ رات کے کھانے سے واپس آئے تو انہیں محسوس ہوا کہ ان کی عدم موجودگی میں کمرے کی تلاشی لی گئی ہے۔ انہوں نے انتہائی احتیاط کے ساتھ کمرے کا جائزہ لیا تو انہیں بجلی کے سوئچ بورڈ کے پیچھے چرس کا ایک پیکٹ ٹھونسا ہوا ملا' غالباً بھارتیوں کا منصوبہ یہ تھا کہ مقامی اور عالمی پریس کے نمائندوں کو اکٹھا کیا جائے اور ان کی موجودگی میں مسٹر ملک کے کمرے پر چھاپہ مار کر چرس "برآمد" کی جائے' انہیں منشیات کا سمگلر ثابت کیا جائے اور یوں عالمی سطح پر پاکستان کو بدنام کیا

جائے۔ مسٹر ملک نے فوری طور پر سفیر صاحب سے رابطہ کیا اور انہیں صورتحال سے آگاہ کیا۔ یقیناً بھارتی خفیہ ایجنٹ ہوٹل کے سٹاف کا رکن ہو گا کہ اس نے فون پر مسٹر ملک کی سفیر صاحب سے گفتگو سن لی۔ اس نے اپنے افسروں کو بتا دیا۔ چنانچہ اس گفتگو سے بھارتی خفیہ ادارے کے اس منصوبے پر پانی پھر گیا۔

یوں مسٹر ملک کی عقلمندی اور بروقت اقدام سے پاکستان کا ایک معزز سفارتکار منشیات کی سمگلنگ کے الزام سے بچ گیا۔ اگلے روز ہمارے سفیر نے اس واقعہ پر نہ صرف انڈین فارن آفس سے شدید احتجاج کیا بلکہ ایک پریس کانفرنس بھی منعقد کر ڈالی جس میں مسٹر ملک کے کمرے سے برآمد ہونے والا چرس کا پیکٹ بھی صحافیوں کو دکھایا۔ یوں "را" کی کالی ہنڈیا بیچ چوراہے ٹوٹ گئی اور چانکیا کے چیلوں کو منہ کی کھانی پڑی۔

ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہم نے اس قسم کی بھونڈی اور گھٹیا منصوبہ بندی کبھی نہیں کی۔ اگر ہمیں کبھی کسی بھارتی اہلکار کے منہ پر تھپڑ مارنا بھی پڑا تو یہ محض مجبوری کے عالم میں ہوا اور اس سے بھارتیوں کو یہ پیغام دینا مقصود تھا کہ اگر نئی دلی میں ہمارے بھائی محفوظ نہیں ہیں تو اسلام آباد میں ہم بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یوں بھی بعض اوقات یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ دشمن کے ساتھ اس زبان میں بات کی جائے جسے وہ اچھی طرح سمجھتا ہو۔ اور بندر صرف یہی زبان سمجھتا ہے۔

پاکستان کے ساتھ سفارتی تعلقات کے حوالے سے بھارت نے ہمیشہ سے مکارانہ رویہ اور انداز اپنایا ہے اور اپنے گرو چانکیا کے اس فرمان پر پوری طرح عمل کیا ہے کہ "تمہارا سب سے قریبی ہمسایہ کبھی تمہارا دوست نہیں ہو سکتا۔"

1971ء کی جنگ کے بعد جب پاک بھارت سفارتی تعلقات بحال ہوئے تو آئی ایس آئی نے بھارتی سفارت کاروں کی کلیئرنس چند ہی روز میں بھجوا دی مگر بھارتی حکام نے ہمارے عملے کی کلیئرنس کو جان بوجھ کر التوا میں ڈالے رکھا اور ہمارے فارن آفس پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ بھارتی عملے کو فوری طور پر اسلام آباد آنے کی اجازت دی جائے۔ ہمارا خیال تھا کہ دونوں جانب کے عملے کو ایک ہی وقت میں بھیجا جانا چاہئے اور بہتر یہی ہو گا کہ واہگہ کی مشترکہ چیک پوسٹ پر دونوں ملکوں کے سفارتی عملہ کا ایک دوسرے سے تعارف ہو۔

تاہم ہمارا سادہ لوح دفتر خارجہ بھارتی سفارتکاروں کو خوش آمدید کہنے کے لئے بہت بے چین دکھائی دیتا تھا۔ انہوں نے اپنی بھرپور کوشش کی کہ ہماری سفارشات کو نظر انداز کر دیا جائے' یہاں تک کہ انہوں نے ڈی جی آئی کو بھی اس بات پر قائل کر لیا کہ بھارتی عملے کے

فوری آ جانے میں کوئی حرج نہیں، چند روز میں ہمارے عملے کو بھی کلیئرنس مل جائے گی۔ مگر میں نے ڈی جی آئی کو صاف کہہ دیا کہ بھارتی حکام چالاکی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور وہ پاکستانی عملے کی کلیئرنس کو غیر معینہ مدت تک ملتوی رکھیں گے۔ اگر ان کا عملہ اسلام آباد پہنچ گیا تو ہمارے پاس پاکستانی عملے کی کلیئرنس کے لئے بھارت پر دباؤ ڈالنے کے لئے کچھ نہیں ہو گا۔ ڈی جی آئی صاحب نے میرے نقطہ نظر سے اتفاق کیا اور ہم اس امر کو یقینی بنانے میں کامیاب ہو گئے کہ دونوں ملکوں کا سفارتی عملہ بیک وقت ہی واہگہ چیک پوسٹ پار کرے گا۔

کچھ اس طرح کی صورت حال بمبئی میں پاکستانی قونصلیٹ اور کراچی میں بھارتی قونصلیٹ کھولنے کے وقت بھی پیدا ہوئی۔ میں نے اس بار پھر یہی تجویز پیش کی کہ ہم بھارتی عملے کو کلیئرنس اس وقت دیں جب دونوں دفاتر بیک وقت کھلنے کے انتظامات مکمل کر لئے جائیں، مگر ہمارے دفتر خارجہ نے ایک بار پھر ہماری تجویز کی مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ محض ضابطے کی کارروائی ہے اور بھارتی حکام نے یہ وعدہ کیا ہے کہ جونہی برطانیہ جناح ہاؤس خالی کر دے گا، اسے نہ صرف پاکستان کے حوالے کر دیا جائے گا بلکہ پاکستانی عملے کو شاندار استقبالیہ بھی دیا جائے گا۔ میں نے اس کے جواب میں فارن آفس کو لکھا کہ "ہندو ذہنیت کو سمجھنے کے لئے کیا ہمیں اور تجربات کی ضرورت ہے؟ میرے الفاظ کہیں کندہ کر لیں کہ بھارت نہ صرف اپنے وعدے سے مکر جائے گا، بلکہ بمبئی میں ہمارا قونصلیٹ کھولنے میں جہاں تک ممکن ہو سکا لیت و لعل سے کام لے گا" مگر ہمارا دفتر خارجہ ایک بار پھر ہمیں نظر انداز کرنے کے لئے بے چین تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ سندھ میں رہنے والے پاکستانیوں کو بھارتی ویزے کے حصول کے لئے سخت مشکلات کا سامنا ہے اور ان کی سہولت کے لئے کراچی میں بھارتی قونصلیٹ کا جلد از جلد قیام بے حد ضروری ہے، مگر میں بھی اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا کہ جب تک ہم بمبئی میں اپنا قونصلیٹ نہ کھول لیں، بھارتیوں کو کراچی آنے کی اجازت نہ دی جائے، مگر بدقسمتی سے فارن آفس نے ایک بار پھر اپنے "جذبات" کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"آپ سمجھتے ہیں کہ صرف آئی ایس آئی ہی پاکستان کی وفادار ہے اور فارن آفس کی وفاداری مشکوک ہے؟"

چنانچہ ہماری سفارشات کی بالکل پرواہ نہ کی گئی اور کراچی میں بھارت کو یکطرفہ طور پر اپنا قونصل خانہ کھولنے کی اجازت دے دی گئی۔ ادھر بھارتی حکام نے بمبئی میں ہمارا قونصل

خانہ کھولنے کی راہ میں نہ صرف انتظامی اور سفارتی رکاوٹیں پیدا کیں بلکہ وہ جناح ہاؤس ہمارے حوالے کرنے کے وعدے ہی سے مکر گیا۔ کراچی پہنچتے ہی بھارتی قونصلیٹ کے سٹاف نے سندھ میں نہ صرف امن و امان کی صورت حال کو خراب کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا بلکہ وہ تخریب کاری میں بھی ملوث ہو گیا۔ بھارت نے نہ صرف جناح ہاؤس ہمارے حوالے نہ کیا بلکہ پاکستانی سٹاف سے اس قسم کا سلوک روا رکھا کہ بالاخر پاکستان بمبئی میں اپنا قونصل خانہ بند کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بمبئی سے پاکستانی عملہ جس حال میں واپس پاکستان آیا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں' اور اس کے ردعمل طور پر آخر بھارتیوں کو بھی کراچی سے نکالنا پڑا۔

میرے نزدیک ہمارے دفتر خارجہ کی آنکھیں کھولنے کے لئے یہ مثالیں کافی ہیں اور میری تجویز ہے کہ چانکیا کی تصنیف ارتھ شاستر کو فارن سروس اکیڈمی کے نصاب میں شامل کیا جانا چاہئے۔ اور خاص طور پر انڈین ڈیسک پر کام کرنے والے تمام اہلکاروں کے پاس اس کتاب کی ایک کاپی ضرور ہونی چاہئے تاکہ وہ بھارت سے متعلق تمام معاملات کو اس کتاب کی مدد سے باآسانی سمجھ سکیں۔ ارتھ شاستر' ہمارے ان پاکستانی بھائیوں کو بھی ضرور پڑھنا چاہیے جو بھارت کو اچھا ہمسایہ سمجھتے ہیں اور سرحدیں کھولنے کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔

چانکیا کی تعلیمات کا ایک اور لازمی اصول غداری' دغا بازی اور قتل و غارت کے ذریعے دو طاقتور گروہوں کو آپس میں لڑانا ہے اور اس نے اپنی تصنیف میں بارہا اپنے چیلوں کو ان اصولوں پر کاربند رہنے کی ہدایت کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ داشتائیں رکھنے والے اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ دشمن کے سپہ سالار ان دیویوں کے حسن اور جوانی سے مرعوب رہیں' ان کی زلفوں کے اسیر رہیں اور کوشش کرتے رہیں کہ دشمن فوج کے دو سپہ سالار ایک ہی پریوش کی محبت کا دم بھرنے لگیں تاکہ یہ دونوں عشاق اپنی اپنی سپاہ کے ساتھ ایک دوسرے کے مقابل آ جائیں اور دشمن کی صفوں میں خون ریزی کا آغاز ہو جائے۔

چانکیا کی تعلیمات کی روشنی میں بھارتی خفیہ ایجنسیاں پاکستانیوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لئے محلائیں بھی بھرتی کرتی ہیں۔ یہ اپسرائیں حسن و جمال میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ ان کا طرز عمل بازاری عورتوں جیسا ہوتا ہے اور اس کیڈر میں اکثر رنڈیوں کو بھرتی کیا جاتا ہے۔

اصولی طور پر ہمیں پاکستانی سفارتکاروں اور اتاشیوں کے بھارتی سفارتکاروں کے ساتھ سماجی تعلقات پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا' مگر یہ ضروری ہے کہ یہ تعلقات سفارتی حدود کے

اندر رہیں' کیونکہ ان حدود کو پھلانگنا کسی طرح خطرے سے خالی نہیں۔

کابل میں ہمارے ایک ائیر اتاشی کا قصہ کچھ اسی طرح کا ہے۔ موصوف بھارتی ائیر اتاشی کی خوبصورت بیوی کے حسن کے دیوانے ہو گئے اور عشق کی یہ واردات اس قدر طول پکڑ گئی کہ ایک دفعہ انہوں نے سفارتخانے سے چھٹی تو لے لی مگر پاکستان نہ آئے۔ ہم نے تحقیقات کی تو پتہ چلا کہ وہ رخصت پر تو ہیں لیکن کابل میں اپنی رہائش گاہ سے بھی غائب ہیں۔ یہ معاملہ بہرحال تشویشناک تھا۔ مزید تحقیقات سے پتہ چلا کہ موصوف اپنی تعطیلات بھارتی ائیر اتاشی کے گھر میں گزار رہے ہیں۔ اور دن رات بھارتیوں کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ چنانچہ انہیں پاکستان واپس بلا لیا گیا۔

تفتیش شروع ہوئی تو انہوں نے اپنی غلطی تسلیم نہ کرتے ہوئے یہ بات ماننے سے ہی انکار کر دیا کہ وہ بھارتی ائیر اتاشی کی بیوی کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہے تھے' بلکہ الٹا انہوں نے خود کو جیمز بانڈ 007 کے روپ میں پیش کرنا شروع کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے یہ سارا کھیل بھارتی فضائیہ کے بارے میں اہم معلومات حاصل کرنے کے لئے کھیلا۔ مگر اس کے برعکس حقیقت یہ تھی کہ وہ بھارتی ناگن سے ڈسے جا چکے تھے اور زہر ان کی رگ رگ میں سرائیت کر چکا تھا۔ اس عورت کے خاوند نے ان سے اپنی بیوی کے ساتھ "محبت" کی نہ جانے کیا قیمت وصول کی' بہرحال انہیں کابل سے واپس بلا لیا گیا اور قانونی ضابطوں کے مطابق انہیں موزوں سزا کا سامنا کرنا پڑا۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ امارات میں متعین ہمارے ایک سفیر کا ہے۔ امارات میں بھارتی سفیر نے اپنی خوبصورت بیوہ بہن کو بھارتی سفارت خانے میں ملازمت دے رکھی تھی اور یہ ملازمت دراصل ہمارے سفیر کو پھانسنے کے منصوبے کا ایک حصہ تھی۔ عزت مآب سفیر صاحب اس بھارتی سپوتری کو دیکھتے ہی دل ہار بیٹھے اور تنہائیوں میں مہدی حسن اور غلام علی کی دل سوز غزلوں کے کیسٹ سننے لگے۔ کیوپڈ کا یہ وار اس قدر کاری تھا کہ سفیر صاحب نے اس دیوی کے ساتھ سات پھیرے لینے کا فیصلہ کر لیا' مگر انہیں اس فیصلے کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ انہیں سفارت کے منصب سے فارغ کر دیا گیا اور وہ حالات کے ہاتھوں اس قدر مجبور ہو گئے کہ انہیں ایک معمولی نوکری کے لئے امارات کے حکمران شیخ زاید سے درخواست کرنا پڑی' شیخ زاید نے ان کی حالت پر ترس کھا کر انہیں یہ نوکری تو دے دی' مگر ایک باعزت سفارتکار اور اس کا خاندان آج بھی چانکیا کے چیلوں کی واردات کا چلتا پھرتا اشتہار ہے۔ تاہم ہم نے اس بھارتی سازش کو سیدھے سادھے انتظامی عمل کے ذریعے ناکام

بنا دیا۔

تیسرا واقعہ نئی دلی میں پاکستانی ہائی کمیشن کے ایک فرسٹ سیکرٹری کا ہے۔ یہ حضرت انتہائی راز داری سے ایک بھارتی "کتیا" سمگل کر کے پاکستان لے آئے اور یہاں اس سے باقاعدہ شادی رچالی۔ اس سے پہلے کہ یہ جوڑا ہنی مون پر روانہ ہوتا ہمیں صورت حال کا علم ہوگیا اور انہیں بھی نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔

ارتھ شاستر تخریب کاری اور سازشوں کے موضوعات پر بھی خاموش نہیں ہے۔ چانکیا لکھتا ہے کہ "بلاشبہ جنگ کا دار و مدار فوجی قوت پر ہوتا ہے' مگر قوت بازو سے بھی زیادہ اہمیت کی حامل وہ حکمت عملی ہے جو دشمن کے مورال کو اس حد تک پست کر دے کہ فوجی حملے سے پہلے ہی وہ تباہی کے کنارے تک جا پہنچے۔ بھارتی حکمت عملی میں معاندانہ پراپیگنڈہ' ڈس انفارمیشن اور صورت حال کی منفی تصویر کشی اولین اہمیت کے حامل ہے اور یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ یہ وہ شعبے ہیں جن میں بھارت نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے اور یوں بھی ہم نے اپنے اندرونی اختلافات' مذہبی اور لسانی جھگڑوں اور علاقائی تنازعات کے حوالے سے بھارت کو خود ایسے مواقع فراہم کئے ہیں کہ وہ ہماری اندرونی صورت حال سے ناجائز فائدہ اٹھا سکے۔ یہ ہمارے اسی پاگل پن کا نتیجہ تھا کہ بھارت اپنی بہتر منصوبہ بندی سے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنوانے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ صورت حال ہمارے دانشوروں' سیاستدانوں' علماء اور عوام کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے اس کا سختی سے نوٹس لینے اور اس حوالے سے مثبت منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ بھارتی پراپیگنڈے کا تجزیہ کر کے اس کا کوئی مناسب سدباب کرنا ازحد لازمی ہے۔



جموں کا علموں

سرحد پار سے آنے والے بھارتی جاسوسوں کو پکڑنے کے لئے ہماری سی آئی کو نت نئے جال بننے پڑتے تھے۔ ایک مرتبہ مقبوضہ کشمیر سے آنے والے چند جاسوس جب پکڑے گئے تو انہوں نے بتایا کہ ہمیں علموں سے رابطہ کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔

علموں کو پکڑنے کے لئے چھاپے مارے گئے لیکن علموں کسی طور ہاتھ نہ آیا۔ بھارتی جاسوس بتاتے کہ علموں گجرات شہر میں رہتا ہے اور بہت چالاک اور ہوشیار "ریذیڈنٹ ایجنٹ" ہے۔ سی آئی کے اہلکاروں نے گجرات شہر کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن علموں تو جیسے چھلاوا ہو' کہیں اس کا اتہ پتہ نہ ملا۔

23- مارچ کا دن قریب آ رہا تھا اور خیال تھا کہ اس دن جاسوسی کے لئے آنے والوں کی سیالکوٹ چھاؤنی میں بھرمار ہو گی' اس لئے ان بھارتی جاسوسوں کی "خاطرمدارات" کے لئے خاص انتظامات کئے گئے اور اس آپریشن کا انچارج ایک بہت ہی تجربہ کار اور دانش مند افسر' میجر ملک کو بنایا گیا۔ میجر ملک بارڈر کے ساتھ ساتھ کئی دن پیدل چلتا رہا اور آخر اس نے ایک ایسا جال پھیلا دیا کہ کسی بھارتی کے لئے اس سے بچ کر نکلنا ناممکن تھا۔

میجر ملک نے اپنی ٹیمیں مختلف جگہوں پر تعینات کیں اور خود ایک مرکزی مقام پر بیٹھ گیا تاکہ جہاں بھی ضرورت ہو فوراً پہنچ جائے۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا گیا۔ جو بھی مرغا جال میں آتا اسے جلدی سے پوچھ گچھ کے لئے پیچھے بھیج دیا جاتا۔ 23 مارچ کو صبح تین بجے بھارت کی طرف سے چار آدمی آتے دکھائی دیئے۔ جیسے ہی انہوں نے سرحد عبور کی اور پاک سرزمین پر اپنے منحوس قدم رکھے' میجر ملک کے تعینات کردہ عقابوں نے انہیں دبوچ لیا۔ ان چاروں کو علیحدہ علیحدہ راستوں سے سیالکوٹ میں پوچھ گچھ کے مراکز پر لایا گیا۔ کوشش یہی تھی کہ ان سے جلد جلد سوال پوچھے جائیں تاکہ سب آنے والوں کا پتہ چل جائے۔

ان میں سے تین نے بتایا کہ ہم علموں کے ساتھ آئے ہیں۔ اور علموں نے ہی ہمیں

مختلف جگہوں پر لگاتا تھا۔ ظاہر ہے چوتھا آدمی علموں ہی تھا۔ میجر ملک علموں کے پاس گئے۔ علموں تھا تو چٹا ان پڑھ' لیکن حد درجہ کا مکار اور چالاک۔ وہ تو کوئی بات ماننے کے لئے ہی تیار نہیں تھا۔ اور ایک جھوٹ سے دوسرا جھوٹ اور دوسرے سے تیسرا اس ہوشیاری سے بولتا کہ سننے والے کو اس کی بے گناہی پر یقین آ جاتا۔ لیکن جب اسے باور کرایا گیا کہ اس کے تینوں ساتھیوں نے اس کا ہی نام علموں بتایا ہے تو علموں کا سر جھک گیا۔

علموں نے اپنے کارنامے سنانے شروع کئے۔ علموں پچاس سے زیادہ مرتبہ جموں سے پاکستان آیا تھا اور اس نے تیس سے زیادہ بھارتی جاسوسوں کی رہنمائی کی تھی اور ان کو مختلف جگہوں پر جاسوسی کے لئے تعینات کیا تھا۔ علموں سے ہر بھارتی جاسوس کے بارے میں علیحدہ علیحدہ اور تفصیل سے معلومات حاصل کی گئیں اور ہر ایک کا پیچھا کیا گیا۔

علموں نے ایک تازہ واقعہ سنایا :

"چند دن ہوئے میں نے وزیر آباد کے ڈاک خانے سے ایک ایجنٹ کو 800 روپے گجرات بھیجے تھے' لیکن اس کا نام پتہ معلوم نہیں۔" علموں نے مزید کہا کہ چونکہ میں بالکل ان پڑھ ہوں اس لئے میں نے منی آرڈر فارم بھی ڈاکخانے کے ایک کلرک سے پر کروایا تھا' اور مجھے میرے آقاؤں نے جس کاغذ پر پتہ لکھ کر دیا تھا وہ بھی میں نے ضائع کر دیا تھا۔

میجر ملک نے سوچا کہ وزیر آباد سے گجرات شاذ و نادر ہی کوئی منی آرڈر بھیجتا ہو گا۔ اس لئے اس منی آرڈر کی رسید ڈھونڈنا مشکل نہ ہو گا۔ وزیر آباد پوسٹ آفس والوں نے بتایا کہ تمام ریکارڈ لاہور جی پی او بھجوا دیا گیا ہے۔ لاہور جی پی او کے اہلکاروں نے بھرپور تعاون کیا اور جلد ہی ڈھیروں رسیدوں میں سے آٹھ سو روپے وزیر آباد سے گجرات بھیجے جانے والے منی آرڈر کی رسید ڈھونڈ نکالی۔

رسید پر درج پتے پر آدمی تعینات کر دیئے گئے اور خفیہ طور سے اس گھر میں ہر آنے جانے والے پر نظر رکھی گئی۔ یہاں صرف ایک آدمی رہتا تھا' چودھری محمد شبیر' چند دنوں بعد مجسٹریٹ اور پولیس پارٹی کے ساتھ اس کے گھر پر ریڈ کیا گیا۔ چودھری شبیر نے بھاگنے کی کوشش نہ کی' صرف اتنا کہا...... "تو آخر آپ لوگ مجھ تک پہنچ ہی گئے۔"

گھر کی مکمل تلاشی لی گئی اس میں سے وائرلیس سیٹ' کوڈ اور بہت سی رپورٹیں جو ابھی بھیجی جانی تھیں ہاتھ لگیں۔

شبیر نے اپنی کہانی سناتے ہوئے کہا۔ "میرا اصلی نام روپ لال ہے اور میں انجینئر بٹالین

کا سپاہی ہوں' جو کہ سیالکوٹ بارڈر پر تعینات تھی۔ ایک رات شور مچا کہ پاکستانی کمانڈوز آ گئے ہیں اور خوف میں سب نے اندھا دھند فائر کرنا شروع کر دیا۔ میرے فائر سے اپنا ہی نائیک ہلاک ہو گیا۔ میرا کورٹ مارشل ہوا اور مجھے پندرہ سال قید بامشقت کی سزا دی گئی اور جیل بھیج دیا گیا۔"

روپ لال نے بتایا "بھارتی جیلوں میں رشوت ستانی' چرس' افیون کا کاروبار' ناقص غذا کی فراہمی عام ہے اور قیدیوں سے انسانیت سے گرا ہوا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔" اس نے مزید بتایا کہ "ایک دن ہندوستان کی خفیہ ایجنسی "را" کے کچھ لوگ جیل میں آئے اور خطرناک مجرموں' قاتلوں اور لمبی سزا پانے والے قیدیوں کے انٹرویو شروع ہوئے۔ میں نے بھی انٹرویو دیا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا تم پاکستان جا کر رہنے اور جاسوسی کے لئے تیار ہو؟ میں جیل کے حالات سے اس قدر تنگ آ چکا تھا کہ میں نے ہاں کر دی اور ایک فارم پر دستخط کر دیئے۔

مجھے نئی دہلی لیجایا گیا جہاں 9 ہفتہ کا جاسوسی کا کورس کروایا گیا۔ وہاں سے مجھے جموں لے گئے جہاں مزید تین ماہ کا سپیشلسٹ کورس کروایا گیا۔

ایک رات مجھے سمگلروں کے ساتھ پاکستان بھیجا گیا اور مجھے سکھایا گیا کہ اب سے تم اوکاڑہ کے ایک کمیشن ایجنٹ ہو اور گجرات شہر میں کاروبار کے لئے آئے ہو۔ میں نے گجرات شہر میں چھوٹا سا گھر کرایہ پر لیا اور تھوڑے ہی عرصے میں کافی دوست بنا لئے۔ میں باقاعدہ مسجد بھی جاتا جس سے مجھے ایک شریف شہری سمجھا جانے لگا۔

اس دوران میں راولپنڈی' جہلم' کھاریاں' لاہور اور اوکاڑہ تک گیا۔ چونکہ میں فیروز پور کا رہنے والا ہوں اس لئے مجھے زبان اور لباس سے کوئی نہیں پہچان سکتا تھا کہ میں بھارت سے آیا ہوا ہندو ہوں۔

تین ماہ بعد میں باڈر کراس کر کے واپس جموں گیا اور اپنے ڈپٹی ڈائریکٹر کو رپورٹ کی اور انہیں بتایا کہ میں گجرات میں باآسانی رہ سکتا ہوں۔ مجھے چار ہفتے کی مزید تربیت دی گئی' جس میں وائرلیس سیٹ چلانا' اسے درست کرنا اور پیغام کے کوڈ وغیرہ سکھائے گئے۔ مجھے نمبر P-7 دے کر وائرلیس سیٹ کے ساتھ واپس پاکستان بھیج دیا گیا اور میرا کام فوجی حضرات سے رابطہ کرنا ان سے معلومات حاصل کرنا اور ان میں سے موزوں حضرات کو ایجنٹ کے طور پر بھرتی کرنا تھا۔

پاکستان آ کر میں نے گجرات میں ایک گھر کرایہ پر لیا اور جہلم سے لے کر اوکاڑہ تک اپنی کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔

اکثر فوجی حضرات جو بازاروں میں سودا سلف خریدنے کے لئے آتے' میں ان سے دوستی کی کوشش کرتا اور چند ہی ملاقاتوں میں مجھے وہ باتوں باتوں میں اپنی یونٹوں کے متعلق بہت کچھ بتا دیتے۔ یونٹ کے نام' یونٹ کے پاس موجودہ فوجی سازوسامان' سکیموں اور ٹریننگ کی تفصیلات' افسروں کے نام وغیرہ وغیرہ معلوم کرنا معمولی سی بات تھی۔"

روپ لال نے جو خفیہ معلومات حاصل کیں اور جتنے ایجنٹ بھرتی کیے ان سب کی تفصیل بھی بتا دی۔ روپ لال نے ابھی تک باقاعدہ طور سے 21 ایجنٹ بھرتی کیے تھے جن میں سے چند کو وہ اپنے ہمراہ ہندوستان بھی لے گیا تھا۔ جب ان ایجنٹوں کو باری باری پکڑا گیا اور ان کی سرگرمیوں کی تفصیل حاصل کی گئی تو معلوم ہوا کہ ہمارے بہت سے پاکستانی بھائیوں نے صرف چند سکوں کے عوض اپنا ضمیر اور ملک کے راز ایک چالاک ہندو کے ہاتھ فروخت کر دیئے تھے۔

روپ لال کے لئے ایک "پیغام" بنایا گیا اور اسے کہا گیا کہ تم اپنے وائرلیس سیٹ پر پیغام بھیجو کہ کچھ بہت ہی حساس قسم کی دستاویزات ہاتھ لگنے کے امکانات ہیں' اس لئے اپنے افسر سے کہو کہ 10000 روپیہ اور ایک ایجنٹ تیار رکھے اور اس کے اگلے پیغام کا انتظار کرے۔

روپ لال نے یہ پیغام بھیج دیا۔ جموں سے اس پیغام کا مثبت جواب آیا۔ اس کا مطلب تھا کہ روپ لال نے پیغام درست بھیجا۔

چند دنوں بعد دوسرا "پیغام" بھیجا گیا جس میں گجرات کے ایک ہوٹل کا پتہ دیا گیا اور وقت اور تاریخ مقرر کی گئی۔ اودھر سے پیغام آیا جس میں اس ایجنٹ کا حلیہ بتایا گیا جو پیسے لے کر آ رہا تھا۔

مقررہ تاریخ اور وقت پر روپ لال کو برقعہ پہنا کر اس ہوٹل میں لے جایا گیا اور اسے ایک ایسی جگہ بٹھا دیا گیا جہاں اس کی نظریں دروازے پر تھیں۔ جیسے ہی ہندوستان کا ایجنٹ آیا' روپ لال نے کہا یہی آدمی ہے۔ چنانچہ میجر ملک کی ٹیم کے آدمی ایجنٹ کو پکڑ کر لے گئے۔

اس قسم کا کھیل ہندوستان کے ساتھ دو تین ماہ جاری رہا اور ان کے تین آدمی پکڑ لئے

گئے۔ ظاہر ہے جب ان کا کوئی ایجنٹ بھی واپس نہ پہنچا تو وہ سمجھ گئے کہ روپ لال پکڑا گیا ہے چنانچہ اس کے مزید پیغاموں کا جواب دینا ترک کر دیا گیا۔

روپ لال نے تفتیش کے دوران یہ بھی بتایا کہ میرے افسر بہت لالچی اور جھوٹے ہیں۔ میں نے جو بھی کام کیا مجھے اس کا معاوضہ نہیں دیا گیا۔ اس نے کہا میرے افسر اکثر پیسے خود رکھ لیتے ہیں اور جب میں پاکستان آتا ہوں تو مجھے لمبی چوڑی فہرست دے دیتے ہیں کہ واپسی پر ہمارے لئے یہ تحفے لے کر آؤ۔"

روپ لال اور اس کے ایجنٹوں کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ روپ لال کو پھانسی کی سزا ہوئی اور دوسرے ایجنٹوں کو مختلف دورانیہ کی قید کی سزائیں سنائیں گئیں۔

29 مارچ 1997ء کو بھارت کے اخبار ہندوستان ٹائمز میں ایک مضمون شائع ہوا 'Former spies move court for Justice' اس کا ترجمہ درج ذیل ہے :

"سابق جاسوسوں نے انصاف کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکٹا دیا"

"چھ بھارتی جاسوس جنہوں نے غربت و افلاس سے تنگ آ کر دشمن ملک پاکستان جا کر خفیہ کارروائیاں کرنے کا دھندا اختیار کیا تھا واپس آنے کے بعد ابھی تک کسمپرسی کی حالت میں ہیں۔ قابل سنگھ' ہلبیر سنگھ' بلوندر سنگھ' مہندر سنگھ اور فقیریا مسیح کو بھارتی خفیہ ایجنسی' ملٹری انٹیلی جنس اور جی برانچ نے 70 کی دہائی میں بھرتی کیا تھا۔ یہ لڑکے انپڑھ اور بے روزگار تھے۔ بھارتی خفیہ ایجنسی نے انہیں تربیت دے کر جاسوسی کی غرض سے پاکستان بھیجا' یہ جاسوس ایک ماہ میں تقریباً پانچ دفعہ بارڈر کراس کرتے اور خبریں اکٹھی کر کے اپنے آقاؤں تک پہنچاتے۔

کچھ عرصہ تو یہ سلسلہ جاری رہا' پھر باری باری پاکستان کی سیکورٹی ایجنسیوں کے ہاتھوں یہ لڑکے گرفتار ہو گئے۔ انہیں 7 سال سے 25 سال تک قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ قید سے رہائی کے بعد وہ اب تک در در کی خاک چھان رہے ہیں' لیکن ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ اب انہوں نے ہائیکورٹ میں دعویٰ دائر کیا ہے کہ جب ان کو بھرتی کیا گیا تھا ان سے بڑے لمبے چوڑے وعدے کئے گئے تھے اور انہیں سبز باغ دکھائے گئے تھے' لیکن ان کے آقاؤں نے اب انہیں پہچاننے سے بھی انکار کر دیا ہے۔

قابل سنگھ جو سارجا مرزا کا رہنے والا ہے اس نے کہا کہ "جب مجھے بھرتی کیا گیا میری عمر 19 سال تھی' میں نے میٹرک پاس کیا ہوا تھا اور روزگار کی تلاش میں تھا۔ خفیہ ایجنسی

والوں نے مجھے چکنی چپڑی باتیں کر کے جاسوسی کے کام کے لئے پھنسا لیا' میں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر دشمن ملک کے خلاف جاسوسی کی کارروائیاں کیں۔ پاکستان میں گرفتاری کے بعد مجھے 12 سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔

میری سزا کے دوران کسی نے میری فیملی کو نہیں پوچھا اور نہ ہی انہیں سرکار کی طرف سے میری تنخواہ یا کوئی امداد دی گئی۔ آج میں دھاڑی دار مزدور ہوں۔"

بلبیر سنگھ نے کہا کہ "میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ پاکستان کی جیلوں میں کاٹ دیا۔ ہمارے افسران نے اپنے وعدے پورے نہیں کئے اور ہم اسی طرح بے روزگار اور بے بس ہیں۔ میں اپنے ہم وطنوں سے کہوں گا کہ ہماری خفیہ ایجنسیوں کے مکر و فریب سے بچیں' میں اپنے کئے پر سخت نادم ہوں۔"

مکر' فریب اور دھوکا دہی کڑاڑ کی رگ رگ میں بھری ہے۔ وہ نہ اپنے لوگوں کا اور نہ ہی اپنے دیش کا وفادار ہے۔"



پریم نگری

بھارت نے پاکستان میں اپنے سفارتخانے میں کسی مسلمان یا سکھ اہلکار کو کم ہی تعینات کیا ہے۔ یہ ان کی پالیسی کا ایک حصہ ہے جو قابل فہم ہے اور جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ سکھوں اور مسلمانوں پر اعتماد نہیں کرتے اور اس بے یقینی کی انتہا یہ ہے کہ وہ پاکستانیوں سے اتنے خائف ہیں کہ گھریلو ملازمین تک بھارت سے اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ بھارت میں چونکہ تعلیمی معیار خاصا بہتر ہے اور ان کی شہری آبادی کی شرح خواندگی نسبتاً زیادہ ہے' اس لئے اکثر اوقات خاصے پڑھے لکھے نوجوان انتہائی معمولی نوکری کے لئے بھی ان کے ساتھ آ جاتے ہیں۔ مگر یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ گھریلو کاموں سے بہت جلد اکتا جاتے ہیں اور انہیں اپنی ڈگریاں زہر لگنے لگتی ہیں۔ انٹیلی جنس بیورو' پولیس اور "را" کے بعض ایجنٹوں کو بھی گھریلو ملازمین کے طور پر پاکستان لایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے افسران کی ہر وقت خدمت کر سکیں اور معمولی ملازمت کے پردے میں بھارتی خفیہ منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں۔ ان حالات میں ہمارے لئے مزید مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں اور ہمیں ان کے نوکروں کی سرگرمیوں پر بھی کڑی نظر رکھنی پڑتی ہے۔

موہن ایک بھارتی سفارتکار کا گھریلو ملازم تھا۔ ایک روز وہ مارکیٹ میں قالین اور سمگل شدہ اشیاء بیچنے والے پٹھانوں سے رازدارانہ طریقے سے چرس خریدنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ انتہائی محتاط اور خفیہ انداز میں مختلف پٹھانوں سے چرس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ مگر وہ پٹھان اس کو پولیس یا کسی خفیہ محکمے یا انسداد منشیات کے سکواڈ کا رکن سمجھ کر اسے دھتکار دیتے۔ اس کی بے تابی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ چرس کا عادی ہے اور بھارت سے اپنے ساتھ جتنا سٹاک لایا تھا ختم ہو چکا ہے اور اب اسے شدت سے "کالی ماتا" کی تلاش ہے' لہٰذا یہ ضروری تھا کہ اس کی اس طرح سے نگرانی کی جائے کہ اس کی قوت برداشت کا امتحان بھی ہو جائے۔

ایک روز جب وہ معمول کے مطابق بے چین اور بے قرار چرس کی تلاش میں ان پٹھانوں کی منت سماجت کر رہا تھا' ہمارا اُپنا "پٹھان" کندھے پر قالین لٹکائے وہاں پہنچ گیا۔ اس

نے موہن سے قالین خریدنے کے لئے کہا۔ مگر موہن نے قالین خریدنے سے تو حتمی طور پر انکار کر دیا مگر حسب توقع سوال کیا "خان چرس ہے تمہارے پاس۔؟" ہمارے پٹھان نے اس کے سوال پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اسے مارکیٹ میں خریداروں کے ہجوم سے پرے ایک کونے میں آنے کا اشارہ کیا۔ اب موہن کے چہرے پر باغ و بہار کی کیفیت تھی۔ پٹھان کا یہ مثبت اشارہ ایک جان بلب شخص کے منہ میں امرت رس ٹپکانے والی بات تھی۔ مارکیٹ کے قدرے ویران کونے میں پہنچ کر ہمارے پٹھان نے موہن سے اس کی شناخت پوچھی اور یہ تسلی کرنا چاہی کہ کہیں وہ پولیس کا آدمی تو نہیں۔ موہن نے اسے اپنا سفارتخانے کا شناختی کارڈ دکھایا' ہمارا تربیت یافتہ کارکن بھی مکمل تسلی کے موڈ میں تھا۔ اس نے موہن سے کہا کہ "اوہ بابا ہم کو یہ کیا دکھاتا' ہم یہ نہیں پڑھ سکتا' اگر تم ہندو ہے تو اپنی اصلی شناخت کرواؤ!" موہن اس حد تک بے قرار تھا کہ وہ پٹھان کو قریبی جھاڑیوں میں لے گیا اور اپنی پتلون کے بٹن کھول کر اپنے ہندو ہونے کا یقین دلا دیا۔

اس واردات کا مقصد ایک تو یہ تھا کہ موہن کو ہمارے آدمی پر کسی قسم کا شک نہ گزرے اور دوسرے اس کی طلب کی شدت کا اندازہ بھی ہو جائے۔ آپریشن کا پہلا مرحلہ بخیر و خوبی انجام پا گیا۔ "پٹھان" نے اسے مغرب کی نماز کے بعد ملنے کو کہا اور یہ بھی کہا "ہم سگریٹوں کے پیکٹ میں چرس سے بھرا ہوا ایک سگریٹ رکھ دے گا اور اس کا قیمت بیس روپیہ لے گا' بولو منظور ہے؟" موہن نے جواب دیا "خان ایک سگریٹ کی قیمت بیس روپیہ' ہم تو غریب آدمی ہے اتنی رقم کدھر سے لائے گا' کچھ کم کرو" اس نے بنئے والی منت سماجت شروع کر دی۔ "دیکھو تم کو خریدنا ہے یا نہیں؟ ہمارا ٹائم ضائع مت کرو' معلوم ہے پکڑا گیا تو جیل تمہارا باپ کاٹے گا؟ جاؤ بابا جاؤ اپنا راستہ پکڑو' ہم کو سگریٹ نہیں بیچنا ہے" پٹھان یہ کہہ کر چل دیا۔

موہن کی تو گویا موت قریب آ رہی تھی' وہ اس کے پیچھے پیچھے منتیں کرتا ہوا چلتا رہا' "اچھا خان صاحب ہم کو منظور ہے' پر چیز اچھا ہونا چاہئے اور ہم شام کو پہنچ جائے گا۔" اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ آج نہ جانے کتنے دنوں کے بعد اس کی سانس کی نالیوں میں کالی ماتا کا رس ٹپکنے والا تھا۔ وہ وقت سے پہلے ہی طے شدہ مقام پر پہنچ گیا۔ اس نے ہمارے پٹھان سے دوستی قائم کرنے کی کوشش کی اور کئی وعدے بھی کئے تاکہ سپلائی میں تسلسل رہے۔ چرس والا سگریٹ اس کی جیب میں تھا اور ہمارا ڈالا ہوا کانٹا حلق تک اس مچھلی کے وجود میں پھنس چکا تھا۔

موہن کو چرس کی سپلائی کا سلسلہ شروع ہوا تو بہت جلد اس کی جیب خالی ہونے لگی۔ اپنے ذرائع کے حوالے سے وہ قطعی طور پر اس عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا' مگر اس سے ہاتھ کھینچنا بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ مجبوراً اس نے "پٹھان" سے لوھار کا سلسلہ شروع کرنے کی درخواست کی۔ "دیکھو بابا ادھار محبت کا قینچی ہے' ہم کو یہ سودا ادھار نہیں ملتا نقد پیسے دیتا ہوں اور ادھر پولیس کا ڈر بھی رہتا ہے' جاؤ بابا جاؤ اپنا راستہ ناپو" یہ کہہ کر ہمارا پٹھان پھر چل پڑا۔

"نہیں خان صاحب ہم بندوبست کرے گا آپ کل ضرور آنا۔" موہن نے اس سے وعدہ لے لیا۔

دوسری ملاقات میں ہمارے پٹھان نے کہا "دیکھو ہم کو اپنا گھر دکھاؤ' ہم کو تم اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے' ویسے بھی تم پردیسی ہے پر دیکھو اگر ہمارا پیسہ مارا تو ہم تمہارے صاحب کو بول دے گا۔"

موہن بہت خوش ہوا اور پٹھان کو اپنے کوارٹر میں لے گیا' پٹھان وہاں کافی دیر تک بیٹھا رہا اور ہر چیز کا بغور جائزہ لیتا رہا۔

ہمارا اپریشن مرحلہ وار پروان چڑھ رہا تھا' پٹھان نے موہن سے "دوستی" کر لی۔ اور یہ تعلق کاروبار سے زیادہ دوستی میں تبدیل ہو گیا۔ پٹھان نے پہلے اسے کہا "دیکھو دوست جو ہمارا سامان نہیں بکتا وہ ہمیں واپس نوشہرہ لے جانا پڑتا ہے' بس کا کرایہ بہت لگ جاتا ہے' اگر میں یہ سامان یہاں رکھ جایا کروں اور صبح کو یہاں سے لے لیا کروں تو کیسا ہے؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں' تم سامان یہاں چھوڑ دیا کرو" موہن آمادہ ہو گیا۔ اس کا مقصد تھا کہ اب اسے چرس ملتی رہا کرے گی' ادھر موہن کے سر پر ادھار بھی کافی ہو چکا تھا' اس نے سوچا کہ اس طرح پیسے ادا کرنے کا مرحلہ شاید چند روز اور ٹل جائے۔

ایک دن بارش ہو رہی تھی' موہن نے پٹھان سے کہا "دوست اب بارش بھی ہو رہی ہے اور سردی بھی ہے تم کہاں نوشہرہ جاؤ گے یہیں رات گزار لو"۔

ہمارا تیر عین نشانہ پر لگا' ہمارا پٹھان' ہندوستان کے اونچے درجے کے سفارتکار ڈھوڈھی کے گھر میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

ایک رات جب موہن چرس کے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے فضا میں بکھیرنے میں مصروف تھا' بھارتی سفارتکار کی جواں سال بیٹی رتو چرس کی بو سونگھتی اس کے کوارٹر تک آ پہنچی۔ موہن رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ اس کی سزا یہ تجویز ہوئی کہ رتو کو بھی اس کا

ایک سوٹا لگانے دیا جائے' سوٹے کے لئے سگریٹ فوری طور پر پیش کر دیا گیا۔ ریتو نے شاید پہلی مرتبہ یہ حرکت کی تھی کیونکہ اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ شاید سگریٹ نوشی بھی نہیں کرتی' تاہم ریتو نے اس سوٹے کے اچھے اثرات محسوس کئے اور یوں یہ سلسلہ ایک سوٹے سے بڑھ کر پورے سگریٹ تک آ گیا اور اب ریتو ہر رات موہن کے کوارٹر میں موجود ہوتی' وہ ایک سگریٹ کی قیمت موہن سے بھی زیادہ ادا کرتی۔ یوں موہن' ریتو اور پٹھان دوستی کی ایسی تکون بن گئے جو چرس کے دھوئیں سے مکمل ہوتی تھی۔

مسٹر ڈوڈھی کے گھر تک پہنچنے کا ہمارا منصوبہ انتہائی خوبصورتی سے مکمل ہو چکا تھا۔ ہمارے "پٹھان" کو بالآخر موہن کے کوارٹر سے ڈوڈھی کی خواب گاہ تک بھی رسائی حاصل ہو گئی۔ یہاں ہمارے اس "معصوم قالین فروش" نے خفیہ آلات نصب کر دیئے اور موقع بہ موقع اہم فائلوں کے مطالعے سے بھی فیض یاب ہونے لگا۔ علاوہ ازیں بعض کار آمد معلومات اسے موہن اور ریتو سے گفتگو کے ذریعے ملتی تھیں۔

یہ سلسلہ اپنے پورے جوبن پر تھا کہ ہمارے لئے ایک اور خزانے کا منہ کھل گیا۔ ایک روز ہمارے پٹھان کو معلوم ہوا کہ ڈوڈھی اپنے ایک ساتھی سفارتکار مسٹر دھاون کی بیوی کی محبت میں گرفتار ہے اور مکمل طور پر اسے بے وقوف بنا رہا ہے۔ مسز دھاون سفارتی کمیونٹی میں ایک پڑھی لکھی' جاذب نظر اور متحرک شخصیت کے طور پر جانی جاتی تھی۔ اتفاق سے مسز دھاون کا نام پہلے ہی ہمارے زیر نگرانی افراد کی فہرست میں شامل تھا کیونکہ وہ بے حد سوشل تھی اور پاکستانی فیملیز کے ساتھ تعلقات استوار کرنے میں خاص طور سے پیش پیش رہتی تھی۔ ہمیں شک تھا کہ وہ باقاعدہ تربیت یافتہ ہے اور پاکستان دشمن سرگرمیوں میں اپنے خاوند کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ اس کے حسن کے جلووں سے کئی دوسرے سفارتکار بھی متاثر نظر آتے تھے۔ اس کی شخصیت' دھیمے لہجے اور اداؤں کا جادو کئی دل پھینک قسم کے سفارتکاروں کے سر چڑھ کر بول رہا تھا اور وہ کئی خاندانوں کی ازدواجی زندگیوں کے لئے تباہی کا باعث ہو سکتی تھی۔ اسے وش کنیا تک قرار دیا جا سکتا تھا' مگر اپنی ایک کمزوری کی وجہ سے اس کی حالت ایک شکست خوردہ سپاہی کی سی تھی اور وہ کمزوری تھی جنسی جذبات کی تسکین۔ مسز دھاون کا شمار ان خواتین میں ہوتا تھا جو اپنے سفلی جذبات کی تسکین کے لئے کسی بھی معیار اور سٹیٹس کی پرواہ نہیں کرتیں۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ڈوڈھی کی قربت کے لئے ہمہ وقت بے چین دکھائی دیتی تھی۔

مسز ڈوڈھی ان دنوں اکثر بھارت آتی جاتی تھی' جہاں وہ اپنی بیٹی ریتو کی شادی کی تیاریوں میں مصروف رہتی تھی۔ ریتو کی رخصتی کا دن بھی غالباً مقرر ہو چکا تھا۔ چنانچہ مسٹر ڈوڈھی کے لئے مسز دھاون کی زیادہ سے زیادہ قربت حاصل کرنے کا اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں تھا۔ سینئر ہونے کے ناطے وہ اکثر مسٹر دھاون کو سرکاری کام سے بھارت بھجوا دیتا اور پھر معاملہ "میں تے میرا ڈھولن ماہی" والا رہ جاتا۔ وصل کے شب و روز کبھی مسز دھاون کے ہاں اور کبھی ڈوڈھی کے بیڈ روم میں گزرتے اور مسٹر ڈوڈھی کو اکثر علی الصبح مسٹر دھاون کے گھر سے یا مسز دھاون کو ڈوڈھی کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا جاتا۔

مسز دھاون اس حد تک جنس زدہ تھی کہ وہ سرور و کیف کے ان لمحات کی آڈیو ریکارڈنگ کر لیتی اور بعد میں مسٹر ڈوڈھی کو تحفے کے طور پر پیش کیا کرتی۔

ان آڈیو کیسٹوں کو سن کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جنسی عمل میں کس حد تک مہارت رکھتی تھی۔ کاماسترا اور کوک شاستر کا شاید ہی کوئی آسن ایسا ہو جو مسز دھاون' مسٹر ڈوڈھی پر نہ آزماتی۔ یوں ڈوڈھی کے لئے ہر رات وصل کی رات ہوتی اور وہ دن میں ان آڈیو ریکارڈنگز سے لطف اندوز ہوتا۔ ریتو' موہن اور ہمارا پٹھان بھی ان میں سے بہت سی کیسٹوں سے استفادہ کر چکے تھے مگر انہیں سننے کے بعد وہ کیا محسوس کرتے ہوں گے یہاں اس کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔

مسز دھاون کی ہوس پرستی کا یہ عالم تھا کہ وہ محض ان کیسٹوں پر ہی اکتفا نہیں کرتی تھی' بلکہ باقاعدگی سے ڈوڈھی کو رومن' ہندی اور انگریزی زبانوں میں محبت بھرے خطوط لکھنا بھی اس کا معمول تھا۔ ان خطوط کے متن مسز دھاون کے اندر بھری ہوئی جنسی چاہت کا آئینہ ہوتے۔ جن میں اکثر اوقات ڈوڈھی کے ساتھ گزاری ہوئی گذشتہ رات کے جنسی تجربات کا خلاصہ ہوتا اور جذباتی مد و جزر کو انتہائی بے باک انداز میں بیان کیا ہوتا۔ ان خطوط میں سے ایک خط کا عکس اور کچھ اقتباسات کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

22 نومبر۔ میرے پیارے موٹو بابا' مائی ڈارلنگ (مسز دھاون' مسٹر ڈوڈھی کو پیار سے موٹو کہا کرتی تھی) پیارے! مجھے تنہا چھوڑ کر بھارت جا رہے ہو' اگر یہ ریتو کی شادی کا معاملہ نہ ہوتا تو میں تمہیں اپنے پیار کے اتھاہ سمندر میں غوطہ لگائے بغیر کسی قیمت پر بھی یوں جانے کی اجازت نہ دیتی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے کیسٹ میں کیا کچھ کہا ہے۔ برائے کرم مجھے اس پر کوئی سزا نہ دینا' یہ ان لمحات کی کہانی ہے جو میں نے گذشتہ رات تمہارے ساتھ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر گزارے تھے اور یہ عجیب سی بات ہے کہ میں ہمیشہ اپنے جذبات

کو کیسٹ میں بھر کر تسکین محسوس کرتی ہوں۔ شاید میں تمہاری شاندار جنسی کارکردگی کی داد تمہارے منہ پر نہیں دے سکتی' حالانکہ اب میرے اور تمہارے درمیان کسی قسم کا کوئی پردہ نہیں ہے اور شاید تم میرے جسم کے ان خطوط سے بھی واقف ہو چکے ہو جن تک ابھی دھاون کو بھی رسائی نصیب نہ ہوئی ہو گی۔ میری جان! مجھ سے خفا مت ہونا۔ تم نے تو میری روح بھی اپنے قبضے میں کرلی ہے بابا! میں سرتاپا تمہاری ہوں۔ مجھے صرف تمہارا پیار چاہئے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تم سے بچھڑے ہوئے صدیاں بیت گئی ہیں۔ مجھ سے اب یہ جان لیوا انتظار برداشت نہیں ہوتا۔ میرا ایک ایک انگ تمہارے زندگی اور کیف سے بھرپور بوسوں کا منتظر ہے۔ میں زندگی کے آخری سانس تک تمہارا انتظار کروں گی۔ صاحب! تمہاری دی ہوئی سونے کی زنجیری جس طرح ہر وقت میری گردن کا احاطہ کئے رہتی ہے اسی طرح تم بھی ہر وقت میری سوچوں میں رہتے ہو۔ میں اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے' تمہارے ہی سپنے دیکھتی ہوں۔ اپنے اردگرد تمہاری ہی سانسوں کی گرمی محسوس کرتی ہوں۔ میں ہر صبح رام کی مورتی کو سجدہ کرنے کے بعد اپنی مانگ میں تمہارے نام کا سندور لگاتی ہوں اور بھگوان کے لئے اپنا خیال رکھنا" وغیرہ وغیرہ۔

چند روز بعد رتو بھی اپنے والدین کے ساتھ پاکستان سے روانہ ہو رہی تھی۔ روانگی کے وقت رتو کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ اپنے دوستوں سے کہہ رہی تھی کہ "شادی کے بعد شاید میں کبھی پاکستان نہ آسکوں مگر یہاں گزارے ہوئے بہترین لمحات مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے اور اے پٹھان میں تم کو کبھی نہ بھلا پاؤں گی۔"

ڈوڈھی کے جانے کے بعد مسز دھاون کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔ اس کے اندر کی شکست و ریخت اس کے چہرے اور انداز سے عیاں تھی اور اس سے پہلے کہ وہ ٹوٹ پھوٹ جاتی ہم نے اس کی "شدت طلب" کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک سمارٹ اور خوبصورت پاکستانی نوجوان کو اس سے متعارف کروا دیا۔ ہمارا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا اور مسٹر ڈوڈھی سے زیادہ جوان' خوبصورت' صاحب ثروت اور مضبوط اعصاب کا مالک یہ نوجوان بہت جلد مسز دھاون کا ڈارلنگ بن گیا۔ ہمارے "ہینڈ سم" نے مسز دھاون کو وہ "نظارے" دکھلائے کہ موصوفہ ڈوڈھی کو بھول گئی۔

مسٹر ڈوڈھی اپنی بیٹی رتو کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہو کر جب واپس اپنی ڈیوٹی پر پہنچا تو وہاں کا نقشہ یکسر بدل چکا تھا۔ اس کی جگہ ہمارے "ہینڈ سم" نے لے لی تھی اور ڈوڈھی کی محبوبہ دلنواز اب ایک مسلمان کی محبت کے سمندر میں غوطے لگا رہی تھی اور اس

کی عضلاتی قوتوں سے فیض یاب ہو رہی تھی۔

ریکارڈنگ کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔ وہ دونوں اکثر اپنے جنسی اختلاط کے مناظر کی وڈیو فلمیں دیکھ کر محظوظ ہوتے۔ ہمارے "ہینڈ سم" کے بقول یہ مناظر مسز دھاون کی جنسی آگ پر تیل کا کام دیتے اور وہ تمام اخلاقی حدود پھلانگ کر ایک بار پھر مستی میں ڈوب جاتی۔

ہمارے "ہینڈ سم" کی ان خدمات کے عوض مسز دھاون ہمارے لئے کام کرنے پر تیار ہو گئی۔ دراصل وہ کسی قیمت پر "ہینڈ سم" کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ ہمارے "ہینڈ سم" کی تجربہ کاری نے مسز دھاون کو وہ تمام فرائض بھلا دیئے تھے جو اسے بھارتیوں نے تفویض کئے تھے۔ اس حوالے سے ہمارا مسز دھاون کی خدمات کو نہ سراہنا ناانصافی ہو گی۔ وہ ہمیشہ ایک مستعد کارکن کی طرح ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کرتی رہی۔ اس نے تو جیسے بھارتی ایمبیسی کے سارے تالے کھول دیئے۔ ایمبیسی میں پتہ بھی ہلتا تو ہمیں پتہ چل جاتا۔ اس سے نہ صرف ہم ان کی ہر چال کو مات دے دیتے بلکہ اکثر اوقات ان کو احمق بھی بنا دیتے۔ یہ سلسلہ جب تک بھی چلا بہت اچھا چلا اور کسی مرحلہ پر ہمیں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔

تاہم ہمیں اس وقت بے حد افسوس ہوا جب مسٹر دھاون کو واپس اپنے ملک میں پوسٹنگ کا حکم نامہ موصول ہوا۔ محبت کے اس خوبصورت گھونسلے کے تمام پرندے ایک ایک کر کے اڑ گئے۔ موہن' رتو اور اب مسز دھاون۔ وہ گھونسلا جہاں ہر وقت لو برڈز یعنی پریم کرنے والے پرندے چہچہایا کرتے تھے بالآخر ویران ہو گیا۔ وہ جب تک ہمارے سائے میں رہے ہم نے ان کے معاملات میں کبھی دخل اندازی نہ کی۔ "نظر آنے والا دشمن' چھپے ہوئے دشمن سے بہرحال بہتر ہوتا ہے" کاؤنٹر انٹیلی جنس والے ان تمام "پرندوں" کی خدمات کو دیر تک یاد رکھیں گے۔ آپریشن لو برڈز اپنی تکمیل کو پہنچا تو ایک دروازہ بند ہونے سے پہلے ہمارے لئے کئی دروازے کھول گیا۔

ہم ان تمام کرداروں کے ممنون ہیں جنہوں نے نہایت تندہی سے اپنا اپنا فرض بخوبی انجام دیا۔



ویزا سیکشن

اسلام آباد میں بھارتی خفیہ ایجنسیوں کی سب سے بڑی شکار گاہ بھارتی سفارتخانے کا ویزا سیکشن ہے۔ لاکھوں پاکستانی ایسے ہیں جن کے عزیز رشتہ دار آج بھی بھارت میں مقیم ہیں' انہیں بہرطور ویزا حاصل کرنے کے لئے بھارتی ایمبیسی جانا ہی پڑتا ہے۔

بھارت کی خفیہ ایجنسیوں کے شکاری ان مجبور لوگوں میں ایسے لوگ ڈھونڈتے ہیں جنہیں بلیک میل کرکے یا کوئی لالچ دے کر بھارت کی خفیہ ایجنسیوں کے لئے کام کرنے پر مجبور کیا جا سکے۔ کچھ لوگ اس ڈر سے کہ ان کے رشتہ داروں کو بھارت میں تنگ کیا جائے گا یا ان کو کبھی بھی بھارت کا ویزا نہیں ملے گا' آخر ان کا کہا مان لیتے ہیں۔

اسی طرح مسٹر فضل جو ایک مقامی بینک کا پبلک ریلیشن آفسر تھا' بینک کے ملازمین یا افسروں کے رشتہ داروں کے لئے ویزا لینے بھارتی ایمبیسی جایا کرتا تھا' اچھا خاصا پڑھا لکھا اور سمارٹ یہ لڑکا آخر بھارتی ایجنسیوں کی نظر میں آ گیا۔

ایک روز فضل چند پاسپورٹ لئے بھارتی ایمبیسی آ کر لائن میں لگ گیا' دوپہر کے قریب اس کی باری آئی' جب اس نے پاسپورٹ کھڑکی میں بیٹھے ویزا کلرک کے سامنے رکھے تو اس نے اٹھا کر یہ باہر پھینک دیئے اور کہا۔

"ہم تمہارے باپ کا نوکر ہے کہ جب بھی تم آؤ ہم پاسپورٹوں پر ویزا لگا دیں' جاؤ ویزا نہیں لگے گا' جس جس کا پاسپورٹ ہے اس کو بھیجو خود آ کر ویزا لے' ہٹو آگے سے' کھڑکی چھوڑو۔"

یہ رویہ دیکھ کر فضل پریشان ہو گیا کہ پہلے بھی وہ دو تین پاسپورٹ لایا کرتا تھا' اب کیا آفت آ گئی' وہ اسی خفت اور شش و پنج میں تھا' کہ ایک اور بھارتی شکرا آ گیا' اور مکارانہ ہمدردی کے ساتھ بولا "اوہ اوہ یہ آپ کے ساتھ کیا ہوا؟ اصل میں بھگت جو ہے نا اس کا دماغ کبھی کبھی گھوم جاتا ہے' سالا اچھے بھلے لوگوں کے ساتھ یہ سلوک کرتا ہے' آپ فکر نہ کریں میں آپ کو بڑے صاحب کے پاس لے چلتا ہوں"

اس بھارتی نے آگے بڑھ کر زمین سے پاسپورٹ بھی اٹھائے' انہیں جھاڑا اور جلدی

جلدی قدم بڑھاتا گیٹ پر آیا اور گیٹ کیپر کو حکم دیا "جلدی سے گیٹ کھولو' دیکھتا نہیں صاحب آیا ہے۔" اس کے حکم پر گیٹ فوراً کھل گیا۔

اس نے فرسٹ سیکرٹری کا دروازہ کھٹکھٹایا اور فضل کو اندر لے گیا اور ایکٹنگ شروع کر دی۔

"صاحب دیکھو یہ فضل صاحب ہے نا یہ ہمارا دوست ہے اور بینک کا پی آر او ہے' ہم جب بھی بینک جاتا ہے فضل صاحب ہماری مدد کرتا ہے' یہ بہت اچھا آدمی ہے صاحب اور اگر اس کے صاحب کو ویزا نہیں ملا تو اس کو بینک سے نکال دیں گے۔ اپنا بھگت ہے نا اس کا دماغ پھر گیا ہے' اس نے پاسپورٹ اٹھا کر پھینک دیا۔ صاحب آپ ویزا لگا دیں نا' بڑی مہربانی ہو گی۔"

فرسٹ سیکرٹری بولا "منشی رام یو شٹ اپ" اور فضل سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

"فضل صاحب جس کو ویزا چاہئے اس کو خود ایمبیسی آنا پڑتا ہے' بھگت نے درست کیا' اب آپ جا سکتے ہیں۔"

فضل اور منشی رام باہر آ گئے' منشی رام بولا:

"فضل صاحب آپ فکر نہ کریں' ہم ان دونوں کو سیدھا کروا دے گا۔ آؤ ہم ویزا کونسلر راجندر دت صاحب کے پاس چلتے ہیں۔"

راجندر دت کے کمرے میں گھستے ہی منشی رام نے پھر وہی ایکٹنگ شروع کر دی۔

راجندر دت مسکرایا اور فضل کو بیٹھنے کے لئے کہا' پاسپورٹ منشی رام اٹھائے ہوئے تھا' اس نے اسے حکم دیا:

"منشی رام جا کے ان پر ویزا لگوا لاؤ۔"

منشی رام تیز تیز قدم اٹھاتا باہر چلا گیا' راجندر دت نے فضل سے ذاتی سوالات پوچھنے شروع کئے اور اس کی دماغی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا' اور شاید یہ بھی سوچا کہ مقامی ہے' بینک میں پی آر او ہے' پڑھا لکھا سمارٹ آدمی ہے' بہت کام کا ایجنٹ رہے گا' اور پھر ضرورت مند بھی ہے' گفتگو کے دوران کافی بھی آ گئی اور اب فضل بھی خوش تھا کہ اس کے باس اس سے خوش ہوں گے کہ ویزے لگ گئے۔

منشی رام خوشی خوشی پاسپورٹ لے کر واپس آ گیا' ویزے لگ چکے تھے' فضل نے راجندر دت کا شکریہ ادا کیا' اٹھنے لگا تو دت نے پھر کہا:

"بھگت نے جو آپ کے ساتھ بدتمیزی کی ہے' میں اس کے لئے شرمندہ ہوں' اصل

میں کھڑکی میں بیٹھا بیٹھا آدمی بھی اکتا جاتا ہے اور پھر آپ کے بھائی لوگ ویزا کے لئے تنگ بھی بہت کرتے ہیں' بہرحال آپ نے جب آنا ہو' منشی رام سے مل لیا کریں وہ میرے پاس لے آیا کرے گا۔"

منشی رام نے تو جیسے بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہو' خوشی خوشی فضل کے ساتھ باہر گیٹ تک آیا' اور کہنے لگا:

"فضل صاحب۔ منشی رام آپ کا نوکر ہے' جب بھی ویزا چاہئے ہو میرے پاس آ جاؤ۔ میں ادھر ہی ہوتا ہوں۔ میری زیادہ ڈیوٹی گیٹ کے باہر لگتی ہے"

اگلی بار جب فضل چند اور پاسپورٹ لے کر گیا تو منشی رام باہر ہی کھڑا تھا' فوراً" اسے اندر کونسلر رنجیت دت کے کمرے میں لے گیا' اور پھر رنجیت دت کے حکم پر ویزا لگوانے کے لئے اس کے پاسپورٹ لے گیا' رنجیت دت نے کافی منگوائی اور ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں' جیسے وہ ایک دوسرے کو مدت سے جانتے ہوں اور دوست ہوں' پاسپورٹ جب واپس آ گئے اور فضل اٹھنے لگا تو رنجیت دت نے میز کی دراز سے ایک ہندوستانی ساڑھی نکالی اور کہا:

"فضل میاں آپ کی نئی نئی شادی ہوئی ہے' یہ تحفہ ہماری طرف سے اپنی بیگم کو دے دیں۔"

فضل کچھ پریشان سا ہو گیا' وہ باہر جانے لگا تو رنجیت نے کہا:

"فضل صاحب ہمارے لڑکے باہر جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ کے خفیہ والے ہر جگہ ان کا پیچھا کرتے ہیں۔ مجھے اصل میں پاکستان کی اس سال کی "اکنامک سروے آف پاکستان" کی رپورٹ چاہئے' اگر آپ لیتے آئیں تو ممنون ہوں گا۔"

فضل نے وعدہ تو کر لیا پر بڑا پریشان ہوا کہ کہیں اسے ایجنٹ تو نہیں بنایا جا رہا؟ اس نے اپنے ایک دوست سے بات کی جو اتفاقاً" میرا بھی جاننے والا تھا' وہ دوست اسے اسی رات ہی میرے گھر لے آیا' فضل گھبرایا ہوا تھا اور اس نے مجھے اپنی ساری کہانی سنائی' میں نے اسے بتایا کہ "بھگت کی سختی اور رنجیت کی نرمی سارا ایک ڈرامہ ہے' اصل بات یہی ہے کہ وہ تمہیں پھنسانا چاہتے ہیں" یہ سن کر فضل نے وہ ساڑھی میرے سامنے ایسے پھینک دی جیسے وہ سانپ ہو اور اسے ڈسنے والا ہو۔

فضل بہت نروس تھا' میں نے اس کو تسلی دی اور کہا "گھبراؤ نہیں' چلتے جاؤ' یہ گیم اچھی چلے گی' تم اپنے دفتر میں بتائے بغیر کام کرتے رہو۔" فضل نے کہا:

"نہیں جناب مجھے ایسی نوکری نہیں چاہئے۔ میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی نوکری پر۔ میں آئندہ بھارتی ایمبیسی نہیں جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا:

"نہیں، نہیں حوصلہ رکھو، ہمیں بھی تمہارے جیسے محب وطن لوگوں کی تلاش رہتی ہے، فکر مت کرو اور "اکنامک سروے آف پاکستان" کی کتاب کوئی خفیہ نہیں یہ عام دکانوں پر مل جائے گی، اصل میں یہ تمہارا پہلا ٹیسٹ ہے اور جب اگلی دفعہ جاؤ تو کتاب ساتھ لیتے جاؤ اور جب بھی وہاں جاؤ اور جب بھی ملاقات ہو بعد میں میرے پاس آ جایا کرو۔"

میں نے اسے ملاقات کے طریقے، جگہیں اور اوقات بھی بتا دیئے تاکہ اگر بھارتی ایجنٹ اس پر نظر رکھے ہوئے ہوں تو وہ مجھ تک نہ پہنچ پائیں ورنہ کھیل بگڑ جائے گا۔

اگلی دفعہ فضل اکنامک سروے آف پاکستان ساتھ لے گیا۔ دت بہت خوش ہوا اور کہا

"اب تم ہمارے دوست بن گئے ہو، ایک اور کام کرو، کوئی اپنا دوست سی بی آر میں بناؤ اور یہ پتا لگاؤ کہ پاکستان نے اس سال کتنا تانبہ باہر سے منگوایا ہے یا منگوانے کا ارادہ رکھتا ہے، سی بی آر والے چونکہ کسٹم ڈیوٹی لگاتے ہیں، ان کے پاس ایسی ساری تفصیل ہوتی ہے۔"

فضل جب چلنے لگا تو دت نے میز کی دراز سے شراب کی ایک بوتل نکالی اور فضل کو دیتے ہوئے کہا:

"پیارے دوستی لگانے کے لئے یہ سب سے کارآمد ہتھیار ہے"

"میں تو شراب نہیں پیتا" فضل بولا۔

"ارے تجھے کون دے رہا ہے، یہ اس سی بی آر والے کو دینا جس سے تم انفرمیشن لو گے، ارے بہت سے پاکستانی شراب کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہیں، جسے ایک بوتل دے دو گے اس سے جو مانگو گے دے دے گا، آزما کے تو دیکھو!"

فضل شراب کی وہ بوتل لئے جو دت نے اخبار کے کاغذ میں لپیٹ کر دی تھی باہر آ گیا۔

میں نے فضل سے کہا کہ جب دوسری دفعہ جاؤ تو کہہ دینا کہ "مجھے تو بہت ڈر لگتا ہے میرا کوئی جاننے والا سی بی آر میں نہیں ہے، اس لئے فی الحال یہ اطلاع نہیں دی جا سکتی لیکن کوشش جاری رکھوں گا۔" ظاہر ہے تانبا اسلحہ بنانے کے کام آتا ہے اور وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ کس نے کتنا درآمد کیا اور اس میں سے سرکار نے کتنا منگوایا۔

فضل کے اس بیان کو تسلیم کر لیا گیا اور مسٹر دت نے اسے بچوں کی مٹھائی کے لئے تین سو روپے پیش کئے۔ فضل بہترین اداکاری کر رہا تھا اور مسٹر دت کو کامیابی سے جل دے

رہا تھا۔

انہیں دنوں ویزا سیکشن کے فرسٹ سیکرٹری کا تبادلہ ہو گیا اور مسٹر دت نے فضل کو سیکنڈ سیکرٹری سے متعارف کروا دیا۔ سیکنڈ سیکرٹری نے بھی فضل سے دوستی کا انداز اپنایا اور ساتھ ساتھ اسے اس کا گریڈ بڑھانے اور زیادہ پیسے دینے کا لالچ بھی دیا اور کہا کہ اگر باقاعدہ طور سے کام کرو گے تو تمہاری زندگی بڑی آسان اور پر رونق گزر سکتی ہے۔ فضل نے اس سے ہر خدمت کرنے کا وعدہ کر لیا۔ فضل اب چونکہ باقاعدہ طور پر ایجنٹ بھرتی ہو رہا تھا اس لئے اس سے ایک فارم پر کروایا گیا جس میں اس کی اور اس کے خاندان کی تمام تر تفصیلات درج کرنا تھیں۔ فضل کی تنخواہ پانچ سو روپیہ ماہانہ طے پائی اور یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ بغیر کسی کام کے ویزا آفس آنا خطرناک ہو سکتا ہے لہٰذا اب خفیہ ملاقاتوں کا سلسلہ ویزا آفس کے بجائے دوسرے مقامات پر جاری رکھا جائے گا۔

یہ ملاقاتیں معمول کے مطابق ہوتی رہیں اور فضل ہمیں ہر ملاقات کی تفصیل بتاتا رہا۔ ہمیں ان ملاقاتوں کی نگرانی کی ضرورت اس لئے نہیں تھی کہ فضل ڈبل ایجنٹ کے طور پر اپنا کردار بہترین انداز میں نبھا رہا تھا۔ وہ دیانت داری اور ہمارے بھرپور اعتماد کے مطابق اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس کی وطن پرستی کسی بھی شک و شبہے سے بالاتر تھی اور یوں ہم اس کے والدین کو بھی اعتماد میں لے چکے تھے۔ ہم نے متعدد بار اس کی دی گئی معلومات کو کاؤنٹر چیک بھی کیا جو سو فیصد درست ثابت ہوئیں۔ اس کی مہیا کی گئی رپورٹوں سے ہمیں بھارتی سفارتخانے میں بھارتی خفیہ ایجنٹوں اور ان کی سرگرمیوں کے بارے میں کارآمد اطلاعات ملیں اور ہم ان کی مدد سے اپنے ریکارڈ کو اپ ڈیٹ UPDATE کرتے رہے۔

چند ملاقاتوں کے بعد فضل کو چھوٹی موٹی معلومات پہنچانے کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا گیا اور اب اسے اپنی توجہ پاکستان کے ایٹمی توانائی کے شعبے کی طرف مبذول کرنے کی ہدایت دی گئی۔ یہ ہدایت ہماری توقع کے عین مطابق تھی۔ ہمیں علم تھا کہ اب تک فضل کی صرف ٹریننگ کی جا رہی تھی اور بھارتیوں کا اصل ٹارگٹ پاکستان اٹامک انرجی کمیشن تھا۔

معمول کا کھیل جاری تھا کہ ایک روز ہمارے ادارے میں اعلیٰ سطح پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس سلسلے میں مزید پیش رفت خطرناک ہو سکتی ہے اور اب ہمیں مزید رسک نہیں لینا چاہئے۔ اب تک ہم بھارتی سفارتخانے میں ان کے خفیہ ایجنٹوں کو شناخت کر چکے تھے اور ان کی پاکستان دشمن سرگرمیوں کے ناقابل تردید ثبوت بھی حاصل کر چکے تھے۔

ہماری رپورٹ پر دفتر خارجہ نے مسٹر دت اور ان کے سیکنڈ سیکرٹری کو ناپسندیدہ شخصیت

قرار دے کر پاکستان سے نکل جانے کا حکم سنا دیا' مگر بدلے میں نئی دلی میں ہمارے قونصلر ایس ایم ذوالفقار اور سیکنڈ سیکرٹری مجیب کو بھی ناپسندیدہ سفارتکار قرار دے کر پاکستان بھیج دیا گیا۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے یہ سفارتکار بے گناہ تھے مگر عالمی سطح پر کسی بھی ایسے عمل کا ردعمل یہی ہوتا ہے جس کا مظاہرہ بھارت کے دفتر خارجہ نے کیا تھا۔

ایک محب وطن پاکستانی فضل نے بغیر کسی معاوضے کے اپنے ملک و قوم کی بیش بہا خدمت کی۔ سردی ہو یا گرمی' رات ہو یا دن' عید ہو یا رمضان فضل بہت لگن اور محنت سے کام کرتا رہا۔ یقیناً پاکستان ایسے محب وطن سرفروشوں ہی کی سرزمین ہے۔



بھارتی ماتا ہری

ماتا ہری کا نام جاسوسی کی تاریخ میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ پیشے کے لحاظ سے تو ایک رقاصہ تھی، مگر اس نے پہلی جنگ عظیم کے دوران جرمنی کے لئے اپنے اس "فن" کے ذریعے جاسوسی کے میدان میں یادگار خدمات انجام دیں۔ مگر بالآخر وہ اتحادیوں کے ہتھے چڑھ گئی اور فرانسیسیوں نے اسے گولی کا نشانہ بنا کر انجام کو پہنچا دیا۔ ماتا ہری کا کردار جاسوسی کی دنیا میں ایک لیجنڈ اور سیکس سمبل کے طور پر آج بھی جانا جاتا ہے۔ کچھ اسی نوعیت کی ایک بھارتی دوشیزہ سے ہمارا واسطہ پڑا اور اس کا کردار ہمارے ریکارڈ میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑ گیا۔

اسلام آباد میں دنیا کے متعدد سفارتخانوں نے اپنے عملے کے بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت کی غرض سے ایمبیسی سکول کھول رکھے ہیں۔ خاص طور پر ان ممالک نے جن کے عملے کی تعداد زیادہ ہے اور طالب علم بھی کافی تعداد میں ہیں۔ یہ سلسلہ دنیا کے تقریباً سبھی ممالک میں موجود ہے اور بظاہر کسی حوالے سے بھی سفارتی آداب اور قواعد کے خلاف نہیں۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان سکولوں میں محض درس و تدریس کا کام ہی نہیں ہوتا بلکہ ان سکولوں کے عملے کے کئی ارکان کو تعلیمی سرگرمیوں کی آڑ میں جاسوسی کے کام پر بھی مامور کیا جاتا ہے۔ یا تربیت یافتہ جاسوس اساتذہ کے ظاہری روپ میں ان سکولوں میں تعینات کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ ایمبیسی سکول دراصل سفارتخانے کی عمارت سے جدا ایک ایسے بیس base کے طور پر استعمال ہوتے ہیں جہاں نہ صرف خفیہ سرگرمیوں کی نگرانی احسن طریقے پر ہو سکے بلکہ تخریب کاری اور دہشت گردی کی کارروائیوں کے منصوبے بھی باآسانی عمل میں لائے جا سکیں۔ اساتذہ کے روپ میں تعینات کئے گئے خفیہ ایجنٹ ہمہ وقت میزبان ملک کے خلاف کسی بھی خفیہ کارروائی کے لئے تیار رہتے ہیں اور یہ سکول ان ایجنٹوں کو مکمل تحفظ اور سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔ خفیہ ایجنٹ اسی طرح کے دوسرے اداروں مثلاً ایئر لائنز کے دفاتر، ہوٹلوں، لینگویج سینٹرز، ایوان ہائے ثقافت و دوستی اور مراکز اطلاعات میں بھی تعینات کئے جاتے ہیں۔

ہمیں اپنی معمول کی چیکنگ کے دوران اسلام آباد میں قائم انڈین ایمبیسی سکول کی ایک مس وینا کی سرگرمیاں کچھ مشکوک نظر آئیں۔ مسلسل نگرانی کے بعد ہمیں پتہ چلا کہ سکول کی تدریسی سرگرمیوں میں تو وہ کم حصہ لیتی ہے مگر اکثر اوقات "شکار" کی تلاش میں اسلام آباد کے چند گھروں میں دکھائی دیتی ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ مس وینا کا بھارتی سفارتخانے کے ڈیفنس اتاشی اور "را" کے فرسٹ سیکرٹری سے مستقل رابطہ ہے۔ یہ دونوں پاکستان کے دفاعی اور ایٹمی راز معلوم کرنے کے درپے تھے' اور بھارتی ماتا ہری ان کی ہدایات پر کام کرتی تھی۔

مس وینا کی عمر 25 یا 26 سال کے لگ بھگ تھی' مگر دیکھنے میں وہ 18 یا 19 سال کی بے ضرر اور معصوم سی لڑکی لگتی تھی۔ ستواں ناک' کتابی چہرہ' کھلتا ہوا رنگ' انتہائی متناسب جسم' چال ڈھال میں ایک خاص قسم کا بانکپن' اور گفتگو کا مخصوص انداز' اس کے خطرناک ہتھیار تھے۔ اس کی خاموش نظریں بھی گہرائیوں تک سرایت کرتی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کے چہرے پر ہمہ وقت ایک ہلکی سی مسکراہٹ تو رہتی لیکن اس کی نظروں میں ایک ایسی اداسی بھی دکھائی دیتی تھی جیسے صدیوں پرانا ایک محل اپنی لٹی ہوئی تابناکیوں' خوشیوں اور روشنیوں کے لوٹ آنے کے کربناک انتظار میں ہو' جیسے وقت کے بے رحم ہاتھ لحہ بہ لحہ اسے ریزہ ریزہ کر رہے ہوں یا جیسے اک تھکن سے چور چور مسافر جو اپنی منزل کا نام بھی بھول چکا ہو مگر پھر بھی ایک لامتناہی سفر پر ہو۔ مس وینا کا بدن اور روح بھی ایک دوسرے سے جدا جدا' گم سم کسی انجانی منزل کی تلاش میں رہتے۔

مزید معلومات کے لئے ہم نے ایک پاکستانی ہندو لڑکے کو انڈین ایمبیسی سکول میں داخلہ دلوایا۔ اس کی ماں نے ہماری ہدایات پر یہ ظاہر کیا کہ وہ اپنے بچے کی تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں بے حد متفکر ہے اور وہ ان سرگرمیوں کے بارے میں آگاہ رہنا چاہتی ہے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے روز سکول جانے لگی اور یوں آہستہ آہستہ مس وینا کے ساتھ دوستی استوار کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ جلد ہی ان کی دوستی سکول کی حدود سے نکل کر گھر اور مارکیٹ تک آ گئی۔ وہ متواتر ایک دوسرے کو ملتیں' شاپنگ اکٹھے کرتیں' سینما جاتیں اور اسلام آباد کے تفریحی مقامات پر اکٹھے گھومنا پھرنا بھی ان کا معمول بن گیا۔ وینا اس محترمہ کو شکار کر کے اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہ رہی تھی اور یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ معصوم شکار خود اس کا شکاری ہے۔

کچھ ہی عرصے بعد ہمارے اس شک کی تصدیق ہو گئی کہ مس وینا کا سکول کی تدریسی

سرگرمیوں میں کوئی کردار نہیں۔ وہ بھارتی جاسوس ہے اور ہمہ وقت اپنے آقاؤں کے حکم کی بجا آوری میں "مشن" کے لئے تیار رہتی ہے۔ اب ہماری نظریں اس کی آمد و رفت اور روزمرہ کی مصروفیات پر مذکور ہو گئیں اور ہم اس انتظار میں تھے کہ وینا کے پھینکے ہوئے کانٹے میں کونسی "پاکستانی مچھلی" پھنستی ہے۔

ایک روز بھارتی ایمبیسی کی جانب سے اسلام آباد کے ایک بڑے ہوٹل میں کمرہ بک کروایا گیا۔ یوں تو یہ ایک معمول کی بات تھی مگر سفارتخانے کے مہمانوں کی شناخت اور ان کے بارے میں جاننا ہمارے فرائض میں شامل تھا۔ ہوٹل سے ہمارے آدمی نے اطلاع دی کہ مس وینا بھارتی ڈیفنس اتاشی کی گاڑی میں سفارتخانے کے عملے کے ایک رکن مسٹر کھنہ کے ساتھ جو "را" کی ٹیم کا ممبر بھی تھا' ہوٹل پہنچی ہے۔ اور کھنہ' وینا کو ہوٹل کے کمرے میں چھوڑ کر لابی میں بیٹھا شاید کسی مہمان کا منتظر ہے۔ ہم نے ایئرپورٹ سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس وقت کوئی جہاز نہیں آ رہا اور نہ ہی بھارتی سفارتخانے کی کوئی کار ایئرپورٹ گئی ہے' اس سے ظاہر ہوا کہ "مہمان" کوئی یہیں کا ہے۔ ہم نے سیٹی بجا دی اور ہماری ٹیم نے ضروری ساز و سامان کے ساتھ اپنی پوزیشن سنبھال لی۔

چند لمحوں کے بعد پرویز نامی ایک پاکستانی نوجوان' جس کے چہرے سے سراسیمگی اور خوف ٹپک رہا تھا ہوٹل کی لابی میں داخل ہوا۔ مسٹر کھنہ نے آگے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور کہا' "آئیے پرویز صاحب ہم تو آپ کے دیر سے منتظر ہیں" اور اسے اس کمرے میں لے گیا' جہاں وینا آنے والے لمحوں کے تانے بانے بن رہی تھی۔ وقت ضائع کئے بغیر ہمارے ساتھیوں نے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق کپڑے تبدیل کئے اور مختلف روپ دھار کر اپنے اپنے ڈیوٹی کے مقام پر پہنچ گئے۔

توقع کے عین مطابق کمرے سے روم سروس کو انٹرکام پر چائے اور سینڈویچز کا آرڈر دیا گیا۔ ہمارا تربیت یافتہ "ویٹر" فوری طور پر چائے کی ٹرالی لے کر روانہ ہو گیا' جس میں ایک چھوٹا سا ٹرانسمیٹر نصب تھا۔ واپسی پر "ویٹر" نے بتایا کہ وینا اپنے مہمان پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے لئے بے چین ہے مگر اس کا مہمان سہما ہوا اور شرمیلا سا ہے' جبکہ مسٹر کھنہ دلالوں کا روایتی کردار ادا کر رہا ہے اور اس کی کوشش ہے کہ مس وینا اپنے مہمان کے تمام حواس پر قبضہ کر لے۔ بہرحال ہم ٹرالی میں لگے ٹرانسمیٹر کی مدد سے ان لوگوں کی گفتگو سن رہے تھے اور اسے ریکارڈ بھی کر رہے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد کھنہ کمرے سے باہر آ گیا اور اپنی کار میں بیٹھ کر واپس ایمبیسی چلا

گیا۔ اس کے چہرے کی بشاشت بتا رہی تھی کہ شکار پنجے میں آ چکا ہے اور چند ہی لمحوں میں وینا اس کا جھٹکا کر کے اس کے کباب بنا لے گی۔

بہرحال مس وینا اور پرویز کی گفتگو رسمی تعارف تک ہی محدود رہی۔ پرویز کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر رہا اور گھبرایا ہوا ہے۔ مگر وینا اس مہم کو سر کرنے کے لئے اس پر تابڑ توڑ اور خطرناک حملے کر رہی تھی۔ وینا کے لئے اپنے اعلیٰ افسران پر اپنی کارکردگی ثابت کرنے کا شاید یہ بہترین موقع تھا اور وہ کسی صورت بھی یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ٹرانسمیٹر سے تیز سانسوں کی آواز آنے لگی اور بالآخر یہ تلاطم ختم گیا۔ پرویز شاید ذبح ہو چکا تھا۔

پرویز تقریباً آدھ گھنٹہ کمرے میں رہا اور وینا کو اپنا ایڈریس لکھوا کر اور وصل کا ایک اور وعدہ لے کر نیچے آگیا' مگر اس کی حرکات و سکنات سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی گھبراہٹ جوں کی توں ہے۔ ہوٹل سے نکلتے ہی ہم نے اس کا پیچھا کیا اور اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر اپنے ریسٹ ہاؤس لے گئے۔ ایک لمحے میں اس کے سارے حسین خواب منتشر ہو گئے۔

تفتیش شروع ہوئی تو وہ اپنی شناخت کرانے سے ہچکچا رہا تھا۔ نتیجتاً ہم نے وینا کے ساتھ اس کی گفتگو کی ریکارڈنگ اسے سنائی تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس نے بچوں کی طرح رونا شروع کر دیا اور معافی مانگنے لگا۔ اس نے بتایا کہ "میں پاکستان اٹامک انرجی کمیشن میں انجینئر ہوں اور کھنہ کے ساتھ میری ملاقات لاہور سے اسلام آباد آتے ہوئے ایک بس میں ہوئی تھی۔ ہم بہت جلد دوست بن گئے اور کھنہ نے مجھے ایک خوبصورت ہندو لڑکی سے ملوانے کی پیشکش کی جسے میں ٹھکرا نہ سکا۔" ہمارے لئے اس میں حیرت کی کوئی بات نہ تھی کہ بھارتی خفیہ اداروں نے چانکیا کی تعلیمات کے مطابق رنڈیوں سے جاسوسی کا کام لینے کو بھی اپنے کلچر کا حصہ بنا رکھا تھا۔ اس کھیل کو آگے بڑھانے کے لئے ہمارے پاس اور بہت سے راستے تھے۔ پہلے ہم نے سوچا کہ پرویز سے ڈبل ایجنٹ کا کام لیا جائے مگر بعدازاں اس کی ملازمت کی حساس نوعیت کو دیکھتے ہوئے ہم نے اپنا ارادہ منسوخ کر دیا تاہم اس واقعہ کی ایک رپورٹ اس کے متعلقہ محکمے کو بھجوا دی گئی اور پرویز کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔

بہرحال پرویز سے ملاقات کے بعد مس وینا ابھی ہوٹل کے کمرے میں موجود تھی۔ یا تو وہ کھنہ کا انتظار کرتی یا پھر ایمبیسی فون کرتی کہ ہوٹل میں میری ڈیوٹی پوری ہو گئی ہے اور

مجھے آکر یہاں سے لے جایا جائے۔ اب ہمارے پاس ہوٹل کا محاذ ہی تھا' اور وقت بہت کم۔ وینا تک رسائی حاصل کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ وہ ہمارے کسی بھی اہلکار کی کمرے میں موجودگی کی صورت میں الارم بجا سکتی تھی اور ہمارے لئے ایک پیچیدہ سفارتی تنازعہ پیدا ہو سکتا تھا۔ دوسری جانب یہ ایک ایسی صورتحال تھی جس سے فائدہ نہ اٹھانا ہماری "مخفیہ روایات" کے خلاف تھا۔ کسی بھی رسک کی صورت میں کامیابی کی توقع ففٹی ففٹی تھی۔ تاہم مس وینا کی شخصیت اور کردار کو سامنے رکھ کر ہمیں اس بات کا یقین تھا کہ اگر اس صورت حال میں مہارت اور چابکدستی سے کام لیا جائے تو اس بھارتی ماتا ہری کو شیشے میں اتارنا مشکل نہ ہو گا۔ ہمارے لئے یہ ملین ڈالر چانس تھا جسے آزمایا جا سکتا تھا۔ ہم نے لمحوں میں حتمی فیصلہ کیا اور کچھ ہی دیر بعد ہمارے روم سروس والے اسی ویٹر نے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ بظاہر وہ چائے کی ٹرالی واپس لینے گیا تھا۔ پلان کے مطابق اس نے کمرے کا دروازہ کھلا رکھا' وینا سے رسمی سلام دعا کی اور اس اثناء میں ہمارا کیس افسر بھی کمرے میں پہنچ گیا۔ یہ حکمت عملی اس لئے اختیار کی گئی تھی تاکہ وینا اپنے سفارتخانے فون نہ کر سکے۔ اگر کھنہ خود آ جاتا تو اس صورت حال کے لئے بھی ہمارا ایک آدمی تیار تھا۔

منصوبے کے مطابق کیس آفیسر ہوٹل کے سیکورٹی ایگزیکٹو کے روپ میں کمرے میں داخل ہوا۔ اپنا تعارف کروایا اور ہوٹل کی سروس کے بارے میں معمول کی گفتگو کرنے لگا۔ وینا کو ذرا برابر شک نہ گزرا۔ اس کے لئے سب معمول کی بات تھی۔ وہ انتہائی مطمئن اور خوشگوار موڈ میں تھی۔ ہمارے افسر نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بھارتی ساڑھیوں' فلموں کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔ وینا نے اس گفتگو میں دلچسپی لینی شروع کر دی اور ہمارے آفیسر کو بیٹھنے کے لئے کہا۔ "ویٹر" ٹرالی لے کر چلا گیا اور گفتگو کا موضوع ذاتی معلومات تک آ گیا۔ ہمارا وار کارگر ثابت ہوا۔ وینا جلد ہی ہمارے کیس آفیسر کو تم تم کہنے کی حد تک آ گئی۔ وہ باتوں میں اس قدر محو ہو گئی کہ اسے سفارتخانے فون کرنا بھی یاد نہ رہا۔

ادھر کھنہ اور اس کے افسران بالا یقینی طور پر اس بات پر جام مسرت پی رہے ہوں گے کہ بالآخر انہوں نے پاکستان اٹامک انرجی کمیشن سے ایک بڑی مچھلی کو اپنے جال میں پھنسا لیا تھا۔ آہستہ آہستہ ہمارے آفیسر کا لہجہ تبدیل ہو گیا اور اس کی گفتگو معنی خیز ہوتی گئی۔ جب وینا کو احساس ہوا کہ ہوٹل کے اس آفسر کو وینا کی اس کمرے میں آمد اور اس کے مقاصد سے پوری طرح آگاہی ہے تو وینا کی صورت ایک ایسے مجبور' بے کس اور بھوکے بچے کی سی ہو گئی جسے بیکری سے ڈبل روٹی چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہو۔ اس کی

آنکھیں بھر آئیں اور اس کی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ وینا نے اپنی داستان حیات سنانا شروع کر دی۔

"میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ میرے والدین نے میری پرورش اپنی انتہائی غربت اور کسمپرسی کے باوجود بڑے ناز و نعم سے کی۔ میں نے دو ہی سال پہلے گریجویشن کی ہے۔ جہیز کی لعنت سے تو آپ اچھی طرح آگاہ ہیں۔ میرے خیال میں پاکستان میں بھی یہ لعنت ابھی تک موجود ہے جس کی وجہ سے ہزاروں لڑکیاں اپنے بالوں میں چاندی کے تاروں کا اضافہ کئے ماں باپ کی دہلیز پر بیٹھی ہیں' بھارت میں بھی بہت سی لڑکیاں معاشرے کی اس دلدل میں پھنسی ہوئی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ٹیچر بنوں گی مگر کوشش کے باوجود مجھے نوکری نہ مل سکی۔ پھر ایک روز میری ایک دوست کے خاوند نے مجھے اپنے ایک دوست سے یہ کہہ کر متعارف کروایا کہ یہ ایک اعلیٰ سرکاری افسر ہیں۔ اور تمہارے لئے ملازمت کا بندوبست کر سکتے ہیں' بعد میں مجھے علم ہوا کہ ان کا تعلق بھارتی انٹیلی جنس سے ہے' انہوں نے میرا سرسری سا انٹرویو لیا اور مجھے بتایا کہ میں تمہارے لئے نوکری کا انتظام کر سکتا ہوں' مگر یہ نوکری بھارت میں نہیں پاکستان میں بھارتی ایمبیسی سکول میں ہو گی۔ یہ الفاظ میرے لئے انتہائی خوش کن تھے۔ میرے لئے کسی دوسرے ملک میں جانے کا تصور ہی انتہائی دلکش تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ نوکری کا بندوبست تو ہو گیا ہے مگر پاکستان چونکہ ہمارا دشمن ملک ہے اس لئے تجھے چند ماہ کے لئے سیکورٹی ٹریننگ پر جانا پڑے گا۔ میں اس کے لئے بھی تیار ہو گئی۔ دراصل مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ مجھے بیرون ملک ملازمت مل رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مجھے ایک ایسی سرزمین دیکھنے کا موقع بھی مل رہا تھا جس کے بارے میں میں نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔

چند روز بعد ایک شخص ہمارے گھر آیا۔ اس نے مجھے تقرری کا خط دیا۔ اور کہا کہ اگلے روز تجھے سیکورٹی ٹریننگ سکول لے جانے کے لئے میں خود آؤں گا۔ وہ حسب وعدہ اگلے روز پھر آیا۔ میں اپنے والدین سے رخصت ہو کر اس کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو گئی۔ ایک طویل سفر کے بعد ہم اپنی منزل پر پہنچے۔ یہ ایک پراسرار عمارت تھی اور دیکھنے میں سکول یا تربیت گاہ ہرگز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میرے علاوہ وہاں چار اور لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ جب کورس شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ اس میں کسی ٹیچر کی نہیں بلکہ جنگ کی تربیت دی جا رہی ہے۔ چند ہی دنوں میں پتہ چل گیا کہ اصل میں ہم ٹیچر نہیں بلکہ جاسوس بنا کر بھیجی جا رہی ہیں۔

ہمارے تربیتی سلیبس میں جسمانی ورزش' ہتھیاروں کے استعمال کا طریقہ اور ایسے لیکچر شامل تھے جن کا مقصد پاکستان کے خلاف شدید نفرت پیدا کرنا تھا۔ علاوہ ازیں اپنے "شکار" کو ذہنی طور پر اپنا تابع بنانا اور خفیہ راز معلوم کرنا بھی ہماری تربیت کا اہم حصہ تھا۔ ہمیں بلیو فلمیں دکھا کر بھی بتایا جاتا کہ کسی بھی مضبوط سے مضبوط اعصاب کے مرد کو کس طرح اپنا اسیر بنایا جا سکتا ہے۔ ہمیں جنسی اختلاط کے مختلف طریقے بھی بتائے جاتے تاکہ ہماری کارکردگی میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ درحقیقت ہمیں باعزت طور سے جسم فروشی کی تربیت دی گئی۔ اور ہمیں بتایا گیا کہ ایک کامیاب جاسوس بننے کے لئے اپنی جسمانی خوبصورتی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا ہی اصل ہنر ہے۔ ہم میں سے کسی کو بھی اس تربیت سے اتفاق نہیں تھا مگر اب ہمارے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہم پوری طرح اپنے "محسنوں" کے جال میں پھنس چکی تھیں۔ میں جانتی ہوں آج پاکستان میں جو کچھ بھی کر رہی ہوں اخلاقیات کے مروجہ ضوابط کے خلاف ہے اور کوئی بھی باضمیر انسان اس دلدل میں کودنے کی جرات نہیں کر سکتا مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اب میرا اپنا وجود' میرے والدین' میرا گھر' میرا ضمیر' میری خواہشیں' میرے مستقبل کے سہانے خواب' سب کچھ داؤ پر لگ چکا ہے۔ اب اگر میں چاہوں بھی تو ان کے چنگل سے نکل نہیں سکتی اور جب تک میرے جسم میں ذرا سی بھی کشش باقی رہے گی یہ لوگ مجھے استعمال کرتے رہیں گے۔"

وینا یوں بات کر رہی تھی جیسے دور ویرانوں میں بھٹک رہی ہو اور اسے کوئی راستہ نہ سوجھ رہا ہو۔ اپنی کہانی سناتے سناتے اس نے کہا:

"حد تو یہ ہے کہ اس تربیت کے دوران ہمارے انسٹرکٹر بھی ہمارے جسموں کو اپنی مکروہ خواہشات کی تکمیل کے لئے روندتے رہے اور ہماری تربیت مکمل ہونے تک ہماری عصمت کی چادریں بار بار تار تار ہوتی رہیں۔ تربیت کا یہ حصہ رات کے کھانے کے بعد شروع ہوتا تھا۔ ہمیں باری باری' مختلف مردوں کے ساتھ جنسی اختلاط پر مجبور کیا جاتا۔ ہمیں عملی طور پر مرد کی حیوانی جبلت پوری کرنے کا سلیقہ سکھایا جاتا۔ شروع میں تو ہر عمل ہمارے لئے ایک مستقل عذاب کی مانند تھا اور ہم نے اس پر کئی بار احتجاج بھی کیا' لیکن ان کا کہنا تھا کہ تمہارے لئے یہ تربیت انتہائی ضروری ہے اور تمہیں ملک و قوم کے عظیم تر مفاد کے لئے سب کچھ قربان کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہنا چاہئے"۔

وینا کی کہانی سن کر بہت دکھ ہوا۔ ہم نے بڑی مہارت سے وینا کی ٹوٹی پھوٹی شخصیت کو بحال کیا اور اسے وہ تمام عزت اور غیرت مہیا کی جو وہ کھو چکی تھی۔

وینا نے جب ہمارے حسن سلوک کا اپنے ہندو آقاؤں کے کردار سے موازنہ کیا تو اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہ رہا کہ اسے اپنے نام نہاد وطن پرست دوستوں کے بجائے اپنے "دشمنوں" کا ساتھ دینا چاہیے۔ نفسیاتی طور پر ہم نے اس بھارتی ماتا ہری کے کچلے ہوئے ضمیر میں زندگی کی نئی روح پھونک دی۔ ہم نے اسے پیسے دیئے۔ بھارت میں اس کے والدین کی دیکھ بھال کا ذمہ بھی لیا' اسے عزت نفس دی اور جسمانی اور روحانی پاکیزگی کے سبق دیئے۔ چنانچہ وینا دل و جان سے پاکستان کی ہو گئی۔

ڈبل ایجنٹ کی حیثیت سے وینا نے ہمارے لئے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اس نے ہمارے بعض منصوبوں کی تکمیل میں ہمارا بھرپور ہاتھ بٹایا اور انتھک محنت کی۔ وینا کی وجہ سے ہمیں ہر وقت بھارتی سفارتخانے میں ہونے والے واقعات' حالات' ان کے خفیہ ایجنٹوں' ان کے طریقہ کار اور اہداف کی خبر رہنے لگی۔ ان اطلاعات کی بناء پر ہم نے ان کے بہت سے ایسے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا جن کی تفصیل یہاں بیان نہیں کی جا سکتی۔

وینا کو جب پاکستان سے وطن واپسی کے احکامات موصول ہوئے تو وہ بے حد افسردہ اور غمگین تھی۔ وہ ہمیشہ کے لئے پاکستان میں رہنے' یہاں شادی کرنے اور اسلام قبول کرنے کو تیار تھی' مگر ہم اس کے لئے کوئی مناسب "شوہر" تلاش نہ کر سکے۔ وہ دل پر بھاری پتھر رکھے پاکستان سے روانہ ہو گئی۔ بہرحال پاکستان سے جانے سے پہلے وہ ایک مکمل انسان ہی نہیں بلکہ عزت و وقار کے زیور سے آراستہ اور مالی طور پر اتنی خوشحال ہو چکی تھی کہ ہمیں یقین ہے اس نے بھارت پہنچتے ہی اپنے آپ کو "را" سے جدا کر لیا ہوگا اور اب کہیں با عزت زندگی بسر کر رہی ہوگی۔



لمحوں کی جنگ

حضرت علیؓ شیر خدا نے اپنے دور خلافت میں مصر کے نامزد گورنر مالک اشتر کے نام ایک خط لکھا جس میں حکومت کے ایسے رموز لکھ دیئے جو ہر دور میں ہر حکمران کے لئے بیش بہا خزانے کی اہمیت رکھتے ہیں اور اگر حکمران ان احکامات پر عمل کریں تو حکومت عین حکم الٰہی کے مطابق ہو گی۔ اس خط کے چند مندرجات جو فوج سے متعلق ہیں' پیش کئے جا رہے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہماری افواج سلطنت اسلامیہ اور اللہ اور اس کے رسولؐ کا کلمہ پڑھنے والے مسلمانوں کے لئے ایک ناقابل تسخیر قلعے کا درجہ رکھتی ہیں۔ انہیں مملکت کے لئے باعث وقار اور خلیفہ کی عزت میں اضافہ کا باعث ہونا چاہئے۔ اسلامی فوج امن کی ایک جیتی جاگتی علامت ہے اور مسلمانوں کو اس کے سائے میں پھلنے پھولنے کا ہر موقع مہیا ہونا چاہئے۔

اسلامی فوج کے تمام اخراجات اللہ کے حکم پر حاصل کئے گئے ٹیکسوں کی ان رقوم میں سے پورے کئے جائیں جن میں خدا نے پہلے ہی مسلمانوں کے ان محافظوں کا حصہ مقرر کر رکھا ہے۔ ان سپاہیوں کی تمام پیشہ ورانہ ضروریات اور انہیں ہر طرح کے ہتھیاروں سے لیس کرنے کے اخراجات بھی اس فنڈ سے پورے کئے جائیں' تاکہ وہ اللہ کی راہ میں انصاف کی بالادستی کے لئے اپنا جہاد جاری رکھ سکیں۔

جہاں تک افسروں کا تعلق ہے ان کا خدا اور اس کے رسولؐ کے ساتھ مخلص ہونا بے حد ضروری ہے۔ ان کا رحمدل' پارسا' زبردست قوت برداشت کا حامل اور بردبار ہونا ان کے عہدوں کی لازمی شرط ہے۔ تحمل مزاج ہونا اور غصے کو برداشت کرنا ان کی اخلاقی قابلیت ہونی چاہئے۔ یہ کمزور اور بے بس لوگوں پر رحم کرنے والے' ان کے حقوق کی حفاظت کرنے والے مگر طاقتور اور ظالم کے خلاف ایک مضبوط ڈھال کی مانند ہونے چاہئیں۔ یہ نہ تو بدلے کی آگ میں جل کر راکھ ہونے والے ہوں اور نہ ہی دشمن کے مقابلے میں اپنی کسی عسکری

کمزوری سے مایوسی اور بددلی کا شکار ہوں۔

مالک اشتر' تم ایسے افسروں کی تلاش کے لئے بہادری اور رحمدلی کے لئے مشہور خاندانوں کے ساتھ روابط بڑھاؤ اور ان میں سے ایسے باکردار اور صالح افراد کو تلاش کرو جو اسلامی فوج کی آبرو میں اضافہ کریں۔ ایک بار جب ایسے افراد کا انتخاب ہو جائے تو پھر ان کے علاوہ ان کے بچوں پر بھی نگاہ رکھو کہ کہیں وہ افسری پانے کے بعد اپنے کردار کی خوبیوں سے بے بہرہ تو نہیں ہو رہے۔

اگر وہ کسی اعزاز یا مراعات کے مستحق ہیں تو انہیں یہ اعزاز بخشنے میں دیر نہ کرو۔ اور ان کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کو کبھی رد نہ کرو۔ ان کی بہادری اور دلیری کی تعریف کرنے میں کبھی بخل سے کام نہ لو۔ یوں تمہاری تعریف اور توصیف اور ان کے کارناموں کو بار بار دہرانے سے فوج کے کمزور شعبوں میں خود کو مضبوط اور اس توصیف کے لائق بنانے کا جذبہ پیدا ہو گا۔

یہ کبھی نہ سوچنا کہ ان کے بڑے بڑے مسائل حل کرنے کے بعد ان کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کو نظرانداز کیا جا سکتا ہے' کبھی کبھی معمولی سی نیکی بھی شاندار نتائج کا باعث بنتی ہے۔ ان افسروں کو تمہاری جانب سے زیادہ توجہ اور سرپرستی کی ضرورت ہے جو اپنے ماتحتوں کی فلاح کا خیال رکھتے ہیں اور ان کے مورال کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسلامی فوج کے سپاہیوں کو دی جانے والی مراعات اور تنخواہ اتنی پرکشش ہونی چاہئے کہ ان لوگوں کو اپنے بچوں اور خاندانوں کی کفالت کی فکر نہ رہے جنہیں وہ پیچھے چھوڑ کر اسلامی فوج کے سپاہی بنے ہیں۔ یاد رکھو! فکر معاش سے آزاد سپاہی' اللہ کی راہ میں بھرپور جہاد کرتا ہے اور اس کی یہی یکسوئی اسے ایک انجانی طاقت سے سرفراز کرتی ہے۔"

اب ایک اہم واقعہ۔

یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب ہمارے ہاں تکنیکی سہولیات کا یہ عالم تھا کہ ہمارے پاس زیر نگرانی افراد اور اداروں کے ٹیلی فون ٹیپ کرنے اور براہ راست ان کی ریکارڈنگ کے لئے معمول کے وہ آلات بھی نہیں تھے' جو کسی بھی خفیہ ادارے میں انفارمیشن کی فیلڈ میں بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہمیں بڑی تگ و دو کرنا پڑتی تھی اور انتہائی محدود سہولیات سے کام چلانا پڑتا تھا۔ ان حالات میں کسی اہم انفارمیشن کا حصول محض اتفاق یا قسمت کی بات ہوتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ ان سہولتوں کے فقدان کی

وجہ سے ہم اپنی صلاحیتوں کا سو فیصد استعمال کرنے میں ناکام رہے تاہم اگر کبھی ہمارے نوٹس میں ایسی کوئی اطلاع آ جاتی تو صرف اپنی بھاگ دوڑ سے مسئلہ حل کیا جاتا اور ہم اس اطلاع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے۔

میں نے اپنے ٹکنیکی محکمے کو اس بات کی خصوصی ہدایات دے رکھی تھیں کہ اگر کبھی وہ کوئی مشتبہ گفتگو سنیں تو مجھے وقت کی پرواہ کئے بغیر فوراً مطلع کریں' میری اس پالیسی نے متعدد کیسوں میں ہمیں اچھے نتائج سے بہرہ ور کیا۔

ایک دن دس بجے کے قریب ٹیلی فون مانیٹرنگ روم کے انچارج نے مجھے فون پر کہا "سر جلدی آیئے۔" میں سب کچھ چھوڑ کر اس کے کمرے میں گیا تو اس نے ہیڈ فون میرے کانوں سے لگا دیا۔ اور ٹیپ ریکارڈر کا PLAY بٹن دبا دیا۔ فون کی گھنٹی بجی۔ کسی نے فون اٹھایا دوسری جانب سے آواز آئی۔

"ہیلو! انڈین ایمبیسی"

"جی ہاں! یہ انڈین ایمبیسی ہے"

"کیا میں آرمی اتاشی بریگیڈیئر سنگھ سے بات کر سکتا ہوں؟"

"جی! میں بریگیڈیئر سنگھ بول رہا ہوں۔ فرمایئے میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

"جی میرا نام میجر فلاں فلاں ہے۔ میرے پاس آپ کے لئے ایک اہم انفارمیشن ہے۔ کیا ہم کہیں مل سکتے ہیں؟"

"دیکھئے! میجر اس فون پر بات کرنا مناسب نہیں ہے۔ آپ مجھے اپنا نمبر دیں۔ میں تھوڑی دیر میں آپ سے خود بات کرتا ہوں" بریگیڈیئر سنگھ نے جواب دیا۔

"میں لاہور سے فون نمبر۔۔۔ سے بول رہا ہوں" میجر نے اپنا فون نمبر لکھوایا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ انتظار کیجئے۔ میں تقریباً 15 منٹ بعد آپ کو فون کرتا ہوں۔" بریگیڈیئر سنگھ نے کہا اور فون بند ہو گیا۔

میں نے ہیڈ فون اتارا۔ یہ ہماری کارکردگی کا بہت بڑا امتحان تھا۔ ہمارے پاس صرف 12 منٹ باقی تھے اور یوں سمجھ لیجئے کہ یہ وقت کو شکست دینے والی بات تھی۔ میں نے فوری طور پر لاہور میں اپنے فیلڈ کمانڈر سے رابطہ قائم کیا اور اس کے لائن پر آتے ہی اسے فون نمبر لکھوایا اور کہا "کمانڈر اس نمبر کو تلاش کیجئے۔ اس کو ٹیپ کرنے کا بندوبست بھی کیجئے۔ لوکیشن پر پہنچئے۔ فون کرنے والے میجر صاحب کو اپنے دفتر میں لے آیئے اور مجھے اطلاع دیجئے۔ یاد رکھئے اس ساری کارروائی کے لئے آپ کے پاس صرف دس منٹ ہیں۔"

اسلام آباد میں ہمارے لئے بہرحال اس گفتگو کو ریکارڈ کرنا ناممکن تھا کیونکہ بریگیڈیئر سنگھ نے نہ جانے کس نمبر سے فون کرنا تھا۔ (خدا کمانڈر ذوالفقار پر اپنی رحمتیں نچھاور کرے کیونکہ اب وہ ہمارے درمیان نہیں)۔ انہوں نے میری ہدایات ملتے ہی بجلی کی سرعت کے ساتھ ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ کو معاملے کی نزاکت سے آگاہ کیا۔ اپنا آدمی فوری طور پر ٹیلی فون ایکسچینج روانہ کیا اور ابھی دس منٹ پورے ہونے میں چند سیکنڈ باقی تھے کہ وہ خود بھی حسب ہدایت موقع پر پہنچ گئے۔ ایک ہی منٹ کے بعد میجر صاحب کے فون کی گھنٹی بجی۔ دونوں جانب سے رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا۔ ایک دوسرے کو اپنی اپنی شناخت کرائی گئی اور دو روز کے بعد ملاقات کے لئے وقت اور جگہ کا تعین کیا گیا۔ تاہم بریگیڈیئر سنگھ نے اچھی طرح اس بات کی تسلی کرلی کہ کہیں میجر موصوف آئی ایس آئی کے بچھائے ہوئے کسی جال کا مکڑا نہ ہو۔

ابھی میجر نے ریسیور کریڈل پر رکھا ہی تھا کہ کمانڈر ذوالفقار نے اس کے دروازے پر دستک دے دی۔ اس سے اپنا تعارف کروایا اور گاڑی میں بٹھا کر اسے اپنے دفتر لے آئے۔ پھر اسے جی ایچ کیو کے ملٹری انٹیلی جنس ڈائریکٹوریٹ کے حوالہ کر دیا گیا تاکہ مفصل تفتیش کی جا سکے۔

تفتیش کے دوران اس نے بتایا کہ "میں آرمڈ کور کا آفیسر ہوں اور گذشتہ جنگ میں ستارہ جرات حاصل کر چکا ہوں۔ میں حال ہی میں کمانڈ اینڈ سٹاف کالج کوئٹہ سے کورس مکمل کر کے آیا ہوں اور اب کھاریاں چھاؤنی میں اپنی بریگیڈ میں واپس جا رہا ہوں۔" اس نے بتایا کہ "میں ان دنوں شدید مالی مسائل میں گرفتار ہوں جن سے نمٹنے کے لئے میں نے اپنے ستارۂ جرات کی رقم بھی جی ایچ کیو سے حاصل کر لی ہے' لیکن میری مالی دشواریاں بدستور قائم ہیں اور میں نے پیسے کمانے کا یہ ڈھنگ سوچا تھا کہ وقتاً" فوقتاً" بعض بے بنیاد اور جھوٹی معلومات انڈین آرمی اتاشی کو فراہم کر کے رقم بٹورتا رہوں۔" وہ بار بار اس بات کا یقین دلا رہا تھا کہ ملک کے اہم راز دشمن کے حوالے کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور یہ محض ایک "فاؤل پلے" تھا۔ مگر حکام اس کی اس کہانی پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اس کے کورٹ مارشل کا حکم ہوا اور اسے فوج کی نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔

جہاں تک آئی ایس آئی کا تعلق ہے یہ پورا عقابی آپریشن محض پندرہ منٹ میں پورا ہوا۔ بریگیڈیئر سنگھ نے یوں تو سمارٹ بننے کی پوری کوشش کی تھی مگر اس سے ایک ذرا سی چوک ہو گئی کہ وہ میجر موصوف سے فون نمبر پوچھ بیٹھا۔ یہ محض ہماری خوش بختی تھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو نہ جانے ہمیں اس تک پہنچنے کے لئے کتنی راتوں کی نیند اور کتنے دنوں کا

چین حرام کرنا پڑتا۔

اگر کسی بھی وجہ سے ہمارا یہ آپریشن ناکام ہو جاتا' میں کرسی پر موجود نہ ہوتا' ذوالفقار اپنے دفتر میں نہ ہوتا' یا راستے میں گاڑی ہی خراب ہوجاتی اور وقت ہاتھ سے نکل جاتا تو میجر موصوف یقینی طور پر بھارت کی خفیہ ایجنسیوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتا۔ افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ وہ ستارہ جرات پانے والا ایک بہادر آفیسر تھا۔ جس کا مستقبل انتہائی روشن اور تابناک تھا۔ اس کے لئے فوج کے اعلیٰ عہدوں تک پہنچنے کی تمام صلاحیتیں اور مواقع موجود تھے۔ اس کے برعکس اگر وہ ایک بار چانکیا کے چیلوں کے ہتھے چڑھ جاتا تو وطن کا یہ جیالا سپاہی وطن دشمنی کی گہرے اور اندھیرے غار میں گر جاتا اور اب تک نہ جانے اپنے کتنے ساتھیوں اور ماتحتوں کو بھی دانستہ یا غیر دانستہ طور پر ملک دشمنوں کی صف میں شامل کر چکا ہوتا۔

ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ایک انتہائی مکروہ منصوبے کو خاک میں ملانے کے لئے ہماری بھرپور راہنمائی اور امداد فرمائی۔ اور چند لمحوں کی اس جنگ میں ہماری جیت ہوئی۔



نفسیاتی جنگ

نفسیاتی جنگ ایک آزمودہ اور کار آمد ہتھیار ہے۔ اس سے دشمن کے ہوش و حواس پر کاری ضربیں لگائی جا سکتی ہیں اور دشمن کی سوچ کو مسخ اور دماغ کو ماؤف کیا جا سکتا ہے۔ دراصل نفسیاتی حربوں کا استعمال اور دشمن کے خلاف ایک فعال پراپیگنڈے کی لڑائی اب ایک سائنس کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ اور دنیا کے تقریباً تمام ممالک اپنے دشمنوں کے خلاف اس حکمت عملی پر عمل پیرا ہیں۔ نازی جرمنی کے حوالے سے گوئبلز کا نام آج بھی زندہ ہے۔ گوئبلز ہٹلر کی پراپیگنڈہ مشینری کا موجد اور ماسٹر مائنڈ تھا اور یہ اس کی قابلیت اور نفسیاتی حربوں اور پراپیگنڈہ کے محاذ پر اس کی صلاحیتوں کا اعتراف ہے کہ اسے آج اس میدان میں ایک لیجنڈ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ اسی کی شاندار حکمت عملی اور کارکردگی کا کمال تھا کہ چھوٹی سی جرمن قوم پوری دنیا کے خلاف برسرپیکار ہو گئی۔

سائنس کی ترقی اور خاص طور پر ابلاغ عامہ کے میدان میں جدید ترین ریسرچ اور ایجادات نے اب ہمیں اس قابل بنا دیا ہے کہ ہم الیکٹرونک میڈیا کی مدد سے' پہلے سے کہیں زیادہ سامعین اور ناظرین تک اپنا مافی الضمیر پہنچانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ تمدنی ترقی کے اس جدید دور میں پراپیگنڈے کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ نفسیاتی جنگ ایک ایسا ہتھیار ہے جو مدمقابل کی انفرادی اور قومی شناخت اور جذبے کی اکھاڑ پچھاڑ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

آپ سرکس کے شیر کی مثال ہی لیجئے۔ اپنی تمام تر قوت' فطری طاقت' خونخواری اور جنگل کے بادشاہ کی حیثیت سے اپنے افسانوی تشخص کے باوجود وہ اپنے رنگ ماسٹر کے چابک کا غلام ہو جاتا ہے۔ جنگل میں انسان کے جسم پر لرزہ طاری کر دینے والا یہ جانور ایک آدمی کے ہنٹر کی جنبش کے تابع ہو جاتا ہے۔ یہ سارا کمال اس ماسٹر کا ہے جو مسلسل کوشش کے بعد خونخوار شیر کے ذہن پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیتا ہے اور پھر جنگل کے بادشاہ کو اپنی مرضی سے چلانا اس کے لئے معمول کا کھیل بن کر رہ جاتا ہے۔ نفسیاتی جنگ بھی ایسا ہی ایک عمل ہے جو ایک بہادر سپاہی کو بزدل چوہا اور ایک قانون کے پابند شہری کو آسانی سے

سازشی' ملک دشمن' دہشت گرد' تخریب کار اور قاتل بنا سکتا ہے۔

قیام پاکستان بلکہ اس سے بھی پہلے سے بھارت' پاکستان کے خلاف نفسیاتی جنگ کا ایک مستقل محاذ کھولے ہوئے ہے۔ پاکستان دشمنی میں جتلا بھارت کے حکمران اور پالیسی ساز ابھی تک دو قومی نظریئے کو تسلیم کرنے سے گریزاں ہیں اور وطن پاک کا اسلامی تشخص ان کی راتوں کی نیند حرام کئے رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ان کا نشانہ ہمارا سیاسی' اقتصادی اور سماجی نظام ہے وہاں وہ دن رات اس کوشش میں بھی لگے رہتے ہیں کہ اس سچائی کو غلط ثابت کیا جائے کہ اسلام جو ہمارے قومی تشخص اور یک جہتی کی اساس ہے اور دین خدا ہے' ہمیں ایک قوم کی طرح متحد رکھنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ ان کے منصوبہ ساز' دانشور اور سیاستدان ہمہ وقت اس مفروضہ پر اپنی طالع آزمائیاں کرتے رہتے ہیں کہ مذہب سے نہ ہی تو قوم بنتی ہے' نہ ہی مذہب عوام کو متحد ہی رکھ سکتا ہے اور نہ ہی وہ منزل کی طرف ان کی راہنمائی کر سکتا ہے۔

انٹیلی جنس کے محاذ پر ہمارا مقابلہ کرنے کے لئے بھارت نے بھاری سرمائے سے انتہائی تربیت یافتہ افراد کی ایک فوج ظفر موج کا ایک Research And Analysis Wing قائم کر رکھا ہے' جسے عام طور پر RAW "را" کہا جاتا ہے۔ "را" کے قیام کا بنیادی مقصد بھارت کے اندر اور بیرونی ممالک میں بھارتی منصوبہ سازوں کو اپنے خفیہ منصوبوں کی تکمیل کے لئے وہ تمام ذرائع فراہم کرنا ہے جن کی مدد سے وہ دہشت گردی' جاسوسی' سیاسی قتل و غارت' ہنگامے' تخریب کاری' ڈس انفارمیشن اور منشیات کی سمگلنگ جیسے گھناؤنے منصوبوں کو کامیاب بنا سکیں۔ "را" نے مشرقی پاکستان میں ایک کامیاب تجربہ کیا۔ جہاں تخریب کے ذریعے دہشت گردی کا بازار گرم کیا گیا۔ لوگوں میں پاکستان کے حکمرانوں اور دیگر صوبوں کے خلاف نفرت کا جذبہ اس قدر ابھارا گیا کہ بالاخر پاکستان دو لخت ہو گیا اور "را" کے منصوبوں کے عین مطابق بنگلہ دیش معرض وجود میں آ گیا۔ اس کامیابی نے "را" کے حوصلے مزید بڑھا دیئے اور اب بھارت کے اس خفیہ ادارے کا دائرہ کار وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔

سندھ

سندھ آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا دوسرا بڑا صوبہ ہے اور ایک عرصے سے پاکستان کا یہ اہم ترین صوبہ "را" کی تخریبی کارروائیوں کی زد میں ہے۔ "را" کے منصوبوں کی وجہ سے پاکستان کا یہ پرامن صوبہ جسے پاکستان کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے'

لاقانونیت اور دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔

"را" کے منصوبہ ساز سندھ کے عوام میں لسانی' علاقائی' مذہبی اور سیاسی اختلافات کو ہوا دینے میں کسی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں اور خاص طور پر کراچی جیسا شہر جسے عروس البلاد کہا جاتا تھا' خوف و ہراس کی لپیٹ میں آگیا ہے۔ پاکستان کے اس سب سے بڑے شہر میں برسوں سے محبت اور بھائی چارے کے جذبوں کے ساتھ رہنے والے عوام کی ایک بڑی تعداد ان اختلافات کا نشانہ بنی۔ بعض علاقوں میں تو ایک بھی گھر ایسا نہیں جہاں کسی سہاگن کا سہاگ' کسی بیوہ کا آخری سہارا اور کسی ماں کا نوجوان لخت جگر اس نفرت کے الاؤ کا ایندھن نہ بن چکا ہو۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ہم جو ایک خدا' ایک رسول اور ایک کتاب اور پاکستان کی سلامتی پر ایمان رکھنے والے ہیں اور رحمت اللعالمینؐ کی امت کہلاتے ہیں' اس قدر بے رحم ہو چکے ہیں کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہوئے ہمیں احساس تک نہیں ہوتا کہ دشمن چال چل رہا ہے اور اس طرح ہمیں ٹکڑوں اور گروہوں میں تقسیم کرکے کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہے۔

"را" سندھ میں کس طرح کام کر رہی ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب آئی ایس آئی کے تجزیے کے مطابق کچھ اس طرح ہے:

"را" نے سندھ کے طویل بارڈر پر دونوں طرف اپنے ایجنٹ مقرر کر رکھے ہیں' ان میں سے بہت سے مقامی لوگوں کو بغیر روک تھام کے سمگلنگ کرنے اور دیگر مجرمانہ سرگرمیوں کی سرپرستی کے عوض خریدا گیا ہے۔ ان ڈاکوؤں اور سماج دشمن عناصر کی مدد سے دہشت گردوں اور تخریب کاروں کی آمدورفت انتہائی سہل بنائی جاتی ہے۔ یہ لوگ نہ صرف ان ملک دشمنوں کو اندرون ملک پہنچانے کا اہتمام کرتے ہیں بلکہ انہیں مخصوص حالات میں تحفظ بھی فراہم کرتے ہیں۔ را کے ایک خصوصی ونگ کا نام ایس ایس بی Special Services Bureau ہے۔ ایس ایس بی کا بنیادی کام پاکستان بھیجے جانے والے ایجنٹوں کی تربیت کرنا ہے۔ اس مقصد کے لئے ایس ایس بی نے سرحد کے ساتھ ساتھ ٹریننگ کیمپ قائم کر رکھے ہیں۔ تربیت یافتہ ایجنٹ عام طور پر مسلح ہوتے ہیں اور سندھ کے مختلف علاقوں میں پہلے سے موجود مقامی ڈاکوؤں اور سماج دشمن عناصر کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ ان کا طریقہ کار ایسا ہوتا ہے کہ ان کی تخریب کاری کو مقامی' سیاسی' لسانی اور مذہبی اختلافات کا شاخسانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کی سرگرمیاں عام شہریوں کے جذبات کو ابھارنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں' جس کے نتیجے میں کچھ مقامی لوگ بھی ایک دوسرے کے

خلاف مسلح کارروائیاں شروع کر دیتے ہیں اور اس کا فائدہ بھی بہرحال دشمن ہی کو پہنچتا ہے۔

دکھ کی بات یہ ہے کہ اپنی کم فہمی' لاعلمی اور قومی مفادات سے کومٹ منٹ نہ ہونے کی وجہ سے ہم دشمن کی ڈس انفارمیشن' ملک دشمن پراپیگنڈے اور تخریبی منصوبوں کے جال میں نہایت آسانی سے پھنس جاتے ہیں اور ہم دشمن کے منصوبے کے عین مطابق اپنے تمام دیرینہ رشتوں' سماجی تعلقات اور بندھنوں کو بھلا دیتے ہیں اور یوں قومی یک جہتی کی دیوار میں اپنے ہاتھوں سے دراڑیں ڈال دیتے ہیں۔

نچلے درجے کے ان تخریب کاروں اور دہشت گردوں کے علاوہ را کا اگلا ٹارگٹ ہمارے اعلیٰ سیاسی' سماجی اور دانشور حلقے ہیں۔ ان حلقوں کی مدد سے "را" کو اپنے منتخب ایجنٹ' جن میں خواتین بھی شامل ہیں' ان اعلیٰ سرکاری دفاتر اور اداروں تک پہنچانے میں مدد ملتی ہے جہاں قومی نوعیت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ ایجنٹ اس حد تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں کہ بعض اوقات وہ ان اداروں کے اعلیٰ عہدیداروں کے فیصلوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور ان سے دشمن کے حق میں فیصلے کروانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان ایجنٹوں کو بھارتی سفارتخانے یا قونصلیٹ میں موجود انٹیلی جنس کے آفیسر سے احکامات ملتے ہیں۔ اداروں کے یہ خفیہ افسران اکثر اوقات خود بھی سیاستدانوں اور عوامی راہنماؤں سے رابطے کرتے ہیں اور انہیں مالی امداد کے علاوہ "مفید مشوروں" سے بھی نوازتے ہیں۔

سب سے زیادہ کنفیوژن کی صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انتہائی تربیت یافتہ اور باخبر ایجنٹوں کو ہمارے سیکورٹی اور قانون نافذ کرنے والے اداروں تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے' اور وہ ان اداروں کے "اہلکار" بن جاتے ہیں' چنانچہ یہ ادارے ان "جعلی اہلکاروں" کی من گھڑت رپورٹوں پر یقین کر لیتے ہیں اور شاذ و نادر ہی ان کی فراہم کی گئی گمراہ کن اطلاعات کو کراس چیک کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

دشمن کی ان مربوط سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ سندھ ایک عرصے سے شدید قسم کی لسانی' سیاسی اور گروہی چپقلش میں مبتلا ہے اور وہاں امن عامہ کی حالت روز بروز بگڑتی جا رہی ہے۔ اس صورتحال کو بہتر بنانے اور کراچی کو خاص طور پر پھر سے امن کا گہوارہ بنانے کے لئے ہمیں دشمن کے عزائم کو سمجھنا ہو گا۔ اپنی صفوں میں موجود دشمن کے ایجنٹوں کی نشاندہی کرنی ہو گی۔ صورتحال کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ ہم ایسے حالات پیدا ہی نہ ہونے دیں جن سے دشمن اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کر سکے۔ ہمیں ہر حال میں خود کو دشمن کے ہاتھوں میں کھلونا بننے سے بچانا ہو گا۔

مقبوضہ کشمیر

"را" درج ذیل مقاصد کی تکمیل کے لئے کشمیر میں نفسیاتی جنگ لڑ رہی ہے۔

-1 کشمیریوں کو پاکستان کی سیاسی' سفارتی اور اخلاقی امداد سے محروم کرنا۔
-2 مجاہدین کے مختلف گروپوں میں نظریاتی اختلافات پیدا کر کے انہیں آپس میں الجھانا۔
-3 کشمیری مجاہدین کے جذبوں کو سرد کرنا۔
-4 عالمی سطح پر پاکستان کے خلاف اس قدر پراپیگنڈہ کرنا کہ اسے دہشت گرد ملک قرار دلوایا جا سکے۔
-5 عام کشمیریوں کے دلوں میں مجاہدین کے خلاف نفرت پیدا کرنا۔
-6 عالمی سطح پر آزادی کے سپاہیوں کو دہشت گردوں کے روپ میں پیش کرنا۔

"را" نے کشمیریوں کو حق خود ارادیت کی اپنی طویل جدوجہد میں پاکستان کی حمایت سے محروم کرنے کے لئے بہت سی ناکام کوششیں کی ہیں۔ بھارت کے ذرائع ابلاغ دن رات اس پراپیگنڈے میں مصروف رہتے ہیں کہ پاکستان آزاد جموں و کشمیر کے عوام کے ساتھ مساوی سلوک نہیں کرتا۔ جس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ پاکستان کے دیگر علاقوں کی نسبت آزاد کشمیر میں بہت کم ترقی ہوئی ہے۔ مقبوضہ کشمیر سے ہجرت کرنے والے کشمیریوں کی آزاد کشمیر میں مناسب دیکھ بھال نہیں کی جاتی'پاکستان اپنے علاقائی' لسانی اور مذہبی جھگڑوں میں اس قدر الجھا ہوا ہے کہ وہ کشمیریوں کے روزمرہ کے مسائل اور ان کا معیار زندگی بہتر بنانے کی طرف توجہ نہیں دے سکتا اور یہ کہ پاکستان بجائے خود آزادی یا خودمختاری کی کسی اسلامی تحریک کے لئے ایک ماڈل کی حیثیت نہیں رکھتا۔

مجاہدین کے مختلف گروپوں میں نفرت اور اختلافات پیدا کرنے کے لئے ایک گروپ کے شہدا کے ناموں کا اعلان کرتے ہوئے بھارتی ذرائع ابلاغ بڑے وثوق سے اس بات کی تشہیر کرتے ہیں کہ انہیں مخالف گروپ کے مجاہدین نے ہلاک کیا ہے۔ اس پراپیگنڈے سے "را" دو مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اول یہ کہ کشمیری مجاہدین کے مختلف گروپوں میں غلط فہمیاں پیدا کی جائیں اور دوم یہ کہ دنیا کو یہ بتایا جائے کہ ان مجاہدین کی شہادت' بھارتی فوج کے ہاتھوں نہیں ہوئی بلکہ انہیں کشمیر میں سیاسی برتری حاصل کرنے کی خاطر لڑنے والے ان کے مخالف گروپ نے ہلاک کیا ہے۔ بھارتی اخبارات اور برقی ذرائع ابلاغ مجاہدین کی ہلاکت

اور ہتھیاروں کی برآمدگی کی خبروں کو خاص اہمیت دیتے ہیں تاکہ جدوجہد میں مصروف مجاہدین کے حوصلے پست کیے جا سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بچوں' عورتوں اور معصوم شہریوں کی بے حرمتی اور ان کی زندگیوں کے چراغ گل کرنے کے عمل میں "را" نے اسلامی انقلاب سے پہلے کے ایران کی بدنام زمانہ خفیہ ایجنسی ساوک کے ریکارڈ بھی توڑ دیئے ہیں۔ اور کشمیر میں "را" کا نام ریاستی دہشت گردی' ظلم و بربریت اور تشدد کا عنوان بن گیا ہے۔ مجاہدین کی ماؤں اور بہنوں کے بال منڈوا دیئے جاتے ہیں' شہیدوں کی بیواؤں کو بھی پکڑ لیا جاتا ہے اور ان کی بے حرمتی کی جاتی ہے' کیا اس سے زیادہ سفاکی اور بربریت کی کوئی اور بھی مثال مل سکتی ہے کہ ایک 82 سالہ بوڑھی معلمہ کے دو لڑکے مجاہد تھے' بھارتی درندے ان مجاہدوں کو تو نہ پکڑ سکے مگر اس معلمہ کو پکڑ کر لے گئے اور آٹھ بھارتی درندوں نے اس کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی۔

بھارتی سیکورٹی فورسز زیر حراست مجاہدین پر بدترین تشدد کرتی ہیں۔ ان زیر حراست مجاہدین پر اس قدر جسمانی اور نفسیاتی تشدد اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ وہ رہائی کے بعد دوسروں کے لئے عبرت کی ایک مثال بن جائیں۔ تفتیش کے دوران تشدد سے ہلاک ہونے والوں کی لاشیں بھی ان کے ورثاء کے حوالے نہیں کی جاتیں بلکہ انہیں سرعام لٹکا دیا جاتا ہے۔ بازاروں میں ان کی بے حرمتی کی جاتی ہے' تاکہ ان کے ورثاء کے حوصلے جواب دے جائیں۔

مگر آزادی کی جدوجہد کا یہ ایک تابناک پہلو ہے کہ اتنے ظلم و ستم اور پراپیگنڈے کے باوجود را ابھی تک کشمیری مجاہدین کی اعصاب شکنی اور جدوجہد سے ان کی دستبرداری میں ناکام رہی ہے اور ظلم کی یہ داستانیں ان کے حوصلے پست کرنے کے بجائے ان کے جذبوں کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہیں اور بھارتی فوج کے خلاف ان کی نفرت اور انتقام کے جذبے کو مزید بڑھاتی ہیں۔

بھارت کی ایک جنگی حکمت عملی اور انتہائی قابل مذمت حربہ' نوجوان اور حتیٰ کہ بوڑھی کشمیری عورتوں کے ساتھ گینگ ریپ بھی ہے اور یہ حربہ ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے' اس کا واحد مقصد مجاہدین کو بھرپور ذہنی اور نفسیاتی اذیت دینا ہے اور یہ ریاستی تشدد کا وہ عمل ہے جو اس کا شکار ہونے والے بدنصیبوں کے لواحقین کو جسمانی اور روحانی طور پر مجروح کر دیتا ہے اور اس کے اثرات نسلوں پر محیط ہوتے ہیں۔

بھارت اپنی اس حیوانیت اور ظلم کی سزا بھی بھگت رہا ہے۔ بھارتی اخبارات سے معلوم

ہوا ہے کہ جو بھارتی فوجی کشمیری مجاہدین پر ظلم کر رہے ہیں' ان کی ہر پلٹن سے 12 فیصد سپاہی اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ بہت سے واقعات ایسے بھی ہوئے ہیں جہاں سپاہیوں نے اپنے افسروں کو ہی گولی کا نشانہ بنا ڈالا' بہت سے بھگوڑے ہو گئے ہیں' ڈسپلن نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی' اور مجاہدین کے خوف سے سپاہی رات کو اپنی بارکوں سے اکیلے باہر بھی نہیں آتے۔

سرینگر سے سنٹرل ریزرو پولیس فورس کے ڈائریکٹر جنرل گم کول کے مطابق اس کی فورس کے 3750 جوان اور افسر مختلف بیماریوں کی وجہ سے بیکار ہو چکے ہیں۔

انڈین ڈیفنس انسٹی ٹیوٹ آف فزیالوجی اینڈ ایلائیڈ سائنسز کی ایک رپورٹ کے مطابق "بہت سے افسر اور جوان دماغی اور جسمانی بیماریوں کی وجہ سے بیکار ہو چکے ہیں' ان میں ہارٹ اٹیک' ہائی بلڈ پریشر اور نروس بریک ڈاؤن کے مریض زیادہ ہیں' اور اگر حالات ایسے ہی رہے تو فوج کا بیشتر حصہ مفلوج ہو جائے گا اور وہ لڑنے کے قابل نہیں رہے گا۔" یقیناً اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔

مجاہدین آزادی کو بدنام کرنے اور ان کے اور کشمیری عوام کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کے لئے ریاستی ادارے بھاری معاوضوں پر اپنے ایجنٹوں کو مختلف سماج دشمن سرگرمیوں کے لئے تعینات کرتے ہیں۔ ان کے ذمے مختلف جرائم کا ارتکاب' تحریک کے نام پر چندہ اکٹھا کرنا' تحریک کی مخالفت کرنے والوں کی طرف سے خود ساختہ بیانات جاری کرنا' غیر ملکی باشندوں اور سیاحوں کو اغواء کرنا اور آبادیوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کرنا ہوتا ہے۔ امریکہ کا سٹیٹ آفس بھی بھارت کو تنبیہ کر چکا ہے کہ وہ کرائے کے قاتل بھرتی کرنے سے باز رہے اور کشمیر میں انسانی حقوق کے خلاف جرائم بند کرے۔

اپنے مقاصد کے حصول کے لئے "را" نے بعض بھارت نواز سیاستدانوں اور ففتھ کالمسٹوں کی خدمات بھی حاصل کر رکھی ہیں جو دن رات خود مختار کشمیر کا پراپیگنڈہ کرتے ہیں۔ "را" کے یہ "دیرینہ دوست" دنیا بھر میں اور خاص طور پر یورپی ممالک میں بڑی تعداد میں موجود ہیں جہاں ایک طے شدہ منصوبے کے مطابق خودمختار کشمیر کا نظریہ پھیلانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اس تحریک کا مقصد کشمیریوں میں کنفیوژن پھیلانا اور جدوجہد آزادی کو کمزور کرنا ہے۔

عالمی سطح پر بھارت ایک عرصے سے یہ پراپیگنڈہ کر رہا ہے کہ کشمیر میں پاکستان گڑبڑ پھیلا رہا ہے اور اس مقصد کے لئے نہ صرف وہ اپنے تربیت یافتہ افراد مقبوضہ کشمیر میں بھیجتا ہے

لہ مجاہدین کے مختلف گروپوں کو ہتھیار بھی سپلائی کرتا ہے۔ بھارتی ذرائع ابلاغ ایک عرصے سے یہ پراپیگنڈہ بھی کر رہے ہیں کہ آئی ایس آئی نے تراڑ کھل کے مقام پر ٹریننگ کیمپ قائم کر رکھے ہیں جہاں "اللہ ٹائیگرز" کو باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ اس پراپیگنڈے کا واحد مقصد دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنا اور کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کو سبوتاژ کرنا ہے۔

فرقہ پرستی

اسلام وہ واحد نقطہ ہے جس پر ہماری قومی زندگی کا ہر زاویہ مرکوز ہے۔ اسلام ہی ہماری قومیت کی اصل اساس اور عظیم الشان عمارت کی بنیاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کو قوموں کی برادری میں ایک نظریاتی ریاست کی شناخت حاصل ہے۔ چنانچہ ہمارے دشمنوں کا پہلا اور اہم ہدف ہمارا اسلامی تشخص ہی ہے۔ اس حوالے سے ہمیں صرف بھارت ہی کا سامنا نہیں بلکہ امریکہ اور اس کے یورپی حواریوں کی نگاہوں میں بھی ہمارا ایمان' عقیدہ اور تشخص کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ اور یہ اسلام دشمن قوتیں ہمیشہ ہی سے ہماری اس بنیاد سے خائف ہیں اور یہ جانتے ہوئے کہ پاکستان بلاشبہ اسلام کا قلعہ ہے' وہ ہمہ وقت ہماری اس قوت پر ضرب لگانے میں مصروف رہتی ہیں اور ان کی کوشش ہے کہ ہمیں اسلامی قوت بننے سے روکنے کے لئے ہمارے اندر گروہی' مذہبی' لسانی' سیاسی اور ثقافتی اختلافات کو اس قدر ہوا دی جائے کہ بالاخر ہم ٹکڑوں میں بٹ جائیں اور یوں ہماری وہ قوت زائل ہو جائے جو ہماری نظریاتی اساس ہے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے پاکستان کے کونے کونے میں اسلامی مکتبوں کا ایک جال پھیلا دیا گیا ہے' جہاں زیادہ تر کم پڑھے لکھے' قدامت پسند اور غریب گھرانوں سے تعلق رکھنے والے مذہبی جنونیوں کو دوسرے اسلامی عقائد کے خلاف اشتعال انگیزی اور درگزر نہ کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ ان مذہبی مکاتب کے یہ نوجوان طلباء مکمل طور پر اپنے اساتذہ کے زیر اثر ہیں جو ان طلباء کو گمراہ کرنے اور اسلام کے نام پر قتل و غارت کرنے کے کھلے سبق دیتے ہیں اور اس "کارخیر" کے عوض بھاری معاوضے حاصل کرتے ہیں۔ یوں ان کی کارکردگی اتحاد بین المسلمین کے بنیادی تصور کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیتی ہے اور ان عاقبت نااندیشوں کا یہ شیطانی فعل گلیوں اور بازاروں میں معصوم انسانوں کا لہو بہانے کا موجب بنتا ہے۔ چنانچہ اس حقیقت سے کوئی بھی ذی فہم انکار نہیں کر سکتا کہ مذہبی منافرت کا یہ بڑھتا ہوا طوفان پاکستان کی قومی سالمیت کے لئے زہر قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بدقسمتی تو یہ ہے کہ ہمارے

ہاں مذہبی جنونیوں کی ایک بڑی تعداد دشمن کی چال کا شکار ہو چکی ہے۔ اور ایک دوسرے کے عقیدے کی بنیاد کے خلاف دشمن کا پھیلایا ہوا نفرت کا یہ جال مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔ خدشہ اس بات کا ہے کہ کہیں یہ عفریت مسلح افواج اور اعلیٰ سرکاری عہدیداروں میں نہ گھس جائے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو پھر ہمیں اپنی تباہی کے لئے دشمن کی ضرورت ہی نہیں رہے گی اور ہم اپنے ہاتھوں اپنی قومی سالمیت کا خود ہی گلا گھونٹ دیں گے۔

جنرل ضیاء کے مارشل لاء سے پہلے کسی باوردی اہلکار کو کسی سماجی یا مذہبی تنظیم کا رکن بننے کی اجازت نہ تھی۔ یہ جنرل صاحب کی "اسلام سے محبت" کا نتیجہ ہے کہ اب ایک حاضر سروس پیشہ ور فوجی بھی تبلیغی جماعت یا دوسری ایسی مذہبی جماعتوں کا رکن بن سکتا ہے۔ بہت سے ریٹائرڈ آرمی آفیسرز جماعت اسلامی اور جمیعت علمائے اسلام اور اس نوع کی دیگر مذہبی جماعتوں کے رکن بن چکے ہیں۔

آئی ایس آئی کے ایک سابق ڈائریکٹر کا تعلق بھی رائے ونڈ والی تبلیغی جماعت سے تھا اور یہ ان کا معمول تھا کہ وہ ہر جمعرات کو آئی ایس آئی کے جہاز پر اپنے چند تبلیغی دوستوں کے ہمراہ لاہور جاتے' جہاں سے آئی ایس آئی کی سرکاری گاڑیاں' انہیں رائے ونڈ لے جاتیں جو تبلیغی جماعت کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ رائے ونڈ میں شب بسری کے بعد وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ واپس اسلام آباد آ جاتے۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس اعلیٰ پوزیشن کا فوجی افسر اگر رائے ونڈ یاترا کے لئے سرکاری ٹرانسپورٹ اور ذرائع کا استعمال کر سکتا ہے تو جماعت کے نام پر اس سے کسی بھی عمل کی توقع کی جا سکتی ہے۔ جہاں تین سٹار والے جنرل کا یہ رویہ ہو وہاں دیگر باوردی افسروں اور ماتحتوں کو سپاہ صحابہ' تحریک جعفریہ' سپاہ محمدؐ اور لشکر جھنگوی وغیرہ کا رکن بننے سے کون روک سکتا ہے۔ کیا اس صورتحال میں دشمن کے لئے بعض جنونیوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا ناممکن ہے؟

اگر سرکاری محکموں اور خاص طور پر مسلح افواج میں اس رجحان کی حوصلہ شکنی نہ کی گئی تو اس کے نتائج انتہائی خوفناک ہو سکتے ہیں۔ یہ وقت کی اہم ضرورت ہے کہ مسلح افواج اور سرکاری محکموں میں بھرتی کے وقت پر کی جانے والی دستاویزات میں سے فرقہ کا خانہ ختم کر دیا جائے اور ان افراد کی کسی فرقہ پرست گروپ میں شمولیت پر پابندی لگا دی جائے۔ پاکستان میں صرف دو عقائد کے لوگ بستے ہیں۔ مسلمان یا غیر مسلم۔ ان کا کوئی اور تشخص کسی صورت میں بھی قابل قبول نہیں ہونا چاہئے۔

دشمن اپنے عزائم کے حصول کے لئے پاکستانی ذرائع ابلاغ کو بھی انتہائی دیدہ دلیری سے

استعمال کر رہا ہے۔ اس ضمن میں دو مثالیں قابل ذکر ہیں۔ پہلی مثال ایک اشتہار تھا جو روزنامہ نوائے وقت لاہور کی 5 اپریل 1994ء کے باقاعدہ شمارے میں شائع ہوا۔

"صوبہ مشرقی پنجاب اقتصادی اور سماجی ترقی کی راہ پر" کے عنوان سے یہ اشتہار بھارتی پنجاب کے سابق وزیراعلیٰ سردار بے انت سنگھ کی جانب سے شائع ہوا۔ اس اشتہار کے متن میں سردار بے انت سنگھ کے دور میں بھارتی پنجاب میں ہونے والی نام نہاد ترقی کی تفصیل درج تھی۔ اس اشتہار کی اشاعت سے دشمن تین مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

-1 پاکستان کے صوبہ پنجاب کے عوام کی توجہ اس جانب مبذول کروائی جائے کہ بھارتی پنجاب میں بسنے والے پنجابی پاکستانی پنجاب کے باسیوں سے زیادہ خوشحال اور خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔

-2 ہمارے پنجاب میں سرائیکی بولنے والوں کو متحرک کیا جائے تاکہ سرائیکی صوبے کی تحریک مزید زور پکڑ سکے۔

-3 ذرائع ابلاغ کے ذریعے اپنے آئندہ کے اس قسم کے "حملوں" کے لئے پاکستانی عوام کا ردعمل جانچا جا سکے۔

خوش قسمتی سے حکومت پاکستان نے بروقت اس سازش کا نوٹس لے لیا اور برائی کو سر اٹھانے سے پہلے ہی کچل کر رکھ دیا۔

بھارت کے معروف فری لانس صحافی کل دیپ نیر کا ایک مضمون جو انگریزی روزنامے دی نیشن کے 13 اپریل 1994 کے شمارے میں شائع ہوا وہ بھی قابل غور و تحقیق ہے۔ موصوف لاہور میں ایک شادی کی تقریب میں گئے اور وہاں کچھ پاکستانی سیاستدانوں سے ان کی ملاقات ہوئی' اس پر انہوں نے ایک مضمون لکھ ڈالا۔ یہ مضمون پروپیگنڈا کے طالب علموں کو ضرور پڑھنا چاہئے۔ اس مضمون سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں:

پاکستان' ایک اپاہج معاشرہ
(نئی دلی سے ایک تجزیہ)

کل دیپ نیر

"جنیوا میں کشمیر میں انسانی حقوق کی پامالی کے بارے میں پاکستان

کی طرف سے اپنی قرارداد واپس لینے پر تبصرہ کرتے ہوئے ائیر مارشل ریٹائرڈ اصغر خان نے کہا ہے کہ جنیوا میں پاکستان کی یہ شکست 1971ء میں ڈھاکہ میں ہونے والی شکست سے بھی بدتر ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جنیوا میں پاکستان ایک سیاسی لڑائی ہارا ہے جبکہ ڈھاکہ میں اس کو فوجی شکست ہوئی تھی۔

میں نے پہلی مرتبہ پاکستانیوں کی سوچ کو اس قدر مایوسی کا شکار دیکھا ہے اور اب وہ برملا کہتے ہیں کہ اپنے محدود قومی وسائل اور جغرافیائی حدود اربعہ کی بناء پر ہم محض زندہ ہی رہ سکتے ہیں' اپنے ملک کو جنت کا نمونہ نہیں بنا سکتے۔ ان کا کہنا ہے کہ بھارت کی صورت حال' پاکستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر ہے۔ پاکستانی عوام اس حد تک مایوسی کا شکار ہیں کہ وہ اب جنگی محاذ پر بھارت کو شکست دینے کا خیال بھی دل میں نہیں لاتے۔ ایک ایڈیٹر صاحب کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ "بھارت سے ایک اور جنگ کا مطلب ہے پاکستان کا مکمل خاتمہ' ہم اتنے بیوقوف اور کم علم بھی نہیں کہ نوشتہ دیوار نہ پڑھ سکیں" اب پاکستان میں کہیں بھی بھارت کے ساتھ جنگ اور اسے کرش کرنے کی بات نہیں ہوتی مگر بھارت کے خلاف نفرت اور غیظ و غضب کی جنونی کیفیت پاکستانی قوم میں ابھی تک موجود ہے۔ تاہم اس غصب کے پیچھے کہیں کہیں کشادہ دلی کا عنصر بھی موجود ہے۔

پاکستانیوں کی محبت کا ایک ثبوت اس وقت میرے مشاہدے میں آیا جب پاکستان کی ایک خفیہ ایجنسی کے اہلکار مسلسل میرا پیچھا کر رہے تھے۔ ہمیں یہ حقیقت پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی کیونکہ وہ میرے ڈرائیور کے ساتھ گپ شپ لگا چکے تھے۔ ڈرائیور نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ہرے رنگ کی ایک جیپ میں ہمارے ساتھ ساتھ ہیں۔ وہ ہم پر اتنے مہربان تھے کہ ایک بار جب ہم لاہور کی لبرٹی مارکیٹ میں راستہ بھول گئے تو انہوں نے کمال ہمدردی سے ہماری راہنمائی

کی۔ بہت سے پاکستانی' پرائم منسٹر نرسیما راؤ کے استدلال اور رویے سے حسد کرتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ پاکستان کے دونوں سیاسی لیڈر' بے نظیر بھٹو اور نواز شریف ان سے کوئی سبق سیکھیں' تاہم وہ بھارت کے سیاسی اداروں کے استحکام کے بڑے مداح ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "آپ کے پاس ایک مضبوط نظام ہے جو کامیابی سے چل رہا ہے" پاکستان کے ایک نامور ماہر اقتصادیات نے تو یہاں تک کہا کہ "ہمارے ہاں تو ابھی تک اس نظام کی بنیاد بھی نہیں رکھی گئی اور اس حوالے سے جو تھوڑا بہت ہمارے پاس تھا پاکستان کے مختلف حکمرانوں نے اسے بھی تباہ و برباد کر دیا۔"

میں نے کل دیپ نیر کے اس مضمون کے جواب میں دی مسلم اسلام آباد کے کالم "فورم" میں 16- اپریل کو ایک مراسلہ لکھا جس سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں:

"کل دیپ نیر سے ہوشیار رہیں"

کل دیپ نیر کا دی نیشن کے 13 اپریل کے شمارے میں شائع ہونے والا مضمون "پاکستان ایک اپاہج معاشرہ" نفسیاتی جنگ کی بدترین مثال ہے۔ اسے نفسیاتی جنگ کے آرٹ میں مہارت رکھنے والے ماسٹر کی تدریسی کتاب کا ایک ورق قرار دیا جا سکتا ہے۔ کل دیپ نیر نے اپنے اس مضمون میں اپنے خیالات کو بدنیتی اور چالاکی سے پاکستانی سیاستدانوں' صحافیوں اور عوامی نمائندوں کے افکار کے روپ میں پیش کیا ہے۔

کل دیپ نیر نے اپنے مضمون میں نہ صرف پاکستان کی سیاسی صورتحال کی ایک گھمبیر تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ پاکستان کے اقتصادی مستقبل کا ایک تاریک خاکہ بھی پیش کیا ہے اور اپنے تصوراتی ذرائع سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان کا سارا کاروبار حیات کسی نظام کے بغیر چل رہا ہے۔

اس مضمون میں اپنے الفاظ ایک اخباری ایڈیٹر کے منہ میں ڈال کر کہے گئے ہیں کہ فوجی محاذ پر پاکستان کا بھارت سے کوئی مقابلہ نہیں اور اگر اب پاک بھارت جنگ ہوئی تو پاکستان کا خاتمہ یقینی ہے۔ یہ سراسر پاکستانی قوم کی حوصلہ شکنی اور ہمارا قومی مورال پست کرنے کی ایک بھونڈی اور گھٹیا کوشش ہے۔ اس معاملے میں ہمارے ماہرین کا نقطہ نظر اس سے بہت مختلف ہے۔ ہمارے چیف آف آرمی سٹاف کا کہنا ہے کہ پاکستانی افواج کسی بھی حملہ آور کو بدترین شکست دینے کی بھرپور صلاحیتیں رکھتی ہیں۔

کل دیپ نیر ہماری طرف سے یہ پیغام لے کر اپنے گھر لوٹیں کہ مستقبل میں بھارت کو پاکستان کے ساتھ کوئی بھی عسکری ایڈونچر انتہائی مہنگا پڑے گا اور ہم انہیں ایسا گھونسہ رسید کریں گے کہ بھارت اپنے چہرے کی پہچان بھول جائے گا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ 1971ء کی جنگ کے بعد بھارتی جنتا پاکستان کی جانب سے ایک مستقل نفسیاتی دباؤ اور خوف کی صورتحال سے دوچار ہے۔ بھارت کو یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہے کہ پاکستانی قوم کس دھات سے بنی ہے اور کسی بھی قومی ابتلا اور مصیبت کی گھڑی میں ہم دشمن کو منہ توڑ جواب دینے کی کس قدر قوت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔

دوسری طرف چین' پاکستان' ایران اور افغانستان کے متوقع مشترکہ بلاک کا خوف بھارت کو مسلسل اس بات پر مجبور کر رہا ہے کہ وہ اس تصور کی بنیاد ہی کو وجود میں نہ آنے دے۔ اس ضمن میں اس کی بھرپور کوشش یہی ہے کہ کم سے کم ایران یا چین کو پاکستان کی دوستی کے محور سے دور رکھا جائے۔ اس سلسلے میں بھارتی حکومت فریقین کی فوجی اور سیاسی صورتحال پر بھی نظر رکھے ہوئے ہے اور اس حوالے سے وہ ایسی سازشیں کرنے میں مصروف ہے جن کے

نتیجے میں ہمارا باہمی اتحاد نہ ہو سکے۔ بھارت کی یہ بھی کوشش ہے کہ
پاکستان کے ساتھ ایران اور چین کی وفاداری کے حوالے سے پاکستانی
عوام میں غلط فہمیوں اور نفرت کا بیج بویا جا سکے......"

بھارت کی اپنی حالت

بھارت کے اخبارات اور لیڈر مسلسل پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

بھارت کی اپنی کیا حالت ہے؟ ایک طرف تو بھارت کی چودہ ریاستوں میں آزادی کی جنگ جاری ہے' خالصتان' میزورام' تریپورہ' مگالیا' ناگالینڈ' اروناچل پردیش' بوڈو لینڈ' گورکھا لینڈ وغیرہ وغیرہ۔ ان ریاستوں میں آزادی پسند نوجوانوں نے اپنی علیحدہ حکومتیں بنا رکھی ہیں جو باقاعدہ ٹیکس لیتی ہیں اور خود اپنی ریاست کا کاروبار چلاتی ہیں۔

فوج کی حالت یہ ہے کہ فوج میں کوئی بھرتی ہونے کے لئے نہیں آتا' فوج میں بیس ہزار افسر کم ہیں اور یہ تعداد 400 افسران فی سال کے حساب سے مزید کم ہو رہی ہے' حکومت' ٹی وی ڈرامے' ناٹک اور کھیل تماشے لگا کر جوان لڑکوں کو فوج میں بھرتی ہونے کے لئے راغب کرتی ہے۔ اس پروپیگنڈے کے لئے تھامسن ایسوسی ایٹس کی خدمات' 3 کروڑ 85 لاکھ روپے کے عوض حاصل کی گئیں' لیکن ان کو بھی کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ میجر اور لیفٹیننٹ کرنل بڑی تعداد میں فوج سے جلدی خلاصی کروا کے سول اداروں میں نوکری کر لیتے ہیں۔ پانچ سال کے شارٹ سروس کمشن کے لئے پچھلے سال آفیسرز ٹریننگ اکیڈمی مدارس میں جہاں 475 سیٹیں تھیں' صرف 37 لڑکے آئے۔

بھارت کی ہوائی فوج میں جہازوں کے کریش کا ریکارڈ دنیا بھر میں بدترین ہے' پائیلٹ جہازوں کو اڑتے پھرتے تابوت' کہہ کر' اڑانے سے کتراتے ہیں' ٹکنیشن اتنے کم ہیں کہ جہازوں کی دیکھ بھال نہیں ہو سکتی۔ کچھ عرصہ پہلے زمینی عملے نے تھوڑی تنخواہ کے خلاف ہڑتال بھی کر دی تھی۔

کل دیپ نیر کے آئیڈیل پردھان منتری نرسیما راؤ پر رشوت' بے ایمانی اور دھوکہ دہی کے مقدمات چل رہے ہیں' اور شاید وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھارت کی سیاست کا بدنما داغ اور

ایک گلی بن جائیں۔

سیاسی حالات کا اندازہ لگانے کے لئے بھارت ہی کے اخبارات سے چند سرخیاں ہی کافی ہیں :

"گاندھی جی نے کردار کو ترجیح دی تھی جو غلامی کے دور میں کچل دیا گیا تھا' لیکن ہم نے ذاتی مفادات کی دوڑ میں سب کچھ کھو دیا' ہماری تمام خرابیاں ہمارے وزیروں لوک سبھا کے ممبران' ان کے رشتہ داروں اور بچوں کے واحیات اور رئیسانہ زندگی گزارنے کے طریقے سے پیدا ہوئیں۔ ہماری سیاست' بے ایمانوں' غنڈوں' رسہ گیروں اور جرائم پیشہ لوگوں کے ہاتھوں میں جا چکی ہے۔"

(اندر جیت۔ ہندوستان ٹائمز1 اکتوبر 1997)

"ہمارے لئے آزادی کے پچاس سال مکمل کر لینا' خوشی منانے کا کونسا موقعہ ہے۔ کیا ہم نے اس آزادی کے لئے جیلیں نہیں کاٹیں اور سختیاں نہیں جھیلیں کہ آج ہمیں دو وقت دال روٹی بھی کھانے کے لئے نصیب نہیں؟ سب کچھ ہی تو کرپشن اور بے ایمانی کے ہاتھوں برباد ہو چکا ہے' کچھ بھی تو باقی نہیں بچا۔"

(پی پی ایس گل' دی ٹرابیون۔ 29 اگست 1997)

"آجکل کرپشن انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ رشوت اور کک بیک سرکاری کاروبار کا حصہ بن چکے ہیں' آج کل بجٹ کا زیادہ حصہ سرکاری افسروں کے لئے مخصوص ہے۔"

(راکیش لوھومی۔ دی ٹری بیون 29 اگست 1997)

بھارتی اخبارات پڑھنے سے یقین ہو جاتا ہے کہ روس اور یوگو سلاویہ کی طرح اب بھارت کا ٹوٹنا اس کی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے۔



نام نہاد پاکستان لبریشن مووُمنٹ

قوموں کی برادری میں اقتصادی' سیاسی' جغرافیائی' ثقافتی اور سماجی مفادات ہی وہ بنیادیں ہیں جو ممالک کی آپس میں دوستی اور اشتراک کا سبب بنتی ہیں' تاہم تمدنی ترقی کے اس جدید ترین دور میں قوموں کے درمیان تعلقات اور اشتراک کا گراف حالات اور روزمرہ تبدیلیوں کی روشنی میں گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ اسی لئے عالمی تعلقات پر کڑی نظر رکھنا اور حالات کے مطابق ترجیحات کا تعین کرتے رہنا ہر ملک کے خارجہ امور کے ماہرین کی ایک اہم ذمہ داری ہے۔ خارجہ امور کے حوالے سے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دنیا میں کوئی بھی مستقل دشمن یا دوست نہیں ہوتا۔ ہر ملک کی لیڈر شپ ایک طے شدہ خارجہ پالیسی کی روشنی میں کسی دوسرے ملک کے ساتھ ایک خاص حد تک تعلقات استوار کرتی ہے۔ اور اس حقیقت کا اندازہ ہم پاک لیبیا تعلقات کی تاریخ پر نظر ڈال کر کر سکتے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے خاتمے کے بعد ان دونوں برادر ممالک کے مضبوط تعلقات کو بہرحال ایک دھچکا لگا' تاہم یہ عارضی تھا۔ لیبیا پاکستان کا دوست ملک ہے' وہ نظریاتی اور سیاسی ہم آہنگی کے ساتھ ہمارے ساتھ دوستی نبھا رہا ہے۔ لیبیا نہ صرف ابتلا کی گھڑیوں میں ہمارے شانہ بشانہ کھڑا رہا ہے بلکہ کئی عالمی محاذوں پر بھی اس نے پاکستان کے خلاف ہونے والی سازشوں کی بھرپور مخالفت کی ہے اور ہمیشہ پاکستان کی سالمیت اور خودمختاری کی حمایت کی ہے۔

تاہم ان دنوں اسلام آباد میں لیبیا کے سفارتخانے کا بیشتر عملہ نوجوانوں پر مشتمل تھا' جن کے انداز میں لاپرواہی' گفتگو میں ناپختگی اور کارکردگی میں نوجوانی کی تن آسانی کی جھلک پائی جاتی تھی۔ ان نوجوانوں کا کام صرف ویزے جاری کرنا اور زندگی کی آسائشوں سے لطف اندوز ہونا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب پاکستان کے کونے کونے میں ریکروٹنگ ایجنسیاں کھمبیوں کی طرح ابھر آئی تھیں اور پاکستان سے افرادی قوت کی برآمد ایک نفع بخش کاروبار بن گیا تھا۔ لیبیا کا ویزا حاصل کرنے والے پاکستانیوں کا ایک ہجوم ہر وقت لیبیا کے سفارتخانے کے سامنے لگا رہتا تھا۔ ان محنت کشوں کی اس خواہش نقل مکانی اور اپنے بچوں کے لئے زندگی کی

بہتر اور جدید آسائشیں مہیا کرنے کے شوق کا ایک طرف تو ریکروٹنگ ایجنسیاں بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھیں اور دوسری جانب لیبیا کے سفارت خانے کے بعض نوجوان افسر بھی معمول کی ویزا فیس کے علاوہ ان لوگوں سے "شکرانہ" وصول کرتے تھے۔ یہ تاثر بھی عام تھا کہ بعض ریکروٹنگ ایجنٹوں نے اپنے دفاتر میں "چالو خواتین" اور دھندا کرنے والی "حسیناؤں" کو پارٹ ٹائم ملازمتیں دے رکھی تھیں اور ویزوں کے فوری اور آسان حصول کی خاطر وہ ان "کارکنوں" کو ویزا فارموں کے ساتھ لیبیا کے سفارت خانے بھجوایا کرتے تھے۔ جہاں شب بسری کے بعد اگلے روز ان "کارکنوں" کو ویزوں کے ساتھ سفارت خانے سے واپس لے جایا جاتا تھا۔

سردیوں کی ایک رات جب آتشدانوں میں روم ہیٹر جلانے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا' مجھے ایک ایسے دوست کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا جہاں بعض غیر ملکیوں سمیت متعدد معززین شہر گپ شپ کے لئے جمع ہوتے تھے۔ ایسے اجتماعات میں اکثر غیر ملکی سفارت کار اپنے روایتی خول سے باہر نکل آتے ہیں اور بعض اوقات ان کے منہ سے سچی باتیں بھی نکل جاتی ہیں۔ وہاں اس رات گفتگو کا موضوع ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار سے جانے کے بعد کا دور تھا۔ تمام مہمان اپنی اپنی رائے کا سنجیدگی سے اظہار کر رہے تھے اور بعض مہمان انتہائی منطقی انداز میں اپنے خیالات پیش کر رہے تھے۔ ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ لیبیا کے سفارت خانے کا ملٹری اتاشی کرنل حسین امام مبروک بھی آن پہنچا۔

کرنل حسین ایک سنجیدہ سفارت کار تھا۔ اور شاذ و نادر ہی ایسی گفتگو میں حصہ لیتا تھا' مگر اس وقت محفل میں موجود تمام افراد کے لئے یہ بات حیرت کا باعث بنی کہ کرنل حسین انتہائی جذباتی انداز میں اس گفتگو میں حصہ لینے لگا۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی سے بہت نالاں تھا۔ اسے بھٹو کیس کی تفصیلات' عدالتی کارروائی اور مقدمے کی نوعیت کا تو اتنا علم نہیں تھا لیکن اس کی گفتگو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی موت پر بہت دل برداشتہ تھا۔ وہ ایک ہی سانس میں جنرل ضیاء کو کئی لحاظ سے برا بھلا کہہ رہا تھا۔ اسے اس بات پر بھی سخت خفگی تھی کہ جنرل ضیاء نے صدر معمر قذافی کی اپیل کو رد کرنے کی جرات کی۔ (جنرل ضیاء نے معمر قذافی اور کئی دیگر عالمی راہنماؤں کی اپیلوں کے باوجود' نواب محمد احمد خان کے مبینہ قتل کے جرم میں بھٹو کی موت کے پروانے (Death Warrant) پر دستخط کئے تھے) کرنل حسین کا انداز گفتگو انتہائی زہریلا اور سفارتی آداب کے بالکل خلاف تھا۔ وہ غصے میں آگ بگولا ہو رہا تھا اور بار بار مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو "I will crush"

اس کے رویے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی سوچ کا انداز پاکستان اور خاص طور پر جنرل ضیاء کے لئے خطرے سے خالی نہیں ہے اور وہ یقیناً کچھ نہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ میں وہاں موجود تھا۔ کرنل حسین جو کچھ بھی کہہ رہا تھا میں اپنے کانوں سے سن رہا تھا' جسے نظر انداز کرنا بہر حال میری پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے خلاف تھا۔ معمول کے مطابق میں نے دوسری صبح جنرل اختر کو بریف کیا اور ہم نے فوری طور پر لیبیا والوں پر کڑی نظر رکھنے کا فیصلہ کیا اور کسی بھی صورت حال سے نمٹنے کے لئے انتظامات کرنے شروع کر دیئے۔

خفیہ نگرانی بے حد بورنگ اور اکتا دینے والی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ جس کے لئے انتہائی قوت برداشت' چابکدستی اور صبر و تحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم نے خفیہ نگرانی کا سلسلہ کئی روز تک چوبیس گھنٹے جاری رکھا مگر کوئی غیر معمولی حرکت ہمارے نوٹس میں نہ آئی۔

ایک رات دو پاکستانی لیبیا کے ایک سفارت کار' مسٹر سعید کے گھر داخل ہوتے دیکھے گئے' لیکن وہ صبح تک باہر نہ آئے۔ مسٹر سعید تو معمول کے مطابق اپنے دفتر چلے گئے مگر وہ دونوں پاکستانی ابھی تک ان کے گھر کے اندر ہی موجود تھے۔ اس بات کا احتمال تو تھا کہ وہ دونوں رات گئے واپس چلے گئے ہوں اور اندھیرے کی وجہ سے نگرانی کرنے والے انہیں دیکھ نہ پائے ہوں' مگر ہماری چھٹی حس ہمیں مجبور کر رہی تھی کہ ہم نگرانی جاری رکھیں۔

تقریباً گیارہ بجے دن وہ دونوں صاحبان گھر سے باہر نکلے۔ ہمارے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ کوئی "خاص" مہمان ہیں' کیونکہ لیبیا والوں نے آج تک کسی پاکستانی کو اپنے گھر میں شب بسری کی اجازت نہیں دی تھی۔ نگران ٹیم نے خفیہ کیمرے سے ان کی تصاویر اتار لیں اور ان کا پیچھا شروع کر دیا۔

گھر سے تھوڑے فاصلے پر وہ دونوں ٹیکسی میں بیٹھے اور جنرل بس سٹینڈ پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک نے میرپور (آزاد کشمیر) کی بس پکڑی اور دوسرا لاہور کی ویگن میں سوار ہو گیا۔ نگران ٹیم کا ایک فرد آزاد کشمیر والی بس میں سوار ہو گیا اور دوسرا لاہور کی ویگن میں۔ اپنی تمام تر تجربہ کاری اور احتیاط کے باوجود بھیڑ بھاڑ میں لاہور جانے والا مسافر ہمارے آدمی کی نظروں سے اوجھل ہو گیا' لیکن دوسرا کارکن میرپور والے "مسافر" کے گھر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ صاحب الطاف عباسی تھے۔ الطاف عباسی کے بارے میں تحقیقات سے پتہ چلا کہ وہ کئی برس پہلے لندن چلے گئے تھے اور وہاں کسی سکول میں ملازم تھے۔ وہ ایک عرصے کے بعد

چھٹی پر پاکستان آئے مگر صرف ایک رات میرپور میں اپنے گھر پر گزارنے کے بعد اسلام آباد آئے تھے۔ ہمارے لئے اب یہ انتہائی ضروری، ہو گیا تھا کہ الطاف عباسی کا مشن معلوم کیا جائے۔ کیونکہ اس مشن کا کرنل حسین کی اس رات کی گفتگو والے منصوبے سے تعلق ہو سکتا تھا۔

میرپور میں دو روز قیام کرنے کے بعد الطاف عباسی دوبارہ اسلام آباد آئے اور سیدھے ڈاکٹر کنیز یوسف کے گھر گئے۔ ڈاکٹر کنیز یوسف کے بھائی بریگیڈیئر عثمان خالد پاک فوج کے بھگوڑے تھے اور ان کے بیوی بچے' ڈاکٹر کنیز یوسف کے ہاں رہائش پذیر تھے۔ بریگیڈیئر عثمان خالد کا تعلق توپخانے سے تھا اور وہ پاک فوج چھوڑنے سے پہلے سکول آف آرٹلری نوشہرہ میں کمانڈنٹ تھے۔ انہی دنوں بریگیڈیئر خالد پر دل کا دورہ پڑا تھا اور انہیں اگلے عہدے پر ترقی کے لئے نظر انداز بھی کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر کنیز یوسف نے اپنے بھائی کے ساتھ ہونے والی اس "زیادتی" پر غالباً انہیں گمراہ کیا ہو گا اور پاک فوج سے بغاوت پر اکسایا بھی ہو گا۔ بہرحال بریگیڈیئر عثمان خالد کی اپنی بددلی اور پی پی پی کے ساتھ دلی ہمدردیاں رکھنے والی اس کی بہن ڈاکٹر کنیز یوسف نے اس سپاہی کو باغی بنا دیا۔

ایک روز عثمان خالد نے پاکستان سے باہر جانے کے لئے چھٹی کی درخواست دی' جس میں لندن میں ہارٹ بائی پاس سرجری کرنے کی معقول وجہ تحریر کی گئی تھی۔ ان کی چھٹی منظور کر لی گئی اور وہ لندن روانہ ہو گئے۔

لندن پہنچتے ہی عثمان خالد نے ایک پریس کانفرنس کر ڈالی۔ اس پریس کانفرنس میں انہوں نے جنرل ضیاء کی مارشل لاء حکومت کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا اور اپنے آئندہ کے منصوبوں کی تفصیلات بیان کیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے یہ پریس کانفرنس پاکستان فوج کی وردی میں کی' جس سے وہ بغاوت کر چکے تھے۔

لندن میں اپنے قیام کے دوران وہ اکثر مارشل لاء کے خلاف پاکستانی ہائی کمیشن کی عمارت کے سامنے احتجاجی مظاہرے کرنے والے ہجوم میں دیکھے گئے اور انہوں نے کئی بار لیبیا کا دورہ بھی کیا۔

چنانچہ اب الطاف عباسی والا معمہ سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس معمے کی ساری کڑیاں ایک ایک کر کے مل رہی تھیں' مارشل لاء' پی پی پی' خالد' ڈاکٹر کنیز' عباسی' لندن' لیبیا۔

ہم نے اپنی جمع تفریق مکمل کی اور اہم مقامات اور زاویوں کی نشاندہی کر لی۔ اب واقعات تیزی سے وقوع پذیر ہونے لگے۔

چند روز بعد عباسی اور اس کا دوست پھر مسٹر سعید کی رہائش گاہ پر آئے اور رات بھر وہاں قیام کیا' اگلے روز وہ دو علیحدہ بسوں میں سوار ہو کر پشاور جا پہنچے۔ پشاور پہنچتے ہی وہ پھر ایک دوسرے کے ساتھ ہو لئے اور دو روز پشاور میں قیام کے بعد انہوں نے کراچی کی ٹرین پکڑی۔ ان کا پشاور والا چکر محض اس متوقع نگرانی سے پیچھا چھڑانے اور خفیہ والوں سے بچنے کی ایک ترکیب تھی جو شاید انہیں سعید نے سکھائی تھی۔ بہرحال وہ اس چالاک کوشش میں ناکام رہے' وہ مسلسل ہماری نظر میں تھے۔

ادھر اسلام آباد میں ہمیں ایک اور اہم سگنل موصول ہوا۔ ایک نوجوان لڑکا ڈاکٹر کنیز یوسف کے گھر آیا اور لیبیا جانے کے لئے اس کو جو رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا اس کے بقایا جات کا مطالبہ کرنے لگا۔ اس بحث مباحثہ میں ان کی ایک دوسرے سے تلخ کلامی شروع ہو گئی۔ نوجوان' ڈاکٹر صاحبہ پر فنڈز میں خورد برد کرنے اور وعدہ خلافی جیسے الزامات لگا رہا تھا مگر ڈاکٹر کنیز یوسف اس کی کوئی بات سننے کے لئے تیار نہ تھیں۔ نوجوان کا کہنا تھا کہ میں کسی صورت بھی پیسے لئے بغیر نہیں جاؤں گا' جب کہ ڈاکٹر صاحبہ اسے ایک پائی بھی دینے کے لئے تیار نہ تھیں۔

یہ ساری گفتگو میں اپنے دفتر میں بیٹھا سن رہا تھا۔ اس گفتگو کے دوران ہی میں نے ہدایات دیں کہ اس نوجوان کو ڈاکٹر صاحبہ کے گھر سے نکلتے ہی دفتر لایا جائے اور اس سے پوچھ گچھ کی جائے۔ چنانچہ جب وہ نوجوان ہذیانی کیفیت میں ان کے گھر سے باہر نکلا' تو کچھ دور آنے کے بعد ہمارے آدمیوں نے اسے گاڑی میں لفٹ دی اور پھر اسے دفتر لے آئے۔

نوجوان بول اٹھا "خدا کا شکر ہے آپ لوگ مجھے مل گئے۔ میں ایک عرصے سے انٹیلی جنس کے کسی ذمہ دار آدمی کی تلاش میں تھا تاکہ میں آپ لوگوں کو بتا سکوں کہ کچھ لوگ پاکستان میں خانہ جنگی کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ اس منصوبے کے مطابق وہ پہلے فوجی افسروں اور ان کے اہل خانہ کو قتل کریں گے اور پھر جنرل ضیاء کو بھی مار دیا جائے گا۔ یہ لوگ پاکستان کو تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں۔ بھلا میں کس طرح اپنے ہم وطنوں کا خون کر سکتا ہوں' اپنے بہادر فوجیوں کو کس طرح ہلاک کر سکتا ہوں۔" وغیرہ وغیرہ

وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہا تھا اور غصے اور خوف کے عالم میں اس کے منہ سے الٹی سیدھی باتیں نکل رہی تھیں' مگر آہستہ آہستہ اس کے حواس بحال ہونے لگے اور اس کا بیان منطقی ہونے لگا۔ اس سے ہمیں جو معلومات حاصل ہوئیں وہ ہمارے لئے خاصی اہم تھیں اور معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے معاون بھی ثابت ہوئیں۔

اس نے بتایا کہ "مجھے ڈاکٹر کنیز یوسف نے اپنے بھائی کی پاکستان لبریشن موومنٹ میں بھرتی کیا تھا۔ اور پھر چند دوسرے لڑکوں کے ساتھ لیبیا میں دہشت گردی کی تربیت حاصل کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ لیبیا میں ہمیں کیمپوں میں رکھا گیا اور مختلف ہتھیاروں، گرنیڈ، بموں کے دھماکے کرنے، مار کٹائی، چاقو چلانے، اور دہشت گردی کے دیگر طریقوں کی مکمل تربیت دی گئی۔ اس کے علاوہ ہمیں تخریب کاری پر معلومات افزاء لیکچرز بھی دیئے گئے۔ اس تربیت کا مقصد ہمیں شہری گوریلوں کے طور پر تیار کرنا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ تربیت مکمل کرنے کے بعد ہمیں پاکستان واپس بھجوایا جائے گا، پاکستان میں ہم اپنے اپنے ٹھکانوں پر احکامات کے منتظر رہیں گے اور وقت آنے پر پاکستان لبریشن موومنٹ کا ایک سینئر رکن دہشت گردی اور تخریب کاری کی مختلف کارروائیوں کے بارے میں ہمیں حتمی ہدایات اور ہتھیار مہیا کرے گا۔

دہشت گردی کا طریقہ کار یہ طے پایا تھا کہ دو یا تین افراد پر مشتمل گروپ بنا دیئے جائیں گے۔ ہر گروپ کے اراکین اپنے اعتماد کے دوستوں کو بھی "گوریلے" بنائیں گے اور کمین گاہیں بھی تلاش کریں گے اور ہائی کمان سے جو احکامات ملیں گے ان پر عمل کریں گے۔ ہمارا سب سے بڑا ہدف پاکستان کی تینوں مسلح افواج کے افسران اور فوجی تنصیبات تھیں۔ ہم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ان کارروائیوں کے عوض ہمیں بھاری معاوضہ دیا جائے گا اور ہماری موت کی صورت میں ہمارے متاثرہ خاندانوں کی بھرپور مالی امداد اور دیکھ بھال کی جائے گی اور ہمیں سرحد پار سے بھی بھرپور امداد فراہم کی جائے گی۔"

نوجوان کا کہنا تھا کہ "لیبیا کے افسروں کا رویہ اور سلوک ہمارے ساتھ انتہائی ہتک آمیز تھا۔ ہمیں زر خرید غلاموں سے زیادہ اہمیت نہ دی جاتی تھی۔ ہماری ایک ساتھی افضل توصیف ایک دن بیمار پڑ گئی تو اسے مناسب طبی امداد تک فراہم نہ کی گئی۔ اسے وعدے کے مطابق رقوم کی ادائیگی بھی نہ کی گئی۔"

نوجوان نے ہمیں لاہور میں ایک ٹریول ایجنٹ کا پتہ دیا جو ڈاکٹر کنیز یوسف کے ایجنٹ کے طور پر کام کر رہا تھا۔ ہم نے اس ایجنٹ سے رابطہ کیا اور اس سے ان تمام افراد کی فہرست لے لی، جنہیں لیبیا بھیجا گیا تھا۔ اس فہرست میں شامل کئی افراد تربیت مکمل کر کے واپس آ چکے تھے۔ بہت سے ابھی زیر تربیت تھے اور متعدد لیبیا جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پہلے پہل لیبیا میں عثمان خالد اور مرتضیٰ بھٹو کا آپس میں

رابطہ تھا۔ لیکن چونکہ عثمان خالد اپنے آپ کو زیادہ ہوشیار اور عقلمند سمجھتا تھا اس لئے اس نے مرتضٰی سے الگ پاکستان لبریشن موومنٹ کی تنظیم و ترتیب شروع کر دی۔ یعنی ڈاکٹر کنیز یوسف اور عثمان خالد نے پی پی پی سے ہٹ کر بیرونی ممالک کی مدد سے پاکستان میں تخریب کاری اور اس کی "آزادی" کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔

بہرحال پشاور سے روانہ ہونے والے دونوں دوست بذریعہ ٹرین کراچی پہنچے۔ ہماری پشاور ٹیم کے ارکان الطاف عباسی اور اس کے دوست کو کراچی ٹیم کی نگرانی میں دیکر واپس آ گئے۔

اگلے روز الطاف عباسی اور اس کے دوست نے کراچی ریلوے اسٹیشن پر مسٹر سعید کا استقبال کیا۔ ہم نے جب فارن آفس سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ مسٹر سعید نے فارن آفس سے ضروری اجازت نامہ حاصل کئے بغیر کراچی کا سفر اختیار کیا تھا۔

کراچی ریلوے اسٹیشن سے ان تینوں نے ایک ٹیکسی لی اور کراچی کی مختلف سڑکوں پر گھومتے رہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کراچی کی سیر کر رہے ہوں' ٹیکسی ڈرائیور انہیں مختلف مقامات' عمارات اور علاقے دکھا رہا تھا' جن میں نیول کمپلیکس' ڈوک یارڈ' ویسٹ وارف اور کلفٹن وغیرہ بھی شامل تھے۔

اس "تفریحی ڈرائیو" کے دوران انہیں شک ہو گیا کہ ان کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ عین ممکن ہے کہ ٹریفک کے ہجوم میں مسلسل نگرانی کرنے والے افراد ان کی نظروں میں آ گئے ہوں اور وہ پہچان لئے گئے ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ٹیکسی لیاری کے علاقے کی طرف موڑ دی۔ پھر ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ دے کر فارغ کر دیا اور گلیوں میں پیدل چلنا شروع کر دیا۔

نگرانی کا پتہ چلانے کا یہ انتہائی موزوں طریقہ تھا۔ نگرانی والے بھی پیدل ان کے پیچھے ہو لئے۔ لیکن خفیہ کھیل ختم ہو چکا تھا اور انہیں جلد ہی علم ہو گیا کہ واقعی ان کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ نگرانی والی ٹیم سے بچنے کے لئے ان تینوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ ان کے قدموں کی آواز سن کر بعض لوگ گھروں سے باہر نکل آئے اور "چور چور" کی دہائی دینا شروع کر دی۔

مسٹر سعید اور الطاف عباسی کو تو پکڑ لیا گیا مگر ان کا تیسرا ساتھی پھر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور بہت کوشش کے باوجود اس کے بارے میں کچھ علم نہ ہو سکا۔ اب صورتحال کچھ یوں تھی کہ مسٹر سعید اور عباسی لوگوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے تھے اور اس

سے پہلے کہ لوگ مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیتے ہماری ٹیم کے ارکان وہاں پہنچ گئے اور بمشکل لوگوں کو اس بات پر راضی کر سکے کہ ان "چوروں" کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ ان حالات میں صورتحال کو سنبھالنے کا اس سے اچھا طریقہ کوئی اور نہ تھا۔ لوگ ان دونوں کو پولیس اسٹیشن لے گئے۔ ہمارے نگران بھی ان کے ساتھ تھے۔

تھانے پہنچتے ہی مسٹر سعید نے اپنی سفارتی شناخت کرائی اور اسے رہا کر دیا گیا مگر الطاف عباسی کو ہماری ٹیم نے پولیس سے لے لیا اور آئی ایس آئی کے تفتیشی مرکز میں لے گئے۔

سعید سیدھا ایئر پورٹ آیا اور پہلی فلائٹ سے اسلام آباد روانہ ہو گیا۔ ان کا تیسرا ساتھی فرار ہو چکا تھا لہٰذا یہ عین ممکن تھا کہ وہ سب لوگ جن کی ہمیں تلاش تھی انڈر گراؤنڈ چلے جائیں۔ اس خدشے کے پیش نظر ہم نے فیصلہ کیا کہ جن افراد کی پہچان ہو چکی ہے ان کو گرفتار کر کے ریمانڈ لے لیا جائے' ہماری توقع کے عین مطابق مسٹر سعید نے اسلام آباد پہنچتے ہی ڈاکٹر کنیز یوسف کو خطرے سے آگاہ کیا اور مشورہ دیا کہ فوراً لندن روانہ ہو جاؤ اور اپنے تمام ساتھیوں سے کہہ دو کہ وہ کچھ عرصے کے لئے اپنی کارروائیاں ترک کر کے زیر زمین چلے جائیں۔

ہم نے جنرل ضیاء کو اس کارروائی کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ انہوں نے حکم دیا کہ ڈاکٹر کنیز یوسف کو لندن "فرار" ہونے کا موقع دیا جائے چنانچہ ڈاکٹر صاحبہ بغیر کسی رکاوٹ کے لندن اپنے بھائی کے پاس پہنچ گئیں۔

الطاف عباسی نے ہمیں اس منصوبے کی تمام جزئیات سے آگاہ کر دیا۔ ہماری معلومات میں مزید اضافہ کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ "بریگیڈیئر خالد سے ہمارا تعارف لیبیا کے برادر نے کروایا تھا۔ وہ پاکستان لبریشن موومنٹ کے نام سے ایک دہشت گرد تنظیم قائم کر چکا تھا جس کے ارکان کو لیبیا میں ہر طرح کی تربیت دی جا رہی تھی۔ اور اس کا مقصد پاکستان میں دہشت گردی کی ملک گیر کارروائیاں کرنا تھا۔" الطاف عباسی نے مزید بتایا کہ "بریگیڈیئر خالد نے لیبیا میں دہشت گردی کے ان کیمپوں کا معائنہ بھی کیا تھا۔ وہ تربیت کے لئے آنے والوں کے معیار سے انتہائی ناخوش تھا اور اس نے میرے ذریعے اپنی بہن ڈاکٹر کنیز کو پیغام بھجوایا تھا کہ تربیت کے لئے بھیجے جانے والوں کا جسمانی اور ذہنی معیار توقع کے مطابق نہیں۔ ہمیں ایسے کارکنوں کی ضرورت ہے جو ان سرگرمیوں کے لئے ذہنی طور پر سو فیصد تیار ہوں اور ہر طرح کے خطرے میں کود پڑنے کا جذبہ رکھتے ہوں اور جن کے دل میں پاکستان کی فوجی جنتا کے خلاف شدید نفرت موجود ہو۔"

عباسی نے بتایا کہ میں نے بریگیڈیئر خالد کا یہ پیغام ڈاکٹر کینیر یوسف تک پہنچا دیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ میرا پاکستان آنے کا مقصد مسٹر سعید سے رابطہ کر کے کارکنوں کی بھرتی اور تربیت کے امور طے کرنا اور پاکستان میں دہشت گردی کی کارروائیوں کے منصوبے کو حتمی شکل دینا تھا' تاہم عباسی نے اس بات کا اعتراف کیا کہ "میں محض پیسے کے حصول کے لئے یہ سب کچھ کر رہا تھا اور اس میں بھٹو کی محبت یا پیپلز پارٹی کے لئے قربانی کا کوئی جذبہ شامل نہیں تھا۔"

تفتیش مکمل ہونے کے بعد الطاف عباسی کو ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا' جہاں اس نے اپنا اقبالی بیان قلمبند کروایا' جسے مجسٹریٹ صاحب نے سربمہر کر دیا۔ دوسرے لوگوں نے بھی تقریباً وہی بیانات دیئے۔ ضابطے کی ساری کارروائی مکمل ہونے کے بعد ان سب کا مقدمہ عدالت میں پیش کرنے کے لئے تیار تھا۔

ڈی جی آئی کی ہدایت پر ہم نے فارن آفس میں سیکرٹری جنرل فارن افیئرز آغا شاہی سے ملاقات کی اور انہیں اس سازش کی ساری تفصیلات سے آگاہ کیا۔ انہوں نے ہماری رپورٹ سے پوری طرح اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ لیبیا کے دو سفارتکاروں کرنل حسین مبروک اور مسٹر سعید کو ناپسندیدہ شخصیت قرار دیا جا سکتا ہے اور حالات کے پیش نظر لیبیا کے سفارتخانے سے کہا کہ باقی تین سفارتکاروں کو دو ماہ کے اندر اندر پاکستان سے واپس بلا لیا جائے۔ سو ایسا ہی ہوا' اس پر بھی اتفاق کیا گیا تھا کہ اس خبر کو اخباروں میں شائع نہیں ہونے دیا جائے گا۔

معمول کے مطابق اب اس سازش کیس پر مزید کارروائی ایف آئی اے کی ذمہ داری تھی' کیونکہ اس کیس کے بہت سے ملزم ابھی تک زیر زمین تھے۔ مگر جب ہم نے اس ضمن میں ایف آئی اے سے رابطہ کیا تو انہوں نے یہ ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا۔ کچھ بحث ہوئی لیکن وہ نہ مانے۔ پھر جنرل کے ایم عارف نے ایف آئی اے کے ڈائریکٹر جنرل اسلم حیات کو سرکاری طور پر مشورہ دیا کہ وہ کیس اپنے ہاتھ میں لیں اور مزید کارروائی کے لئے اسے تیار کریں اور یوں ایف آئی اے والوں نے بادل نخواستہ اس کیس کو لے لیا۔

1984ء میں جب میں فریضہ حج ادا کر کے تہران واپس جا رہا تھا' دبئی ایئرپورٹ پر مجھے پیغام ملا کہ تہران جانے کی بجائے اسلام آباد پہنچو! سوچا اللہ خیر کرے کیا بات ہو گئی کہ میری فوراً اسلام آباد طلبی ہوئی ہے' بہرحال اسلام آباد پہنچنے پر معلوم ہوا مجھے اسی کیس کے سلسلے میں گواہ کے طور پر عدالت میں حاضر ہونا ہے۔

عدالتی کارروائی کے دوران مجھے احساس ہوا کہ ایف آئی اے والوں نے انتہائی عدم دلچسپی سے اس کیس کو تیار کیا تھا۔ کیس کی شکل و صورت بالکل بگاڑ کر رکھ دی گئی تھی۔ اتنے بڑے کیس پر، جس میں ملکی سالمیت کا سوال تھا اور ایک غیر ملک بھی ملوث تھا قطعاً کوئی محنت نہیں کی گئی تھی۔ چنانچہ متعدد ملزموں کو ریلیف مل گیا۔ تاہم چند ایک کو ان کے جرم کے مطابق سزائیں بھی سنائی گئیں۔

بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ لیبیا میں دہشت گردی کی تربیت حاصل کرنے والے صرف یہی لوگ نہیں تھے جنہیں ہم نے گرفتار کیا تھا بلکہ 300 افراد کا ایک اور گروپ مشرق وسطی میں نوکریاں دلوانے کے بہانے لیبیا پہنچایا گیا تھا۔ لیبیا پہنچ کر بریگیڈیئر خالد کو پاکستان میں لبریشن موومنٹ کے کمانڈر کے طور پر ان سے متعارف کروایا گیا۔ ان افراد کو مسلح تربیت حاصل کرنے کا حکم دیا گیا' مگر ان میں سے بہت سے افراد نے یہ حکم ملنے سے انکار کر دیا مگر جب انہیں بتایا گیا کہ دہشت گردی کی تربیت حاصل کیئے بغیر ان کی واپسی کا کوئی راستہ نہیں تو انہوں نے مجبوراً ہار مان لی۔ تربیت مکمل ہونے کے بعد ان میں سے 30 افراد کو پاکستان واپس بھجوایا گیا اور انہیں بتایا گیا کہ پاکستان لبریشن موومنٹ کا مقامی کمانڈر تم سے رابطہ کرے گا اور تمہیں دہشت گردی کی مختلف کارروائیوں کے بارے میں ہدایات دے گا۔ ان کارروائیوں کے عوض تمہیں بھاری معاوضے بھی دیئے جائیں گے۔ ان میں سے بہت سے افراد نے واپس آتے ہی حکام سے رابطہ قائم کیا اور انہیں سارے منصوبے سے آگاہ کر دیا۔ ان کے بیانات کو قومی پریس نے شہ سرخیوں کے ساتھ اخبارات کی زینت بنایا۔

یہ بات یقینی ہے کہ بریگیڈیئر خالد کے پاس ذاتی طور پر اتنے وسائل اور سرمایہ نہیں تھا کہ وہ اپنے منصوبوں کی تکمیل کر سکتا۔ یہ واضح طور پر غیر ملکی سرمائے اور تعاون سے پروان چڑھنے والی سازش تھی' جسے ڈائریکٹوریٹ جنرل انٹر سروسز انٹیلی جنس (آئی ایس آئی) نے اپنی حکمت عملی اور کارکردگی سے ناکام بنا دیا۔ لیبیا سازش کیس کے چند اہم کرداروں کے بارے میں چند دلچسپ واقعات قارئین کی نذر کیئے جاتے ہیں:

سردار مظہر علی

پاکستان پیپلز پارٹی کے سابق ایم پی اے سردار مظہر علی بھی ان لوگوں میں شامل تھے' جنہوں نے لیبیا میں تربیت حاصل کی تھی۔ اپنی گرفتاری کے بعد انہوں نے لیبیا سازش کیس کے ساتھ اپنے تعلق کا اقرار کر لیا۔ ابھی ان کا مقدمہ متعلقہ عدالت میں پیش نہیں ہوا تھا کہ ان کی بیگم نے لاہور ہائی کورٹ میں آئی ایس آئی کے خلاف ان کے خاوند کو جبری قید تنہائی

میں رکھنے اور سخت جسمانی اور ذہنی اذیتیں دینے کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اپنی درخواست میں انہوں نے الزامات لگائے کہ ان کے خاوند کو جسمانی اور ذہنی ایذا پہنچانے کی خاطر بجلی کے جھٹکے لگائے جاتے ہیں۔ ان کے نازک جسمانی اعضاء کو سگریٹوں سے داغا جاتا ہے اور ان کے پاؤں کے تلووں کو چھڑیوں سے زخمی کیا گیا ہے۔ اپنی درخواست میں طاہرہ مظہر علی نے اپنے خاوند سے ملنے کی اجازت بھی طلب کی۔

درخواست کی پہلی سماعت پر عدالت نے حکم دیا کہ انہیں ان کے خاوند سے ملنے کی اجازت دی جائے۔ اس خبر کو اخبارات میں کوریج دی گئی۔ ہمیں سردار مظہر علی کو ان کے اہل خانہ سے ملانے میں کوئی تامل نہیں تھا۔ ہم نے انہیں پیغام بھجوایا کہ وہ اسلام آباد آ کر سردار صاحب سے ملاقات کر سکتی ہیں۔ اگلے روز ہم سردار صاحب کو ایک مقامی ریسٹ ہاؤس میں لے گئے جہاں ان کی بیوی' بچے اور ایک اور رشتہ دار خاتون ان سے ملاقات کے لئے آئے۔ یہ ملاقات انتہائی پرسکون ماحول میں ہوئی اور ہم نے اس میں قطعی طور پر کوئی مداخلت نہ کی بلکہ سرکاری خرچ پر ان کے طعام کا بندوبست بھی کیا گیا۔

ابتدائی طور پر ہم نے اس ملاقات کا دورانیہ 2 گھنٹے طے کیا تھا' مگر مجھے ڈیوٹی افسر نے بتایا کہ طاہرہ مظہر علی نے اس ملاقات کو شام ڈھلے تک جاری رکھنے کی درخواست کی ہے۔ میں نے اس کی اجازت دے دی۔ میرا یہ فیصلہ نہ تو کسی دباؤ کی وجہ سے تھا اور نہ ہی اوپر سے کوئی سفارش آئی تھی۔ بلکہ یہ آئی ایس آئی کی کارکردگی کا ایک پرتو ہے اور مجھے یقین ہے کہ آج بھی معمول کے مطابق ایسے ہی ہوتا ہے۔ ہم نہ تو ظالم ہیں اور نہ ہی کسی کے خلاف انتقام کا کوئی جذبہ رکھتے ہیں۔

مجھے بتایا گیا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد بچوں کو باہر لان میں کھیلنے کے لئے بھیج دیا گیا اور ایک مدت سے بچھڑے ہوئے میاں بیوی نے کمرہ اندر سے مقفل کر لیا۔ حالات کے پیش نظر یہ بات انتہائی خطرناک ہو سکتی تھی۔ اور کوئی بھی مینول Manual اس حرکت کی اجازت نہیں دیتا مگر انسانی بنیادوں پر میں نے اس "وصال" پر بھی اعتراض نہ کیا بلکہ وہاں متعین عملے کو ہدایت کی کہ وہ میاں بیوی کو ڈسٹرب نہ کریں۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد وہ دونوں نہا دھو کر ہنستے مسکراتے کمرے سے باہر آئے اور ریسٹ ہاؤس کے سرسبز لان میں کافی کی ٹیبل پر اپنے بچوں کے پاس آ بیٹھے۔ یقینی طور پر بیگم مظہر علی کو اس بات کا بخوبی تجربہ ہو چکا تھا کہ سردار صاحب پر کسی قسم کا کوئی ذہنی یا جسمانی تشدد نہیں کیا گیا تھا اور وہ شاید پہلے سے بھی زیادہ صحت مند تھے۔

اگلی پیشی کے لئے ہم نے ڈپٹی اٹارنی جنرل سے کہا کہ آپ معزز عدالت کو بتا دیں کہ

ہم نے عدالت کے حکم کی تعمیل کر دی ہے۔

ڈی جی آئی جنرل اختر کو بھی پورے واقعہ کی رپورٹ دے دی گئی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا کہ تم نے "بند کمرے کی کارروائی" کی ویڈیو فلم تو نہیں بنا لی؟ مگر ہم نے انہیں یقین دلایا کہ ایسا نہیں ہوا اور میاں بیوی کو ان لمحات کو انجوائے کرنے کا بھرپور موقع دیا گیا ہے۔ لیکن موکلہ کے وکیل ملک سعید حسن نے عدالت میں موقف اختیار کیا کہ آئی ایس آئی نے عدالت کے حکم کی تعمیل نہیں کی اور موکلہ کی سردار مظہر علی سے ملاقات نہیں کرائی گی اور یہ کہ سردار مظہر علی کے ساتھ انتہائی انسانیت سوز سلوک کیا جا رہا ہے۔ اور وہ قریب المرگ ہے اور اسے فوراً ہسپتال داخل کروانے کا حکم صادر فرمایا جائے۔ اس وقت عدالت میں پیپلز پارٹی کے جیالوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ جنہوں نے ملک سعید حسن کا یہ بیان سنتے ہی آئی ایس آئی اور جنرل ضیاء کو گالیاں دینا شروع کر دیں اور حکومت کے خلاف نعرے بازی کرنے لگے۔ فاضل جج نے دونوں طرف کے بیانات سن کر ڈپٹی اٹارنی جنرل کو حکم دیا کہ اگلی تاریخ پر سردار مظہر علی کی ان کی بیگم کے ساتھ ملاقات کا ثبوت پیش کیا جائے۔

عدالت کے اس حکم کا جب ڈی جی آئی کو علم ہوا تو انہوں نے کہا "کاش! تم لوگوں نے وڈیو فلم بنا ہی لی ہوتی تو یہ عدالتی تاریخ کا بہت ہی دلچسپ اور پرلطف ثبوت ہوتا"۔ ان کے کومنٹس پر ہم صرف مسکرا دیئے۔

آئی ایس آئی کے کردار پر چونکہ حرف آ رہا تھا اور تہمت لگائی جا رہی تھی' اس لئے اگلی پیشی پر میں خود اس ملاقات کے تمام گواہان جن میں آئی ایس آئی کی ٹیم کے ارکان' ڈرائیور' گیسٹ ہاؤس کے ملازمین اور چوکیدار بھی شامل تھے' سب کو لے کر عدالت میں حاضر ہو گیا۔ معزز جج جب عدالت کی کرسی پر بیٹھے ہم سب کورٹ روم میں موجود تھے۔ ڈپٹی اٹارنی جنرل نے فاضل عدلت کو بتایا کہ آئی ایس آئی کی تمام ٹیم موجود ہے مگر ابھی تک مدعی پارٹی کا کوئی رکن عدالت میں نہیں آیا۔ معزز جج نے مجھے کٹہرے میں بلایا اور میں نے اس ملاقات کی تمام تفصیلات ان کے گوش گزار کر دیں۔ میں نے سردار مظہر علی کے روزانہ طبی معائنہ کی رپورٹ بھی پیش کی۔ جس میں ڈاکٹر نے انہیں ذہنی اور جسمانی طور پر بالکل فٹ قرار دیا تھا اور ان کے جسم پر کسی قسم کے تشدد کی نفی کی گئی تھی۔ جج صاحب نے دوسری پارٹی کا موقف سننے کے لئے آوازیں لگوائیں تو پی پی پی کے جیالوں کا ایک ہجوم کمرہ عدالت میں پہنچ گیا۔ ملک سعید حسن نے آتے ہی پھر سے وہی الزامات دہرانے شروع کئے۔ ابھی وہ الزامات کی فہرست مکمل طور پر بیان بھی نہ کر پائے تھے کہ بیگم مظہر علی نے عدالت میں آئی

ایس آئی کے ان اہلکاروں کو پہچان لیا جنہوں نے اسلام آباد میں ان کی ان کے شوہر سے ملاقات کروائی تھی۔ انہوں نے اپنے وکیل ملک سعید حسن کا بازو کھینچا اور ان کے کان میں سرگوشی کی۔ ملک سعید حسن جو انسانی حقوق کے حوالے سے ایک پر مغز تقریر کے موڈ میں تھے، فوری طور پر بولے :

"مائی لارڈ! میری موکلہ اپنی درخواست واپس لینا چاہتی ہیں۔"

"کیا آپ کی موکلہ اب اپنے خاوند سے ملاقات کی خواہش نہیں رکھتی؟" اور کیا اس کے بقول اس کے خاوند کو پہنچائی گئی، اذیتیں عدالت کے نوٹس میں نہیں لانا چاہتی؟" معزز جج نے پوچھا۔

"نہیں مائی لارڈ! وہ اب ایسا نہیں چاہتیں" ملک سید حسن نے جواب دیا۔

اب معزز جج کی باری تھی انہوں نے بڑے جچے تلے انداز میں موکلہ اور ان کے وکیل کی طبیعت درست کی۔ جنرل ضیاء کے خلاف نعرے بازی کرنے کے لئے آنے والوں کے چہروں سے شرمندگی ٹپکنے لگی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انہیں احساس ہوا کہ آئی ایس آئی ان کے اپنے ہی ملک کا ایک ادارہ ہے جس میں تیسرے درجے کی اذیتیں دینے کا نہ ہی رواج ہے اور نہ ہی قانون اس کی اجازت دیتا ہے۔ وہ ہم آئی ایس آئی والوں کو دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ہمارے خدوخال واقعی انسانوں جیسے ہیں اور ہم نہ ہی حیوان ہیں، نہ ہی درندے اور نہ ہی کوئی ماورائی مخلوق۔ موکلہ کے ساتھ آنے والی خواتین نے رونا شروع کر دیا اور مرد حضرات کی جیبوں سے رومال نکل آئے مگر درخواست مسترد ہو گئی۔

عدالت کا یہ فیصلہ آئی ایس آئی کے ایک دیانتدار قومی ادارہ ہونے کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ہم نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ آئی ایس آئی کی کسی فرد یا ادارے سے ذاتی دشمنی نہ تھی۔ ہم نے صرف بہترین قومی مفاد میں اپنے فرائض ملکی قانون کے مطابق ادا کئے تھے۔

مسز فرخندہ بخاری

دہشت گردوں کے اس ٹولے میں شامل ہونے والی ایک رکن بیگم فرخندہ بخاری بھی تھیں۔ ان کے میاں پاکستان کے معروف شاعر اور استاد پروفیسر شہرت بخاری تھے۔ ہم نے آج تک ان جیسی مشکل اور شعلہ فزا خاتون نہیں دیکھی۔ ہم جب لاہور میں ان کی رہائش گاہ سے انہیں اپنے دفتر لائے تو ہمارے لئے ان کی پیدا کردہ صورتحال کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ وہ انتہائی غلیظ گالیاں دے رہی تھیں اور گلا پھاڑ پھاڑ کر جنرل ضیاء اور مارشل لاء حکام کو صلواتیں سنا رہی تھیں۔ کوئی بھی ان کی مغلظات کے دائرے سے باہر نہیں تھا۔ ہمیں

اس میدان میں ان کی مہارت کا قائل ہونا پڑا۔ ان کے حافظہ میں غلیظ گالیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ محفوظ تھا' جسے سن کر ہمارے سنتری نے بھی کانوں میں روئی ڈال لی تھی۔ ان کا رویہ کسی طرح بھی ایک خاتون کے شایان شان نہیں تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان سے کیسے بات کی جائے۔ وہ کچھ سننے کے لئے تیار ہی نہیں تھیں' وہ ہمارے دفتر کے کاغذ اور ٹرے بھی اٹھا اٹھا کر پھینک رہی تھیں' اگر دو لیڈی کانسٹیبل ہماری مدد کے لئے نہ ہوتیں تو شاید وہ کیا کچھ نہ کر بیٹھتیں۔ انہوں نے تو اپنے کپڑے تک پھاڑنے کی کوشش کی تاکہ ہم قانون کی گرفت میں آ جائیں۔ لاہور آفس کا کمانڈر مجھے فون پر فون کر رہا تھا۔ "سر میں کیا کروں؟ بڑی پریشانی کا عالم ہے" میں نے مجبور ہو کر کہا انہیں شاہی قلعے میں بند کر دو۔ لہٰذا ہمیں مجبورا لیڈی کانسٹیبل کی نگرانی میں انہیں لاہور کے شاہی قلعے بھیجنا پڑا۔

شاید ایک بھیانک اور خوفناک تفتیشی مرکز کے حوالے سے لاہور کے شاہی قلعے کی تاریخ میں وہاں جانے والی وہ پہلی خاتون تھیں۔ قلعہ کی سحر زدہ دیواروں کے درمیان اپنے "جذبات" کی بازگشت سن کر وہ چند گھنٹوں میں ہی نارمل ہو گئیں اور ان کا رویہ بالکل تبدیل ہو گیا۔ انہوں نے لیڈی کانسٹیبل سے کہا کہ "آئی ایس آئی کے دفتر فون کر کے کسی افسر کو بلاؤ میں بات کرنا چاہتی ہوں۔"

ہمارے لاہور آفس سے ایک تجربہ کار افسر کو ان سے سوالات کرنے پر مامور کیا گیا۔ تفتیش کے دوران انہوں نے اقرار کیا کہ وہ لیبیا گئی تھیں۔ جہاں انہیں دہشت گردی کے علاوہ پاک فوج کے خلاف لیکچرز بھی دیئے گئے تھے۔ وہ پاکستان کے خلاف کارروائیوں کے حوالے سے بریگیڈیئر خالد پر بھی کڑی تنقید کر رہی تھیں۔ وہ بار بار اس دلدل میں پھنسانے پر اپنی دوست افضل توصیف کو بھی برا بھلا کہہ رہی تھیں' جس نے ڈاکٹر کنیز یوسف سے اس کا تعارف کروایا تھا اور لیبیا جانے کے لئے اکسایا تھا۔ اب چونکہ ان سے مزید معلومات کی کوئی ضرورت نہیں تھی لہٰذا انہیں ایک ریسٹ ہاؤس میں منتقل کر دیا گیا جہاں انہیں کتابیں' اخبارات اور چند انڈور گیمز مہیا کر دی گئیں تاکہ وہ اپنی خاتون گارڈز کے ساتھ وقت گزار سکیں۔

بعد ازاں ہمیں معلوم ہوا کہ جب پی آئی اے کا جہاز ہائی جیک کر کے الذوالفقار کے کارندوں نے انہیں رہائی دلوائی تھی تو شام اور لندن میں محض سیاسی مقاصد اور ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے انہوں نے آئی ایس آئی پر الزام لگایا کہ ان کے خوبصورت اور نازک جسم کو جلتے ہوئے سگریٹوں سے داغا گیا۔ تاہم اس خاتون کے بارے میں جتنا بھی کم کہا جائے بہتر ہے۔

مس افضل توصیف

وہ پیشے کے اعتبار سے استاد تھیں اور انہیں بھی ڈاکٹر کنیز یوسف نے دہشت گردی کی تربیت کے لئے لیبیا بھیجا تھا۔ انہیں جب یہ خبر ملی کہ سازش پکڑی گئی ہے تو وہ بھی زیر زمین چلی گئیں۔ ہمارا ایک آدمی ان کے گھر جاتا رہا لیکن وہ چھپی رہیں۔

ہم کیس ایف آئی اے کو دے چکے تھے' اس لئے افضل توصیف سمیت باقی افراد کو بھی تقریباً بھول چکے تھے' انہی دنوں ایک روز مجھے میرے دفتر کے استقبالیہ ڈیسک نے اطلاع دی کہ افضل توصیف نامی ایک خاتون مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ مجھے یاد آگیا کہ وہ کون ہیں' ان کا اس طرح آنا ہمارے لئے باعث حیرت تھا۔ انہیں مہمانوں کے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ سوالات کے لئے ریسٹ ہاؤس تیار کیا گیا اور ایس پی اسلام آباد سے کہا گیا کہ دو لیڈی کانسٹیبل بھجوا دیں۔ اسی اثناء میں' میں نے اپنے ایک ساتھی افسر سے کہا کہ آپ بریگیڈیئر ترمذی بن کر اس سے ملاقات کریں اور انہیں باتوں میں لگائے رکھیں۔

جلد ہی دو لیڈی کانسٹیبل آ گئیں اور افضل توصیف کو ان کے ساتھ ریسٹ ہاؤس منتقل کر دیا گیا اور ان کی موجودگی میں اسی افسر نے ان سے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ سلسلہ دو روز تک جاری رہا' مگر ان سے کوئی ایسی انفارمیشن نہ مل سکی جو پہلے سے ہمارے پاس موجود نہ ہو۔ تفتیشی افسر نے ان کا ایڈریس لے لیا اور انہیں اس ہدایت کے ساتھ گھر جانے کی اجازت دے دی کہ آپ اپنے گھر پر موجود رہیں۔ اور اگر ضرورت ہوئی تو آپ کو دوبارہ آنے کی زحمت دی جائے گی۔

وہ یہی سمجھتی رہیں کہ ان کے ساتھ بات چیت کرنے والے کا نام بریگیڈیئر ترمذی ہے۔ جب مقدمہ شروع ہوا تو مجھ سے پہلے مس افضل توصیف گواہ کے طور پر پیش ہوئیں اور انہوں نے آئی ایس آئی کے افسروں اور اہلکاروں کے رویے کی تعریف کی۔ خاص طور پر انہوں نے میرے بارے میں انتہائی نیک خیالات کا اظہار کیا' حتیٰ کہ جب میں گواہی کے لئے عدالت میں حاضر ہوا تو وکیل صفائی کے اس جملے نے مجھے قدرے شرمندہ کر دیا:

''آپ نے ریسٹ ہاؤس میں مس افضل توصیف سے کیسا ''سلوک'' کیا تھا کہ وہ آپ کی بہت تعریف کرتی ہیں اور آپ کے رویے پر خوشی کا اظہار کرتی ہیں''۔ یہ جملہ کہتے ہوئے وکیل صاحب کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی اور ان کا چہرہ کورٹ روم میں موجود سب نے دیکھا۔ میں نے کورٹ کو بتایا کہ مس افضل توصیف سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور میں نے آج تک انہیں نہیں دیکھا۔

میرے جواب پر وکیل صفائی پھر عدالت سے مخاطب ہوئے اور انہوں نے کہا کہ "بریگیڈیئر صاحب کا کہنا ہے کہ میں مس افضل توصیف سے کبھی نہیں ملا مگر وہ اسی فاضل عدالت میں حلفی بیان دے چکی ہیں کہ بریگیڈیئر صاحب مسلسل دو روز تک ایک ریسٹ ہاؤس میں ان کا بیان لیتے رہے' اور وہ انتہائی شریف آدمی ہیں۔ بریگیڈیئر صاحب کیا آپ یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ وہ کیا خاص ٹریٹمنٹ تھا جس کا مظاہرہ آپ نے دو روز تک اپنی تفتیش کے دوران کیا؟"

وکیل صاحب کے جملے خاصے ذو معنی تھے۔ یہ عدالتی کارروائی جیل کے ایک کمرے میں لگائی گئی خصوصی عدالت میں ہو رہی تھی۔ جہاں اس کیس کے دیگر ملزمان بھی موجود تھے۔ وکیل صاحب کے اس سوال پر ان کے چہروں پر بھی مسکراہٹیں بکھر گئیں اور وہ ایک دوسرے کو کہنیاں مارنے لگے۔ میں نے عدالت کو بتایا "میرے نام سے ایک اور افسر تفتیش کر رہے تھے اور خفیہ اداروں میں یہ طریقہ کار غیر معمولی نہیں ہے کہ ہم اپنی اصلی شناخت چھپانے کی خاطر اور موقعہ محل دیکھ کر اپنا کوئی بھی "نام" رکھ لیتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ میرا نام اس لئے استعمال کیا گیا کیونکہ مس افضل توصیف مجھے ملنے کے لئے آئی تھیں۔ انہوں نے میرے دفتر میں آ کر میرا ہی نام لیا تھا۔ شاید انہوں نے کسی سے میرا نام سن رکھا تھا۔ اس لئے تفتیشی افسر کو اپنا اصل نام بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے عدالت میں جو بیان دیا ہے وہ بالکل درست ہے مگر میں جو کہہ رہا ہوں یہ بھی حقیقت ہے۔" میرا خیال ہے میں نے اپنے آپ کو کامیابی سے وکیل صفائی کے اس جال سے نکال لیا جو انہوں نے ایک اہم گواہ کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے بنا تھا۔ عدالت نے سچ کو سچ مان لیا اور میری گلو خلاصی ہو گئی۔

مس افضل توصیف نے اس قصے پر ایک کتاب "لیبیا سازش کیس" بھی لکھی جس میں انہوں نے اپنی تنہائیوں کا بہت ہی شاعرانہ انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ کتاب کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ کیسے آئی ایس آئی والوں سے چھپتی مختلف شہروں اور دوستوں کے گھروں میں مہمان رہیں اور آخر کار کسی نے انہیں بتایا کہ آئی ایس آئی میں بریگیڈیئر ترمذی نامی ایک شخص ہے' وہ اچھا آدمی ہے اس سے مل لو تو آسانی ہو جائے گی' اسی لئے انہوں نے سوچا کہ ایک بچے کے ساتھ خوف کی صورت میں مسلسل در در کی ٹھوکریں کھانے سے بہتر ہے کہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیا جائے۔ ان کا فیصلہ غلط نہیں تھا' انہیں نہ ہی کوئی ذہنی اور نہ ہی جسمانی کوفت ہوئی اور کوئی سزا بھی نہ ملی۔

کرنل حسین امام مبروک

1981ء میں میں نے پھر کرنل حسین کو تہران میں ایک سفارتی تقریب میں دیکھا۔ میرے استفسار پر مجھے بتایا گیا کہ کرنل حسین کو تہران میں لیبیا کے سفارتخانے میں برادر سفارتکار Diplomate Brother کے طور پر تعینات کیا گیا ہے۔ مجھے شک تھا کہ انہیں شاید پاکستان کے خلاف "تھرڈ کنٹری بیس" تخریبی کارروائیوں کے لئے تعینات کیا گیا ہے۔ کیونکہ انہیں پاکستان سے ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر نکالا گیا تھا۔ (شاید میرا شک غلط ہو) میں نے اسی وقت ایران کے دفتر خارجہ کے پروٹوکول آفیسر سے پوچھا کہ کیا تم کرنل حسین امام کو جانتے ہو اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈال سکتے ہو؟ پروٹوکول آفیسر نے صرف اتنا بتایا کہ یہ تو کوئی کرنل نہیں اس کا نام صرف حسین امام ہے اور اسے حال ہی میں یہاں تعینات کیا گیا ہے۔ میں نے اسے ساری کہانی سنائی کہ کس طرح وہ پاکستان دشمن سرگرمیوں میں ملوث رہا ہے اور اسے ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر ملک سے نکالا گیا تھا۔ میں نے پروٹوکول آفیسر سے اپنے خدشات کا اظہار بھی کیا۔

اس روز کے بعد سے کرنل حسین کو تہران میں نہ دیکھا گیا۔ میں نے اس پر سکھ کا سانس لیا اور اپنے ایرانی دوستوں کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے ان حالات میں جبکہ عراق کے خلاف جنگ میں انہیں لیبیا کی حمایت کی سخت ضرورت تھی انہوں نے لیبیا کے ایک ایسے سفارتکار کو تہران میں رہنے کی اجازت نہ دی جو پاکستان سے نکالا جا چکا تھا۔ اور پاکستان کی سلامتی کے لئے خطرناک ہو سکتا تھا۔



یہ بھی کوئی دوستی ہے؟

یہ بات ہمارے لئے قدرے حیران کن تھی کہ پاکستان لبریشن موومنٹ کیس کے پکڑے جانے کے بعد اور اسلام آباد میں لیبیا کے سفارتخانے کی تقریباً "صفائی" کے بعد جو نیا عملہ تعینات کیا گیا' اس نے بھی اپنے پیش روؤں کا سا رویہ جاری رکھا۔ یعنی وہ بے خوف و خطر اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق مروجہ سفارتی آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پاکستان میں ہر جائز و ناجائز کام کرنے کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ ان کا دائرہ کار اب بھی لیبیا کے ویزے حاصل کرنے والے پاکستانی محنت کشوں کے ہجوم اور ریکروٹنگ ایجنٹس تک محدود تھا اور وہ اب بھی اپنے قومی اور ذاتی مفادات کے حصول کے لئے یہی چینل استعمال کر رہے تھے۔

ہمارے ذرائع نے ہمیں اطلاع دی کہ المرتضیٰ نامی ایک ریکروٹنگ ایجنسی کو جو کسی مسٹر بخاری نے لائبیریا میں رجسٹر کروائی تھی' 5 ہزار ریٹائرڈ فوجی یا سابقہ پولیس اہلکار لیبیا برآمد کرنے کا کنٹریکٹ دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں نہ تو کوئی اخباری اشتہار دیا گیا اور نہ ہی دیگر ذرائع سے اس کی تشہیر کی گئی بلکہ یہ کام ذاتی تعلقات سے انتہائی خفیہ انداز میں کیا جا رہا تھا اور پانچ مقامی ایجنسیوں کو اس کا ٹھیکہ دیا گیا تھا۔ مقامی ریکروٹنگ ایجنسیاں 14 ہزار روپے فی ریکروٹ معاوضہ وصول کر رہی تھیں اور ان سے ایک ایسے معاہدے پر دستخط کروائے جا رہے تھے جس کے مطابق ان کے تمام حقوق اور مفادات کا سودا کیا جا رہا تھا۔ یہ معاہدہ بھیڑ بکریاں خریدنے کے مترادف تھا۔ سابق فوجی اور پولیس کے جوان دھڑا دھڑ بغیر سوچے سمجھے بھرتی ہو رہے تھے اور پیسے بھی دیتے جا رہے تھے' وہ شاید فارم کو اچھی طرح پڑھ بھی نہیں رہے تھے کہ وہ کس معاہدے پر دستخط کر رہے ہیں۔

پاکستان سے ان کی روانگی بھی خفیہ رکھی جا رہی تھی۔ ریکروٹنگ ایجنٹوں نے ان سے پاسپورٹ حاصل کر لئے تھے اور انہیں کراچی میں ایک مقام پر اکٹھے ہونے کا وقت اور تاریخ بتا دی تھی۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ انہیں لیبیا میں سرکاری عمارات اور بینکوں میں گارڈ کی حیثیت سے بھرتی کیا جا رہا ہے۔

اس وقت خطے کی سیاسی صورتحال کچھ ایسی تھی جس سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ فوج کے تربیت یافتہ ان ریٹائرڈ افراد کو کسی دوسرے ملک کے خلاف لڑائی میں استعمال کیا

جا سکتا ہے۔ مشرق وسطیٰ کے فوجی تنازعے کے علاقے میں پاکستان کے سابق فوجیوں کی کسی محاذ پر اتنی بڑی تعداد ہمارے لئے سنگین سیاسی مسائل کھڑے کر سکتی تھی۔

یوں بھی ریٹائرڈ فوجیوں کی اس انداز میں بھرتی غیر قانونی تھی کیونکہ ایک سابق فوجی افسر کے لئے دوسرے ملک میں ملازمت حاصل کرنے کے لئے جی ایچ کیو کے ویلفیئر اور ری ہیبلی ٹیشن ڈائریکٹوریٹ اور دوسرے رینکس کے لئے اپنے متعلقہ رجمنٹل سینٹر سے این او سی لینا ضروری ہوتا ہے۔ دوسری قابل توجہ بات یہ تھی کہ ان میں سے متعدد ریٹائرڈ فوجیوں نے اس ویزا کے حصول کے لئے اپنے قیمتی اثاثے فروخت کر کے رقوم جمع کی تھیں۔ یہ بہرحال ایک غیر اخلاقی' ظالمانہ اور غیر انسانی معاملہ تھا۔ اور ساتھ ہی ان سے غلامی کے ایک معاہدے پر دستخط کروائے جا رہے تھے۔ ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ اگر یہ اطلاع فوج کے حاضر سروس جوانوں تک پہنچ گئی تو شاید ان میں سے کئی ایک فوج سے استعفیٰ دے کر وہ بھی اس سروس کے لئے لیبیا چلے جائیں۔

آئی ایس آئی کے پاس اس کیس کو اپنے ہاتھ میں لینے کی ایک سے زیادہ وجوہات تھیں۔ ہم نے دفتر خارجہ سے رابطہ کیا اور ان کی توجہ اس طرف دلائی' مگر انہوں نے حسب معمول بیورو کریٹک رویے کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے لیبیا کے سفارتخانے کو معمول کا ایک خط ارسال کیا۔ ظاہر ہے وہ کسی طرح بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا۔ لیبیا کے سفارت خانے نے اسے ایک پرائیویٹ ریکروٹنگ بزنس قرار دیتے ہوئے اس پر مزید خط و کتابت کرنا بھی گوارا نہ کیا۔ انہوں نے اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا کہ ان افراد کو لیبیا کے ویزے بہرحال لیبیا کے سفارتخانے ہی نے جاری کرنے ہیں اور یوں وہ اس بزنس میں براہ راست ملوث ہوتے ہیں۔ ہمارے دفتر خارجہ کی کارکردگی بس اس حد تک محدود رہی۔

ہم نے اس کیس پر مختلف ترجیحات کو سامنے رکھ کر غور کیا۔ پہلی ترجیح تو یہ تھی کہ اپنے آدمیوں کی ایک مخصوص تعداد کو بھرتی کروا کے لیبیا بھجوا دیا جائے جو وہاں جا کر گروپ لیڈرز بن جائیں گے۔ یوں وہ ہمیں معلومات بھی فراہم کرتے رہیں گے اور کسی بھی غلط کام پر مجبور کئے جانے کی صورت میں بغاوت بھی کر سکیں گے۔ مگر آئی ایس آئی کے لئے اس پر عمل کرنا اس لئے ممکن نہ تھا کہ ہمارے پاس ریکروٹنگ ایجنٹوں کو دینے کے لئے درکار فنڈز نہ تھے۔ ڈی جی آئی نے ہمیں ہدایات دیں کہ ہم اس سلسلے میں کم سے کم مداخلت کا راستہ اختیار کریں یا پھر اسے بھول جائیں۔ ڈی جی آئی کے ریمارکس یہ تھے:

"انہیں جہنم میں جانے دو۔ ہمارے پاس اور بہت کام ہیں جن کی اہمیت اس سے زیادہ ہے۔"

مگر وسیع ترین قومی مفاد میں ہم نے اس کیس کو ترک نہ کیا۔ ہمیں پہلے دو دستوں کی روانگی کے شیڈول اور فلائیٹ نمبر کا علم ہو گیا۔ چنانچہ ہم نے صورتحال سے نمٹنے کی تیاری مکمل کر لی۔ پہلی پرواز سے جانے والے افراد کو کراچی میں ایک خفیہ مقام پر اکٹھا کر کے ان کے پاسپورٹ ان کے حوالے کیئے گئے اور کراچی ایئرپورٹ پر کھڑے ایک چارٹرڈ طیارے میں انہیں سوار کرا دیا گیا۔ جہاز کے دروازے بند ہوئے اور اس نے رن وے پر دوڑنا شروع کر دیا۔ ایئرپورٹ کی عمارت سے کچھ فاصلے پر جہاز اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ رک گیا۔ جہاز کے دروازے کھلے اور لیبیا میں ایک خوشحال اور خوبصورت زندگی کے خواب دیکھنے والوں کے سامنے ایک غیر متوقع منظر تھا۔ پولیس کی گاڑیوں نے جہاز کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

تمام افراد کو جہاز سے اتار لیا گیا اور انہیں بتایا گیا کہ تمہیں این او سی اور امیگریشن حکام سے اجازت کے بغیر غیر قانونی طور پر ملک سے باہر جانے کے جرم میں حراست میں لیا جا رہا ہے۔ انہیں گرفتار کر کے ایف آئی اے کے حوالے کر دیا گیا جہاں ان کے خلاف فرداً فرداً مقدمات درج کر لئے گئے۔ دو روز کے بعد دوسرے گروپ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

ملکی قوانین کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں ریکروٹنگ ایجنٹوں خورشید عمر' مسز خورشید' عبدالحمید مرزا' تاج عباسی اور محمد یعقوب مرزا کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

جب یہ لوگ پروگرام کے مطابق لیبیا نہ پہنچے تو اس دھندے میں ملوث افراد کی تشویش لازمی تھی۔ نتیجتاً اگلے گروپوں کو بھجوانے کا سلسلہ رک گیا' جنہوں نے چودہ چودہ ہزار روپیہ دیا ہوا تھا وہ ریکروٹنگ ایجنسیوں کے مالکان کو ڈھونڈ رہے تھے۔ اور اندر ہی اندر ایک افراتفری کا عالم تھا۔

ہم ڈی جی آئی اور صدر پاکستان کو حالات سے مکمل طور پر باخبر رکھے ہوئے تھے۔ چند روز کے بعد میرے ایک پرانے دوست اور ساتھی کرنل مجھے ملنے آئے۔ گفتگو کے دوران انہوں نے مجھ سے اس کیس کے بارے میں بات شروع کی۔ جلد ہی وہ مطلب کی بات پر آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ مجھے المرتضیٰ کے مالک بخاری نے بھیجا ہے' جو اس وقت راولپنڈی کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے اور وہ اس سلسلے میں کسی بھی قیمت پر آپ سے معاملہ طے کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کرنل کو اس کیس پر سرکاری نقطہ نظر سے آگاہ کیا مگر کرنل نے اپنی پیشکش اور زیادہ واضح طور پر بیان کر دی۔ انہوں نے کہا کہ ایک دوست کی

حیثیت سے میں اس معاملے کو ختم کرنے کے لئے بیچ بچاؤ کروانا چاہتا ہوں اس سے سب کا بھلا ہو گا۔

"تو! کرنل میں کچھ نہیں کر سکتا۔" میرا جواب سن کر وہ "آئی سی" کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے:

"میں ایک ریٹائرڈ فوجی افسر ہوں اور ان دنوں نوکری کی تلاش میں ہوں۔ کل کو آپ بھی ریٹائر ہوں گے' میری طرح در بدر نوکری کے لئے بھیک مانگیں گے۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کوئی بھی آپ کی حالت پر ترس نہیں کھائے گا۔ آپ کی ایمانداری اور اصول پسندی اپنی جگہ بجا' مگر یہ آپ کے بچوں کا پیٹ نہیں بھرے گی۔ آج آپ کے پاس بخاری جیسے امیر آدمی پر احسان کرنے کا بہترین موقع ہے۔ وہ لندن میں شاہانہ زندگی گزار رہا ہے۔ اس کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ اگر آج آپ اس پر احسان کر دیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ آپ کی خواہش اور طلب کے مطابق آپ کی خدمت کرے گا" وغیرہ وغیرہ۔

میں نے کہا "میری ریٹائرمنٹ کے بعد میری اور میرے بچوں کی خوشحالی میں آپ کی دلچسپی کے کے لئے آپ کا شکریہ' لیکن میں اصول اور قانون کے خلاف ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" یہ سن کر کرنل یہ کہتے ہوئے میرے کمرے سے رخصت ہو گئے "بخاری کے بھی ہاتھ بڑے لمبے ہیں"

اگلے روز مجھے بخاری کا فون آیا۔ اس نے کہا "میں بخاری بول رہا ہوں اور مجھے آپ سے ملنا ہے' کوئی مناسب وقت دیجئے۔"

میں نے کہا "میں آپ کو نہیں جانتا کوئی کام ہو تو بتایئے' ورنہ میں آپ سے نہیں مل سکتا" اور یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد پھر فون کی گھنٹی بجی۔ بخاری ایک بار پھر لائن پر تھا۔ اس نے کہا "میں پولیس کے زیر حراست افراد کے بارے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں" میں نے پھر اس سے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ اب وہ گڑگڑانے لگا "پلیز' مجھے ملاقات کا ایک موقع دیجئے یا میرے ہوٹل کے کمرے میں تشریف لے آیئے' میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے" اس کا گڑگڑا کر بات کرنا مجھے قائل نہ کر سکا اور میں نے ملاقات سے صاف انکار کر دیا۔

چند روز کے بعد ایک اور "شریف آدمی" میرے ایک دوست کے ہمراہ میرے گھر آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں زیر حراست ریکروٹنگ ایجنٹ عبدالحمید کا کزن ہوں۔ عبدالحمید کو

ایک بار معاف کر دیا جائے تو ہم ہمیشہ کے لئے ریکروٹنگ کا مکروہ دھندا ہی چھوڑ دیں گے۔ ہم امیگریشن' ایف آئی اے اور پولیس کی نت نئی کارروائیوں سے تنگ آ چکے ہیں۔ بھرتی کیئے جانے والے افراد کے اہل خانہ الگ ہماری جان کے در پے ہیں۔ ہر کوئی ہم سے حصہ مانگ رہا ہے۔ اس صورتحال نے ہمیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے اور ہماری عزت نفس' شرمناک حد تک مجروح ہو چکی ہے۔"

میں نے اسے بتا دیا کہ معاملہ میری پہنچ سے باہر ہے اور میں کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ ایک بار پھر گویا ہوا:

"سر! حمید کا کہنا ہے کہ جب وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے آیا تھا اس کے پاس صرف ڈیڑھ سو روپے تھے مگر اب اس کے پاس دس ملین (ایک کروڑ) روپے سے بھی زیادہ کا سرمایہ ہے۔ اس نے اپنی رہائی کے بدلے اپنے تمام اثاثے آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی پیشکش کی ہے۔"

پہلے تو میرا خیال تھا کہ وہ محض مذاق کر رہا تھا' مگر بعد میں مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اپنی پیشکش میں سنجیدہ ہے۔ چونکہ وہ میرے دوست کے ہمراہ آیا تھا' لہٰذا میں نے اسے تمام قانونی نکات سے آگاہ کیا اور کہا کہ میں حمید کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ پھر وہ مجھ سے یہ وعدہ بھی لینا چاہتا تھا کہ حمید کا کیس فوجی عدالت کی بجائے سول عدالت میں بھجوایا جائے۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ فیصلہ کرنا پولیس اور ایف آئی اے کا کام ہے۔ اور میں اس سلسلے میں بھی کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ تاہم وہ جانے لگا تو میں نے باتوں باتوں میں اس سے کہا کہ "حمید اور اس طرح کے دوسرے لوگ جو غریب محنت کشوں اور بے روزگار لوگوں کو ان کے آخری اثاثوں سے بھی محروم کر دیتے ہیں' مجرم ہیں اور انہیں اس جرم کی کچھ نہ کچھ سزا تو ضرور ملنی چاہیئے۔"

گھر کے دروازے پر جب میں انہیں رخصت کر رہا تھا تو میری 1963ء ماڈل کی کارٹینا کار دیکھ کر اس نے کہا:

"سر کم از کم آپ ہمیں اپنی گاڑی بدلنے کی اجازت تو دے دیں۔ یہ کار تو کسی طرح بھی ایک بریگیڈیر کے شایان شان نہیں ہے۔"

اس کی یہ آفر اونٹ کی کمر پر آخری تنکے کے بوجھ کے مترادف تھی۔ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں اپنی فوجی زبان میں اس پر برس پڑا اور اسے ایک کک بھی دے ماری۔ میرے اس غیر متوقع عمل پر وہ معافیاں مانگتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔

اس واقعہ کے چند روز بعد ہمیں وزارت داخلہ سے وزیر داخلہ کا ایک "حکم نامہ" موصول ہوا جس میں کہا گیا تھا:

"لیبیا کے ساتھ ہمارے برادرانہ تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اس زر مبادلہ کی خاطر جو لوگ لیبیا سے پاکستان بھجوایا کریں گے اور ان سابق فوجیوں کی ری ہیبلیٹیشن کے پیش نظر اس کیس کو ختم کر دیا جائے اور ان لوگوں کو رہا کر کے لیبیا جانے کی اجازت دے دی جائے"

اس سرکاری نوٹ پر ہم نے ان الفاظ میں اپنا نقطہ نظر واضح کیا:

1- اگر لیبیا کی حکومت تجربہ کار افرادی قوت کی خواہاں ہے تو وہ حکومت پاکستان سے رابطہ کرے اور مطلوبہ افراد کی تعلیمی قابلیت' تجربے اور عہدوں کے بارے میں تفصیلات بتائے تاکہ مختلف ریجمنٹل سینٹرز سے انہیں موزوں افراد مہیا کئے جا سکیں۔ اس صورت میں یہ افراد سرکاری ڈیوٹی پر ہوں گے اور ان کی تمام مراعات اور حقوق جن میں تنخواہ' الاؤنسز' چھٹی' میڈیکل اور انشورنس وغیرہ کی سہولتیں شامل ہونی چاہیں دونوں حکومتوں کے درمیان ہونے والے معاہدے کا حصہ ہوں گی۔

2- ہمیں یہ یقین دہانی بھی حاصل کرنا ہو گی کہ ہمارے ان تجربہ کار فوجیوں کو کسی دوسرے ملک کے خلاف کرائے کے فوجیوں کے طور پر استعمال نہیں کیا جائے گا۔

3- منتخب شدہ افراد کو 14 ہزار فی کس کے حساب سے کسی ریکروٹنگ ایجنسی کو ادا نہیں کرنا پڑیں گے۔

4- ہمارے پاس ریزرو فوجیوں کی ایک فہرست موجود ہے۔ اس فہرست میں شامل بہترین افراد کو لیبیا کے ساتھ ہونے والے معاہدے کے تحت لیبیا بھجوایا جائے تو بہتر ہو گا۔

5- گرفتار شدہ افراد میں کچھ ایسے فوجی بھی شامل ہیں' جنہیں قواعد کی خلاف ورزی کرنے پر فوج سے نکالا گیا تھا۔ یہ لوگ بیرون ملک جا کر بدنامی کا باعث بن سکتے ہیں۔

6- بھرتی کا طریقہ کار درست خطوط پر استوار نہیں کیا گیا۔

ان حقائق کی بنیاد پر ہم نے یہ کیس واپس لینے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ فائل وزارت داخلہ سے ہمارے پاس واپس تو نہ آئی مگر میرے ایک پرانے دوست ضیاء حسن کا ٹیلی

فون آیا جو ان دنوں وزارت داخلہ میں جوائنٹ سیکرٹری تھے۔ انہوں نے کہا "مسٹر بخاری کے "بڑوں" سے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ اس لئے آپ کو بخاری سے براہ راست بات کر لینی چاہئے۔" میں نے ان سے بھی یہی کہا کہ اس کیس میں میرا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے اور یہ محض اصولوں اور ملکی قانون کی بالادستی کا معاملہ ہے۔ میں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ ان افراد کو گارڈ کے طور پر بھرتی نہیں کیا گیا بلکہ ان سے کرائے کے فوجیوں کا کام لیا جائے گا۔

چند روز بعد ڈی جی آئی' جنرل اختر نے مجھ سے اس کیس کی پراگریس کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اب تک ہونے والی کارروائی ان کے گوش گزار کر دی۔ انہوں نے کہا کہ بخاری مجھ سے ملنے آ رہا ہے۔ میں نے جنرل اختر سے پوچھا کہ بخاری نے آپ تک رسائی کیسے حاصل کر لی؟ جنرل صاحب نے بتایا کہ مجھے ایک سینئر جرنیل نے فون کیا تھا اس لئے میں انہیں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے وعدہ کرنا پڑا کہ ممکن حد تک مدد کر دوں گا۔"

میں نے ڈی جی آئی کو بخاری اور حمید کی جانب سے مجھے رشوت کی پیشکش کے بارے میں بتایا۔ میں نے جنرل صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ بخاری سے ملاقات نہ کریں تو بہتر ہے کیونکہ عین ممکن ہے کہ وہ یہاں سے جا کر یہ بات مشہور کر دے کہ وہ آپ کے پی اے کو آپ کا "حصہ" دے آیا ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے لئے آپ' اور آئی ایس آئی کے بارے میں لوگوں کی زبانیں بند کرنا بہت مشکل ہو گا۔ آپ سفارش کرنے والے جرنل صاحب سے کہہ دیں کہ ہم بخاری کی مدد کرنے کے لئے تیار ہیں مگر وہ سرکاری طور پر معاہدہ کرے اور ہمیں مطلوبہ افراد کی تعداد بتائے تاکہ قانون اور ضابطہ کے مطابق ہم اپنے رجمنٹل سنٹر سے اسے یہ افرادی قوت مہیا کر سکیں۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم اپنے سابقہ فوجیوں اور پاکستان کے مفادات کا تحفظ کر سکیں گے۔ میری اس درخواست پر جنرل اختر کا ردعمل قابل تحسین تھا۔ انہوں نے بخاری سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد میں اپنی اگلی پوسٹنگ پر چلا گیا اور میری جگہ کرنل امتیاز (بریگیڈیر امتیاز' ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو جنہیں میاں نواز شریف کے وزارت عظمیٰ کے دور میں ان کے ایک بااعتماد ساتھی کے طور پر شہرت حاصل ہوئی) نے مجھ سے ڈی جی آئی بی کے عہدے کا چارج لے لیا۔ ان کے چارج لینے کے چند روز بعد میں نے اخبارات میں یہ خبر پڑھی کہ 3 ہزار سابقہ فوجی اور پولیس اہلکاروں کو لیبیا بھجوایا گیا تھا' مگر وہاں انہیں تریپولی' ال گیلان' ال کفرا اور ال شوارف کے کیمپوں میں قیدیوں کی طرح رکھا گیا ہے۔ اخبار کے مطابق ان لوگوں کو مجبور کیا جا رہا تھا کہ ضروری فوجی تربیت حاصل کرنے کے بعد چاڈ اور

مصر کے خلاف لڑائی میں حصہ لیں۔ اطلاع کے مطابق انکار پر بہت سے جوانوں کو تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ ان میں سے ایک قیدی کسی طرح ایک کیمپ سے فرار ہو کر پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے پاکستان میں اپنے اور دوسرے دوستوں کے رشتہ داروں سے مل کر حکومت پاکستان سے رجوع کیا' جلوس نکالے' اخبارات میں خبریں چھپوائیں' گھیراؤ کئے' تب کہیں جا کر سرکار نے ان کی مدد کا فیصلہ کیا۔ ایک دوسرے اخبار میں شائع ہونے والی خبر کچھ اس طرح تھی:

2700 پاکستانی' مصیبت میں

وفاقی وزیر محنت افرادی قوت اور سمندر پار پاکستانی' غلام دستگیر خان عیدالضحیٰ کے فوراً بعد ایک ٹیم لے کر ترپولی روانہ ہو رہے ہیں۔ یہ ٹیم لیبیا کے حکام سے ان 2700 پاکستانیوں کی رہائی اور وطن واپسی کے بارے میں مذاکرات کرے گی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ لیبیا کے مختلف کیمپوں میں شدید مشکلات کا شکار ہیں۔ لیبیا میں پاکستانی سفارتخانے کے حکام' کوششوں کے باوجود ان لوگوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکے۔ ان افراد کو راولپنڈی کے 5 ریکروٹنگ ایجنٹوں نے المرتضیٰ ایسوسی ایٹس کے ایماء پر لیبیا میں اہم مقامات پر گارڈز کے فرائض انجام دینے کے لئے بھرتی کیا تھا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سب افراد سابقہ فوجی ہیں' جنہیں ہتھیاروں کے استعمال کی مزید تربیت دی گئی ہے اور لیبیا کی حکومت نے انہیں یہ ہتھیار مہیا کرنا تھے۔

المرتضیٰ ایسوسی ایٹس لائبیریا میں رجسٹرڈ ہے اور اس کے مالک پاکستانی ہیں جنہیں بخاری برادرز کے نام سے جانا جاتا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ان کا تعلق اٹک سے ہے۔ گزشتہ دو ماہ سے مختلف اخبارات میں درجنوں ایسے خطوط شائع ہوئے ہیں جن میں دو سال کے لئے بھرتی کئے گئے ان افراد پر لیبیا کے کیمپوں میں ہونے والے مظالم کی داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ ان اطلاعات کی بنیاد پر حکومت نے پانچوں مقامی ریکروٹنگ ایجنٹوں کے لائسنس منسوخ کر دیئے ہیں اور ان کی سیکورٹیز ضبط کر لی ہیں' تاہم یہ اقدام کچھ عرصہ پہلے ان نظربندوں کے رشتے داروں کی جانب سے ایک اعلیٰ سرکاری اہلکار کے گھیراؤ کے بعد کیا گیا ہے۔

بتایا گیا ہے کہ دارالحکومت میں یہ واقعہ اخباری اطلاعات یا ان خطوط کی وجہ سے اعلیٰ حکام کے نوٹس میں نہیں آیا بلکہ سرکاری ایجنسیوں کو اس واردات کا پہلے دن ہی سے علم تھا کہ ان افراد کو کس مقصد کے لئے بھرتی کیا جا رہا ہے۔

باوثوق ذرائع کے مطابق حکام کے علم میں یہ بات بہت پہلے سے تھی کہ لیبیا کی حکومت

نے المرتضیٰ ایسوی ایٹس کے ساتھ سیکورٹی کے فرائض انجام دینے کے لئے دنیا بھر سے 3 سے 5 ہزار افراد کی بھرتی کا معاہدہ کیا تھا۔ اس معاہدے کی بعض شقوں کے مطابق ان افراد کو یہ فرائض لیبیا کی حکومت کی نگرانی میں انجام دینا تھے اور حکومت ہی ان کی تنخواہ وغیرہ کی ادائیگی کی ذمہ دار تھی۔ یہ معاہدہ برن (سوئزرلینڈ) میں کیا گیا تھا جہاں پاکستانی سفارتخانے نے اس کی توثیق کی تھی۔ بعدازاں ترپولی میں پاکستانی سفارتخانے کے لیبر اتاشی نے بھی اس معاہدے کی توثیق کرتے ہوئے اس پر دستخط کیے تھے۔ المرتضیٰ ایسوسی ایٹس کے پاس چونکہ پاکستان میں کوئی ریکروٹنگ لائسنس نہیں تھا اس لئے انہوں نے راولپنڈی کے 5 سب ایجنٹوں کو اس معاہدے کی تکمیل کے لئے منتخب کیا۔ اس مقصد کے لئے ان ایجنٹوں کو باقاعدہ پاور آف اٹارنی دی گئی' جس کی توثیق اسلام آباد میں لیبیا کے سفارتخانے سے حاصل کی گئی۔

لیبیا کے سفارتخانے نے یہ سرٹیفکیٹ بھی جاری کیا کہ المرتضیٰ ایسوسی ایٹس کو گارڈز کی بھرتی کا اختیار دیا گیا ہے اور اس ضمن میں انہیں ضروری ویزے بھی جاری کئے جا رہے ہیں۔ تاہم مسٹر بخاری نے مقامی ایجنٹوں کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ بھرتی شدہ افراد سے فوجی یا پیرا ملٹری نوعیت کی ڈیوٹی نہیں لی جائے گی اور انہیں کسی دفاعی مقصد کے لئے استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اطلاعات کے مطابق امیگریشن بیورو' دفتر خارجہ حتیٰ کہ سٹیٹ بینک کو بھی اس سارے معاملے کی خبر تھی۔

بھرتی شدہ افراد کے پہلے دستے کو کراچی ائیرپورٹ پر کاغذات کی جانچ پڑتال کے لئے روک لیا گیا تھا۔ ان میں سے جن سابقہ فوجیوں کے کاغذات درست نہیں پائے گئے انہیں روک لیا گیا تھا' تاہم باقی افراد کو جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ ان میں سے متعدد سابقہ فوجی اپنے متعلقہ اداروں سے این او سی حاصل کرنے کے بعد لیبیا روانہ ہوئے تھے۔ بعدازاں کئی اور گروپوں کو جانے سے روکا گیا مگر بالآخر "رکاوٹیں" دور کروا لی گئیں اور اس سال جون تک یہ سلسلہ جاری رہا اور بالآخر 2700 پاکستانی بھرتی ہو کر لیبیا پہنچ گئے۔

(دی مسلم 5 اکتوبر 1981ء)

اب یہ نتیجہ اخذ کرنا قارئین کا کام ہے کہ یہ لوگ لیبیا کس طرح پہنچے۔ کس کس کی جیبیں بھری گئیں' ہمارے کون کون سے حکام اور دفاتر اتنے خودغرض ہو گئے تھے کہ انہوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے ان ہزاروں پاکستانیوں کو جسمانی' ذہنی اور اقتصادی طور پر اس حالت کو پہنچا دیا۔ کیا کوئی قانون ایسا نہیں کہ متعلقہ حکام کی گرفت ہو سکے؟ خدا ہم سب کے حال پر رحم کرے۔

○

قراقرم ہائی وے اور روسی سفارتکار

اسلام آباد میں روسی سفارتکاروں کا رویہ ہمیشہ سے مختلف رہا ہے۔ وہ زیادہ تر سماجی تقریبات اور عام اجتماعات میں شرکت سے گریز کرتے تھے۔ کچھ یہی حال ہماری جانب سے بھی تھا۔ ہمارے اور روسیوں کے درمیان ایک نفسیاتی خلیج پائی جاتی تھی اور "سرخ روسیوں سے دور رہو" ہماری تربیت کا حصہ بن چکا تھا۔ ان کے ساتھ سماجی تعلقات اور دوستیاں استوار نہ کرنے کی بھی ہم پر پابندی تھی۔ یہاں تک کہ ہم ان کی کسی کار کا پیچھا بھی کم ہی کرتے تھے کیونکہ روسی اس معاملے میں ہمیشہ سخت ردعمل کا مظاہرہ کرنے میں مشہور تھے اور اکثر خفیہ والوں کی گاڑی سے اپنی گاڑی ٹکرانے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

جب ہم نے روسیوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کا فیصلہ کیا تو معلوم ہوا کہ ہمارے ریکارڈ میں روسی سفارتکاروں کے متعلق بہت کم معلومات ہیں۔ روسی سفارتخانے کے عملے کی شناخت کے لئے میں نے دفتر خارجہ سے روسی سفارت خانے کے عملے کی تصاویر' ان کے نام' عہدوں اور دیگر تفصیلات منگوانے کے لئے ایک نوٹ لکھا' مگر دفتر خارجہ کی جانب سے ہمیں اس کا کوئی جواب موصول نہ ہوا' اور معاملہ ایک عرصہ تک التوا میں رہا' بالآخر تنگ آ کر میں نے اپنے ایک آفیسر کو دفتر خارجہ کے متعلقہ ڈائریکٹر کے پاس یہ کہہ کر بھیجا کہ ہمیں کچھ نہ کچھ معلومات تو ضرور فراہم کی جائیں۔

میرے آفیسر نے واپس آ کر بتایا کہ دفتر خارجہ کے پاس بھی ریکارڈ مکمل نہیں' ان کے پاس محض روسی سفیر یا ڈیفنس اتاشی کی تقرری کا ریکارڈ ہے' مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ روس کے سفارتخانے میں کتنے لوگ ملازم ہیں' کون کس پوزیشن پر ہے اور کیا کر رہا ہے' کون آ رہا ہے اور کون جا رہا ہے' یہاں تک کہ انہیں یہ بھی علم نہیں تھا کہ کون سفارتکار ہے اور کون غیر سفارتکار۔ دفتر خارجہ کے ڈائریکٹر صاحب نے لکڑی کا ایک کریٹ ہمارے آفیسر کے سامنے رکھ دیا جو مختلف تصاویر سے لبالب بھرا ہوا تھا اور کہنے لگے کہ جن جن کی تصاویر چاہیں تلاش کر لیں۔ دفتر خارجہ کے پاس صرف ایک ہی فہرست تھی جو ہر ماہ شراب کے کوٹے کے حصول کے لئے روسی سفارتخانے سے بھجوائی جاتی تھی۔ ہم نے اس فہرست کی

مدد سے وزارت خارجہ سے حاصل شدہ تصاویر کو سامنے رکھ کر ایک خاکہ بنایا تاکہ کام شروع کیا جا سکے۔

سفارتکاروں کی گاڑیاں دفتر خارجہ کے ساتھ رجسٹرڈ ہوتی ہیں اور ہر غیر ملکی مشن کو خصوصی نمبر الاٹ کئے جاتے ہیں۔ یہ نمبر حروف تہجی کے اعتبار سے مخصوص کئے جاتے ہیں۔ مثلاً افغانستان کے سفارتخانے کی ہر گاڑی کا نمبر CD-1، برطانیہ کا CD-8، چین کا CD-13، بھارت کا CD-27، روس کا CD-62 اور امریکہ کا CD-64 وغیرہ سے شروع ہو گا۔

یہ بات بھی ہمارے نوٹس میں آئی کہ مقامی پولیس نے کبھی ڈپلومیٹک نمبروں والی کاروں کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ سفارتکاروں کی گاڑیاں ہر طرح کی پڑتال سے بالاتر تھیں، یہ بھی بتاتا چلوں کہ جس گاڑی پر CD نمبر ہو اس کی تلاشی نہیں لی جا سکتی، لیکن جو X نمبر سے شروع ہوتی ہیں ان سے پوچھ گچھ کی جا سکتی ہے۔

روسی سفارتخانے کی ایک کار جسے دفتر خارجہ سے CD-62- AF یعنی اپلائیڈ فار نمبر ملا ہوا تھا، عرصہ دراز سے راولپنڈی کی سڑکوں پر دیکھی جاتی تھی۔ ایک دن ہم نے فیض آباد تھانے کی پولیس سے کہا آپ اس کار کو روک کر اس کے کاغذات چیک کریں۔ پولیس والے سفارتخانے کی گاڑی کی پڑتال میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہے تھے۔ ان کی ہمت بڑھانے کے لئے ہم نے سفید کپڑوں میں ملبوس اپنے ایک آفیسر کو ان کے پاس چھوڑ دیا۔ یہ کار جونہی تھانے کے قریب پہنچی اسے روک لیا گیا۔ کار ایک پاکستانی ڈرائیور چلا رہا تھا اور اس میں چار روسی خواتین سوار تھیں۔ گاڑی کی رجسٹریشن کے کاغذات دو سال پرانے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ روسی سفارتخانے والوں نے نمبر پلیٹ کے لئے ہمارے دفتر خارجہ کو درخواست تو بھیج دی مگر بعد میں کسی نے وہاں سے یہ نمبر پلیٹ حاصل کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اور ہمارا دفتر خارجہ بھی شاید اس درخواست کو بھول چکا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سفارتخانے کے پاکستانی ڈرائیور کے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی نہیں تھا۔ کار میں موجود خواتین سے نہایت احترام سے کہا گیا کہ آپ اپنے سفارتخانے سے فون پر رابطہ کریں۔ کچھ دیر بعد سفارتخانے کا فرسٹ سیکرٹری تھانے پہنچ گیا اور یہ یقین دہانی کرانے کے بعد کہ مطلوبہ نمبر پلیٹ حاصل کر لی جائے گی، گاڑی لے گیا۔ اس کارروائی کا مقصد روسیوں اور دیگر سفارتکاروں کو یہ باور کرانا تھا کہ ملکی قوانین کا احترام ان کی سفارتی ذمہ داری ہے۔ اس کارروائی سے پولیس والوں کے اعتماد میں بھی اضافہ ہوا۔

ہم روسی سفارتخانے تک رسائی حاصل کرنے کی کوششوں میں لگے رہے اور ہمیں

روسیوں کے متعلق کچھ نہ کچھ معلومات حاصل ہونے لگیں۔ بالآخر ہم سفارتخانے کے ایک ڈیپارٹمنٹ کے ایک کارندے کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پہلے تو وہ بہت گھبرایا' لیکن بعد میں ہمیں باقاعدہ اطلاعات فراہم کرنے لگا' جن کی روشنی میں ہم اپنا لائحہ عمل تیار کر لیتے۔

ہماری کوششیں رنگ لائیں اور ہمیں پتہ چلا کہ سفارتخانے کا ایک تھرڈ سیکرٹری قراقرم ہائی وے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں مصروف ہے۔ ان کا مہرہ اعجاز نامی ایک پاکستانی تھا جو ناردرن ایریا موٹر ٹرانسپورٹ کمپنی کا ایک اوسط درجے کا ملازم تھا۔ یہ کمپنی ایک نیم سرکاری کمپنی ہے جو قراقرم روٹ پر بسیں وغیرہ چلاتی ہے۔ ہم نے اعجاز سے رابطہ کیا اور اس سے مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اعجاز نے ہمیں بتایا:

"کچھ عرصہ پہلے میں نے محسوس کیا کہ ایک روسی میرے دفتر سے جو ویسٹ رج میں واقع ہے میرے گھر تک میرا پیچھا کرتا ہے۔ ایک روز جب میں حسب معمول کام ختم کر کے گھر جا رہا تھا تو گاڑی میرے بالکل قریب آئی اور اس شخص نے گاڑی کا شیشہ نیچے کیا اور تقریباً تحکمانہ لہجے میں مجھے کار میں بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں پہلے ہی خوفزدہ تھا' میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مجھ میں انکار کی ہمت نہ رہی اور میں کار میں دبک کر بیٹھ گیا۔ وہ مجھے سیدھا اسلام آباد اپنے گھر لے گیا۔ میں اس غیر متوقع اور اچانک کارروائی سے اس قدر گھبرایا کہ میں نے سوچا کہ مجھے قتل کرنے کے لئے یہاں لایا گیا ہے۔ اس نے مجھ سے میرا نام وغیرہ پوچھا اور کہنے لگا کہ مجھے شاہراہ قراقرم کے بارے میں معلومات درکار ہیں۔ وہ مجھ سے شاہراہ کی استطاعت' اس پر بنائے گئے پلوں کی کلا سیفیکیشن اور مضبوطی' زیر تعمیر حصے اور اس پر کام کرنے والے چینی انجینئروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اس کو مطلوبہ معلومات فراہم کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ میرے جواب پر وہ اندر گیا اور ووڈکا کی ایک بوتل اخبار میں لپیٹ کر مجھے دیتے ہوئے کہنے لگا "اسے فروخت کر کے پیسے اپنے پاس رکھ لینا۔

یہ درحقیقت مجھ سے لی جانے والی خدمات کے صلے کا ایڈوانس تھا۔ وہ مجھے میرے گھر تک چھوڑنے آیا اور اس نے مجھے مجبور کیا کہ میں اسے اپنا گھر دکھاؤں مجھ میں انکار کی سکت نہ تھی۔ میں بالکل شل سا ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ میں بالکل اس کے قبضے میں ہوں۔ میں اسے اپنے گھر کے دروازے تک لے گیا اور جب تک میں اپنے گھر داخل نہ ہوا' وہ مجھے دیکھتا رہا۔ اس روز سے میں گاہے گاہے ڈرائیوروں سے پوچھ کر کچھ نہ کچھ اسے بتا دیتا

ہوں۔

اس کے مجبور کرنے پر دو تین بار میں نے اس روٹ پر خود بھی سفر کیا اور جو کچھ بھی میرے علم میں آیا اسے بتا دیا۔ میں جانتا ہوں یہ قابل نفرت کام ہے۔ مگر میں اپنی خوشی سے یہ سب نہیں کر رہا۔ مجھے علم ہے کہ یہ وطن کے ساتھ غداری ہے' مگر آپ میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کریں۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے اس کے کہنے کے مطابق عمل نہ کیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا اور میرے بچوں کو بھی نقصان پہنچائے گا۔ مجھے اس بات کا بھی خوف تھا کہ اگر میں نے پولیس یا انٹیلی جنس والوں کو اس بات کی اطلاع دی تو وہ مار مار کر میرا بھرکس نکال دیں گے اور مجھے غدار قرار دے دیں گے۔ اب میں آپ کے رحم و کرم پر ہوں۔ خدارا! مجھے اور میرے خاندان کو بچا لیجئے۔" وہ گڑ گڑا رہا تھا۔ ہم نے اسے حوصلہ دیا اور پوچھا کہ اب اس سے اگلی ملاقات کب ہو گی؟ اعجاز نے جواب دیا:

"اس نے مجھے کل نو بجے رات پولی کلینک ہسپتال کے پیچھے والی سڑک پر آنے کو کہا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ پہلے چکر پر آئے گا اور یقین کرے گا کہ اس کا تعاقب تو نہیں ہو رہا اور پھر دوسرے چکر میں مجھے گاڑی میں بٹھائے گا۔ اس ملاقات میں مجھ سے وہ اطلاعات حاصل کی جائیں گی جو میں نے گذشتہ چند دنوں میں اکٹھی کی ہیں۔ درحقیقت نئی بات کوئی نہیں ہے تاہم میرا اس سے ملنا بے حد ضروری ہے۔ ایک بار میں وعدے کے مطابق ملاقات کے لئے نہیں پہنچا تھا تو وہ سیدھا میرے گھر آ گیا تھا۔ اس کے حکم کی تعمیل میری مجبوری ہے۔"

ہمیں اعجاز پر ترس آ رہا تھا۔ اس روسی سفارت کار نے اس کو ذہنی طور پر اس قدر مفلوج کر دیا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ہم نے اسے کچھ "معلومات" فراہم کیں اور کہا کہ وہ یہ سب اپنے "روسی آقا" کو بتا دے۔ یہ تصدیق کرنے کے لئے کہ وہ ہم سے جھوٹ نہیں بول رہا ہم نے ان کی جائے ملاقات کے قریب جھاڑیوں میں ایک پوسٹ قائم کر دی' اعجاز سچ بول رہا تھا اور روسی نے پہلے ایک چکر لگایا پھر دوبارہ آیا اور اعجاز کو گاڑی میں بٹھا کر لے گیا۔

اعجاز اب ڈبل ایجنٹ کے طور پر کام کر رہا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم چند بنیادی معلومات کے حوالے سے اس روسی سفارت کار کو کنفیوز کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم نے اعجاز کے ساتھ اس کی چند تصاویر بھی بنا لیں۔

ہم نے اپنی معمول کی کارروائی کے مطابق دفتر خارجہ سے اس سفارت کار کو ناپسندیدہ

شخصیت قرار دینے کی درخواست کی مگر انہوں نے ہمارا مشورہ نہ مانا۔ ہم چاہتے تھے کہ روسیوں تک ہمارا یہ پیغام پہنچ جائے کہ ان کا سرعام دندناتے پھرنے کا وقت اب ختم ہو چکا ہے۔ اور آئی ایس آئی' کے جی بی کو شکست دینے کی صلاحیت رکھتی ہے جس کا مظاہرہ کم سے کم اس کیس میں ہم نے کامیابی کے ساتھ کیا تھا۔

تاہم اس تجربے کے بعد ہم کے جی بی کی جاسوسی کی زیادہ تر کارروائیوں کے ساتھ نمٹنے کی صلاحیت پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ہم نے ان کی خفیہ نگرانی کے ایسے طریقہ کار وضع کر لئے تھے جو انتہائی موثر تھے مگر دفتر خارجہ کی پالیسیوں اور ہدایات پر عمل کرنا ہماری مجبوری تھی۔ ہم نے اعجاز کو مسلسل اپنی نگرانی میں رکھا تاوقتیکہ اس کے "آقا" کو یقین ہو گیا کہ وہ تمام مطلوبہ معلومات حاصل کر چکا ہے اور اب اسے اعجاز کی "خدمات" کی ضرورت نہیں رہی۔ بالآخر یہ یقین آتے ہی اس نے اعجاز کی جان چھوڑ دی اور وہ ٹوٹا پھوٹا شخص اپنے ہوش و حواس دوبارہ بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا۔



چالاک روسی اور "معصوم" پاکستانی

گروپ کیپٹن سیسل چوہدری کا نام پاکستان ایئرفورس کے حلقوں میں خاصہ مقبول ہے۔ اور ایک نڈر' بہادر اور ماہر ہوا باز کی حیثیت سے ان کی شہرت عام ہے۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں انہیں ستارۂ جرات دیا گیا' ان کی انہیں خوبیوں کی وجہ سے انہیں لندن میں پاکستانی ہائی کمیشن میں ائیر اتاشی کے طور پر خدمات انجام دینے کے لئے منتخب کیا گیا۔

لندن روانگی سے قبل سیسل چوہدری معمول کی بریفنگ کے لئے آئی ایس آئی کے اسلام آباد آفس میں آئے اور ہمیں چند روز ان کے ساتھ گزارنے کا اتفاق ہوا۔ ان کے اسلام آباد قیام کے دوران ایک رات وہ روسی سفارتخانے کے ائیر اتاشی کے ہاں موجود پائے گئے۔

سیسل چوہدری کا روسی ائیر اتاشی سے رابطہ کتنا پرانا تھا؟ روسیوں کو کیسے علم ہوا کہ وہ ائیر اتاشی کے طور پر لندن ہائی کمیشن جا رہے ہیں؟ یہ وہ سوالات تھے جن کے جواب بہرحال ہمارے علم میں نہیں تھے مگر ان کی اس FAREWELL پارٹی سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ یہ تعلق خاصا پرانا ہے۔ روسی ائیر اتاشی کو یہ خبر ہونا کہ کون پاکستان کے لندن کے سفارت خانے میں جا رہا ہے' کوئی معمولی نہیں بہت حیران کن بات تھی۔ اس سے یہی اخذ کیا جا سکتا تھا کہ روسی پاکستان کی ہوائی افواج کی نگرانی کر رہے تھے اور اس معاملے میں ان کے ایجنٹ ان کو خفیہ اطلاعات فراہم کر رہے ہوں گے۔

ہم نے اس سلسلے میں ڈی جی آئی کو رپورٹ پیش کی جس میں ان خدشات کا اظہار کیا گیا کہ روسی یقینی طور پر سیسل چوہدری کو امریکہ اور اپنے یورپی حریفوں کے خلاف نادانستہ ایجنٹ کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور اس سے پاکستان کے لئے سفارتی مشکلات کا پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ ہم نے یہ رپورٹ ائیر چیف اور صدر پاکستان کو بھی بھجوائی اور سفارش کی کہ اس اہم ذمہ داری پر سیسل چوہدری کو لندن نہ بھجوایا جائے۔

پاکستان ائیر فورس کے حکام کے ہاتھ غالباً" ہمارے خلاف ایک جلتا ہوا موضوع آ گیا۔ ہماری رپورٹ پر خاصی ہاہا کار ہوئی۔ احتجاج تک نوبت آئی۔ ہمارے خلاف طرح طرح کی

باتیں کی گئیں۔ ایئرفورس والوں کے جذبات کا یہ عالم ہو گیا کہ ایئر ہیڈ کوارٹرز نے ہمیں سیسل چوہدری سے مزید کوئی معلومات نہ حاصل کرنے دیں اور شاید نہ ہی خود اس سے پوچھ گچھ کی، حالانکہ قومی سلامتی کے لئے یہ انتہائی ضروری تھا۔ ہم روسیوں کے ساتھ اس کے تعلقات کی مکمل معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں ہمیں روسی منصوبوں کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ مگر پاکستان ایئر فورس نے اس ضمن میں ہمارے ساتھ تعاون سے انکار کر دیا اور ہمیں کسی قسم کی اطلاعات فراہم نہ کیں۔

آئی ایس آئی کو بھی سیسل چوہدری کی پیشہ وارانہ مہارت پر اتنا ہی ناز تھا جتنا پاکستان ایئر فورس والوں کو ہو سکتا ہے۔ لیکن ملکی سلامتی کے لئے ضروری تھا کہ سیسل چوہدری ہمیں ٹھیک ٹھیک سب کچھ بتا دیتے، لیکن ایئرفورس والوں نے اسے اپنا ذاتی انا کا مسئلہ بنا لیا۔

بہرحال سیسل چوہدری کو لندن کی بجائے عراق میں ایئر اتاشی لگا دیا گیا۔ یقیناً روسی سفارت کاروں نے سیسل چوہدری سے عراق میں بھی "دوستی" کر لی ہو گی، اگر وہ آئی ایس آئی کے ساتھ ناراض نہ ہوتے اور ہمیں باقاعدہ اطلاعات دیتے رہتے تو پاکستان کے لئے اور خود سیسل کے لئے بہت بہتر ہوتا۔ بہرکیف ہم نے اس نازک مسئلے کو زیادہ طول دینا پسند نہ کیا۔ کم از کم روسیوں کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ اسلام آباد میں آئی ایس آئی سوئی ہوئی نہیں۔



ادلے کا بدلہ

روسی فوجوں کے افغانستان میں داخل ہوتے ہی پاکستان کو بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک جانب تو ملکی سلامتی کو درپیش کسی بھی متوقع خطرے کے لئے دفاعی حکمت عملی کو انتہائی فعال بنانے کی ضرورت تھی اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جب دنیا کی ایک بڑی طاقت آپ کے ہمسائے میں واقع ایک چھوٹی سی ریاست پر فوج کشی کرتی ہے تو اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے آپ کو ہر طرح سے محتاط ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ ان حالات میں ملکی سلامتی کے لئے خطرات میں کئی حوالوں سے اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک نہایت تشویشناک بات افغان مہاجرین کا بہت بڑی تعداد میں پاکستان میں آمد کا سلسلہ تھا۔ اس بات کا خطرہ بھی بہرحال موجود تھا کہ تخریب کار اور دہشت گرد خاص طور پر افغان انٹیلی جنس "خاد" کے ایجنٹ مہاجرین کے روپ میں پاکستان میں داخل ہو جائیں گے۔ ہمیں اس سلسلے میں مصدقہ اطلاعات بھی مل رہی تھیں کہ دہشت گردی اور جاسوسی کی کارروائیوں کے لئے ایسے بہت سے عناصر پاکستان میں داخل ہو چکے تھے۔ ادھر حکومت پاکستان پر یورپ کے بہت سے فلاحی اداروں کا پریشر تھا۔ وہ ان مہاجرین کے لئے طبی امداد اور خوراک وغیرہ کی فراہمی کے مراکز قائم کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے سامنے نہ صرف دوست اور دشمن کی پہچان کا مرحلہ تھا بلکہ ان کی سرگرمیوں اور عزائم پر نظر رکھنا بھی ہمارے لئے ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔

ہم ان چیلنجوں سے نمٹنے کی پیش بندیاں کرنے میں مصروف تھے کہ ایک روز ہمیں اطلاع ملی کہ کابل میں پاکستان کے ایئر اتاشی کے دفتر کا ایک جونیئر کمیشنڈ آفیسر منحرف ہو کر کابل انتظامیہ سے مل گیا ہے اور اس نے کابل میں سیاسی پناہ کی درخواست دے دی ہے۔ ہمارے سفارتخانے نے مزید بتایا کہ ہم نے افغان دفتر خارجہ سے اس واقعہ پر احتجاج کیا تھا اور یہ رپورٹ درج کرائی تھی کہ ہمارے ایک جونیئر آفیسر کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ ہمارے سفارتخانے نے کابل انتظامیہ سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ ہمارے ایک نمائندے کو اس منحرف افسر سے ملنے کی اجازت دی جائے۔ ہمارے سفارتخانے کے بار بار اصرار اور احتجاج کے بعد بالآخر کابل انتظامیہ نے اس ملاقات کی اجازت دے دی۔

حسب پروگرام جب ہمارے سفارتخانے کے سیکنڈ سیکرٹری اس منحرف افسر سے ملاقات کے لئے پہنچے تو وہاں منظر کچھ یوں تھا کہ ایک کمرے میں میز کی دوسری جانب وہ منحرف افسر بیٹھا تھا اور اس کے دائیں جانب دو افغان اور بائیں جانب دو روسی افسر براجمان تھے۔ جونہی سیکنڈ سیکرٹری کمرے میں داخل ہوئے وہ منحرف افسر اس طرح بولنے لگا جیسے کسی نے ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ آن کر دیا ہو "میں اپنی مرضی سے ان لوگوں کے ساتھ ملا ہوں اور میں نے یہاں سیاسی پناہ حاصل کر لی ہے" ہمارے سیکنڈ سیکرٹری کو اس سے ایک لفظ بھی کہنے کی اجازت نہ دی گئی اور یہ مختصر سا بیان سنانے کے بعد انہیں کمرے سے نکال دیا گیا۔

صدر جنرل ضیاء نے ڈی جی آئی ایس آئی کو حکم دیا کہ آپ اس معاملے کی تحقیقات کریں۔ جنرل اختر نے مجھے حکم دیا کہ تم بدلے میں افغانی سفارتخانے کا ایک افسر اٹھا لاؤ! ہم کچھ دیر اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے رہے جب میں جنرل اختر کے کمرے سے نکلنے لگا تو جنرل صاحب نے کہا۔

"TAKE YOUR TIME. DON'T KILL HIM"

ہمیں افغانی سفارتخانے کا تمام اہلکاروں کے بارے میں پہلے سے علم تھا' لہٰذا ہم نے اپنے کام کا آغاز کیا اور اپنے "موزوں ترین شکار" کی تلاش میں لگ گئے۔ میں نے مقامی فیلڈ فورس کے کمانڈر سے تفصیلی گفتگو کی اور ایک آفیسر کو اس "شکار" کی ذمہ داری سونپ دی۔

چند روز بعد بھارت سے معروف گلوکار جگجیت سنگھ اور ان کی بیوی چترا سنگھ اسلام آباد آئے تو اسلام آباد میں بھارتی سفیر نے ان کے اعزاز میں اپنی رہائش گاہ پر ایک تقریب منعقد کی۔ میری ڈیوٹی کا تقاضا تھا کہ میں کسی طرح اس تقریب میں جاؤں۔ تاکہ مجھے اس فنکار جوڑے کے فن سے لطف اندوز ہونے والے لوگوں کی شکلیں دیکھنے کا موقع مل جائے اور میں بھارت کے سفارتکاروں اور ان کے ایجنٹوں کو ذرا قریب سے دیکھ لوں اور شاید کچھ سیکھ بھی لوں۔

یہ ایک یادگار تقریب تھی جس میں مہمانوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ ان مہمانوں میں نوجوان بھی تھے اور موسیقی کے دلدادہ بوڑھے بھی۔ سفارتکار بھی تھے اور زندگی کے تقریباً ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے مقامی افراد بھی۔ لوگ موسیقی کی دھنوں اور جگجیت چترا کی آواز کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے اور میں خاموش نگاہوں سے لوگوں کے چہرے پڑھ رہا تھا اور ان کی حرکات و سکنات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

تقریب گاہ سے ملحقہ ایک کمرے میں ساغر و مینا کے دور چل رہے تھے اور اس کمرے کا ماحول انتہائی خوشگوار اور رنگین تھا۔ بھارتی ناریاں اپنے مخصوص "کھلے ڈلے" انداز میں مخصوص مہمانوں کو لبھانے میں مصروف تھیں اور بھارتی خفیہ ایجنسیوں کے اہلکار بھی مستعد تھے اور اس موقعہ سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اچانک میری نظر افغان ایمبیسی کے ناظم الامور منصور احمد پر پڑی جو ہال کے دوسرے کونے میں بیٹھا ایک پاکستانی لڑکی کو مسلسل تاڑ رہا تھا۔ لڑکی معصومیت کی حد تک دلکش تھی اور لگتا تھا کہ ابھی اس نے جوانی میں قدم رکھا ہی ہے۔ اس کے حسن اور دلکشی کو دیکھ کر مجھے منصور کی اس حرکت پر کوئی حیرانی نہ ہوئی۔ اچانک میرے ذہن میں بجلی کی طرح خیال کوندا کہ ہم نے افغانی سفارتخانے کا ایک حساب چکانا ہے اور شاید منصور ہی ہمارا مطلوبہ شکار ہے۔ میں نے فوراً اپنے اس خیال پر عملدر آمد کا فیصلہ کر لیا۔

گانے میں وقفہ ہوا۔ لوگ اٹھ کر ادھر ادھر گھومنے لگے۔ میں سیدھا اس لڑکی کے پاس گیا اور اس سے گفتگو کرنے لگا۔ رسمی تعارف کے بعد اس نے بتایا کہ میرا نام شازیہ ہے اور میں راولپنڈی میں ایک ٹریول ایجنسی میں کام کرتی ہوں۔ میں نے جلدی سے اسے اپنے منصوبے کے بارے میں بتایا اور ضروری ہدایات دینا شروع کر دیں۔ پہلے تو وہ میری بات سن کر نروس ہوئی۔ مگر پھر میری ہدایات کے مطابق عمل کرنے پر تیار ہو گئی۔ میں نے اسے بتایا "میں ابھی تمہارا تعارف ایک سفارتکار سے کراؤں گا تمہیں یہ اداکاری کرنا ہو گی کہ میں تمہارا باس ہوں۔ اس کے بعد تمہارا بولنا ضروری نہیں ہے۔ بس سنتی رہنا اور ہوں ہاں کرتی رہنا۔"

چند منٹ بعد ہم ٹہلتے ٹہلتے منصور کے سامنے آ گئے۔ میں نے اس سے اپنا تعارف مسٹر ملک کے نام سے اور ABC ٹریولنگ ایجنسی کے مالک کے طور پر کروایا اور شازیہ کو متعارف کرواتے ہوئے کہا کہ یہ میری ایجنسی میں کام کرتی ہے۔ منصور کی تو گویا باچھیں کھل گئیں۔ اس نے فوراً اپنا وزٹنگ کارڈ نکالا اور ہمیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ مزید ترغیب کے طور پر اس نے ہم سے کہا کہ افغان ایمبیسی کے پاس ٹریولنگ کا اچھا خاصا بزنس ہے اور ہمیں یہ بزنس ABC ٹریولنگ ایجنسی کو دے کر خوشی ہو گی۔

میری چھٹی حس نے کہا کہ میں یہ مچھلی اپنے جال میں پھنسانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اور میں نے اس آپریشن کا خاکہ تیار کیا' اگلے روز میں ABC ٹریولنگ ایجنسی پہنچا۔ اس کے اصل مالک سے ملاقات کی اور اسے اعتماد میں لیا۔ اس نے ایک محب وطن پاکستانی ہونے

کا ثبوت دیا اور اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ اب اس کے بجائے میں ABC ٹریولز کا "مالک" تھا۔ میں روز وقت نکال کر ایجنسی جاتا اور ٹکٹیں جاری کرنے کی تکنیک سے آگاہی حاصل کرتا۔ چند گھنٹوں میں میرے وزٹنگ کارڈز بھی تیار ہو کر آ گئے۔ اپنے اس کور کو مزید مستحکم کرنے کے لئے میں ABC کے لئے بزنس لینے کے لئے مختلف کلائنٹس کے پاس بھی جانے لگا۔ یہ ایک اضافی بوجھ تھا مگر یہ ڈیوٹی تھی اور فرض تھا اس لئے میں یہ فرض ادا کرتا رہا۔

اتفاق سے منصور کے ہمسائے میں رہنے والے ایک خان صاحب میرے ایک قریبی دوست کے رشتہ دار نکل آئے۔ ان لوگوں کے بھی منصور کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ خان صاحب نے بھی منصور سے میرا تعارف ABC ٹریولز کے مالک کے طور پر کرایا۔ اب میرے لئے منصور کے گھر کا راستہ کھل گیا اور میری متعدد ملاقاتوں کے بعد منصور کو مزید یقین ہو گیا کہ میں ABC والا مسٹر ملک ہوں۔ منصور سے اب میری ملاقاتیں اکثر ہونے لگیں۔ اب ہمارا حال دو شکاریوں کا سا تھا۔ منصور کا نشانہ شازیہ تھی اور میرا ہدف ایک طرف تو شازیہ کو منصور کے پنجوں سے بچانا تھا اور دوسرے منصور کو شکار کرنا تھا۔

میں منصور اور اس کے اہل خانہ کا بغور مطالعہ کرتا رہا اور بالآخر ہم نے اپنے مشن کی تکمیل کے لئے حتمی لائحہ عمل طے کر لیا۔ ان دوستانہ ملاقاتوں میں میں منصور کی تمام کمزوریوں کے بارے میں جان چکا تھا اور کسی ایسی ہی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر منصور کو قابو کیا جا سکتا تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک اچھا "فیملی مین" FAMILY MAN تھا' اس کا گھرانہ اچھا خاصہ متوازن اور خوشحال تھا۔ منصور کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے اور اس کی بیوی بھی ایک مضبوط کردار کی گھریلو خاتون تھی اور اس کے عمومی رویے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہ تھا کہ منصور اس سے خاصا دبتا ہے اور بہت سے معاملات میں وہ اپنی بیوی کے زیر اثر بھی ہے۔ منصور کا بڑا بیٹا پری میڈیکل انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا جبکہ سب سے چھوٹا بیٹا پانچویں کلاس میں پڑھتا تھا۔

منصور کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ شازیہ اس کے حواس پر سوار ہو چکی تھی۔ وہ اکثر ABC ٹریولز کے دفتر بھی آتا اور ہمیشہ اس کی کوشش ہوتی کہ وہ شازیہ کے ساتھ خوش گپیاں کرے۔ ایک دن میں نے سرسری طور سے منصور کو جتایا کہ شازیہ کو نوکری سے نکال دیا گیا ہے کیونکہ وہ شادی کے لئے طویل رخصت لینا چاہتی تھی۔ یہ شازیہ کو منصور سے بچانے کا ایک طریقہ تھا حالانکہ ہم نے اس کے لئے ایک اور ٹریولنگ ایجنسی میں نوکری کا بندوبست کر

دیا تھا۔

میری سکیم منصور اور اس کی بیوی کے خلاف ایک نفسیاتی جنگ لڑنا تھا' جس کا مقصد انہیں اس نہج پر لانا تھا کہ وہ منحرف ہو جائیں اور اپنے وطن واپس جانے سے انکار کر دیں' اور پاکستان میں سیاسی پناہ لے لیں۔

میں اکثر باتوں باتوں میں انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتا کہ پاکستان رہنے کے لئے ایک آئیڈیل ملک ہے۔ اور افغانستان جس طرح خطروں میں گھرا ہوا ہے وہاں واپس جانا اپنی تباہی اور بربادی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ میں انہیں یہ سمجھانے کی کوشش بھی کرتا کہ اس وقت پوری دنیا میں اسلام کے احیاء کی تحریکیں زور شور سے چل رہی ہیں اور اب کمیونزم کا مستقبل انتہائی تاریک ہے اور خاص طور پر افغانستان میں اس کے قدم جمانے کے کوئی امکانات نہیں کیونکہ افغانیوں کی ایک بڑی تعداد کمیونزم کو اپنا دشمن سمجھتی ہے اور اپنے عقائد کے تحفظ کے لئے روسیوں سے برسرپیکار ہے۔ ایک نہ ایک دن یہ مجاہدین روسیوں کو نکال باہر کریں گے۔ افغانستان میں اسلامی انقلاب آ کر رہے گا اور پھر روس کے حامیوں کو شرمندگی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔

میں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ میرے نفسیاتی وار کارگر ثابت ہو رہے تھے اور ان کی سوچ میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی تھی۔ اب وہ کمیونزم اور افغانستان کی صورتحال پر آپس میں بھی تبادلہ خیال کرنے لگے تھے۔ منصور بنیادی طور پر باعمل مسلمان تھا اور نماز باقاعدگی سے ادا کرتا تھا۔ ہم نے کئی بار اکٹھے نماز بھی پڑھی۔ وہ کئی بار مجھ سے پاکستان میں رہنے کی صورت میں اپنے مستقبل کے بارے میں بھی استفسار کرتا تھا اور میں انہیں اسلام آباد میں رہنے والے افغان مہاجرین کے قابل رشک طرز زندگی کے بارے میں مختلف باتیں بتا کر مطمئن کرتا رہتا تھا حتیٰ کہ میں نے اسے پاکستان میں اپنا کاروبار جمانے کی ایک پرکشش سکیم بھی بنا کر دی۔ میں نے منصور کو یہ لالچ بھی دیا کہ افغانی ہونے کے ناطے یہ بھی ممکن ہے کہ تمہیں پاکستان کے دفتر خارجہ کے افغان ڈیسک پر کوئی اہم عہدہ ہی سونپ دیا جائے۔

میرے حملے کارگر ثابت ہو رہے تھے' منصور کی بیگم میری باتیں بہت دھیان سے سنتی اور اتفاق کرتی۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے' ان کے گھر میں اسی موضوع پر بحث ہونے لگی ہے اور وہ روسیوں سے بہت نالاں رہنے لگے ہیں۔

ایک روز منصور نے فون پر مجھے فوری ملنے کے لئے کہا۔ میں ایک منتظر شکاری کی طرح منصور کے پاس پہنچا۔ وہ خاصا پریشان دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بتایا کہ کابل سے مجھے واپسی کے

احکامات موصول ہو گئے ہیں اور میری جگہ کسی اور سفارتکار کو ناظم الامور بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ اس کی بیوی اور بچے بھی اس صورتحال سے خاصا پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ لوہا اب آخری چوٹ لگانے کے لئے گرم ہے۔ میں نے اسے پیشکش کی کہ اگر وہ افغانستان واپس نہ جانے کا فیصلہ کر چکا ہے تو اپنے اہل خانہ کے ساتھ میرے گھر میں جب تک چاہے قیام کر سکتا ہے اور میں اسے اسلام آباد میں کاروبار کے لئے دس لاکھ روپے کی امداد دینے کو بھی تیار ہوں۔ اب میرا مخاطب بیگم منصور تھیں۔ میں نے افغانستان واپس جانے کی صورت میں ان کے ساتھ ہونے والے سلوک کا ایک خوفناک نقشہ کھینچتے ہوئے کہا کہ آپ سے سب کچھ چھین لیا جائے گا اور آپ کا بے گناہ خاوند اور نوجوان بیٹا یا تو پل خمری کی جیل میں چکیاں پیستے ہوئے نظر آئیں گے یا پھر انہیں گولی مار دی جائے گی۔ کابل حکومت آپ کو ہر طرح کی مراعات اور استحقاق سے محروم کر دے گی اور آپ لوگوں کو انسانی سطح سے گرا ہوا معیار زندگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔ میری نفسیاتی جنگ ان کے دماغ پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ انہوں نے مجھ سے اپنے فرار کے منصوبے اور رموز پر گفتگو شروع کر دی۔

جلد ہی انہوں نے اپنا گھریلو سامان سیل پر لگا دیا۔ مختلف لوگ سامان دیکھنے کے لئے آ جا رہے تھے۔ میں بھی ایک عام خریدار کی طرح منصور کے گھر پہنچ گیا۔ منصور نے مجھے دیکھتے ہی میرے کان میں کہا "میں نے منحرف ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ برائے کرم اس سلسلے میں ضروری انتظامات کروا دیجئے اور میرے پیغام کا انتظار کیجئے۔"

اس شام میں نے ڈی جی آئی کو مکمل رپورٹ دے دی۔ وہ کافی خوش ہوئے۔ کیونکہ ناظم الامور کا منحرف ہو جانا ان کی توقعات سے کہیں زیادہ تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر ہم افغان ایمبیسی کے کسی جونیئر آفسر کو ہی چت کر دیں تو حساب بے باک ہو جائے گا۔

دو روز بعد مجھے منصور کا فون آیا۔ اس نے کہا کہ میں نے تقریباً سارا گھریلو سامان فروخت کر دیا ہے تاہم چند چیزیں جو آپ نے پسند کی تھیں وہ میرے گھر میں پڑی ہیں اور آپ کسی وقت بھی آ کر انہیں اٹھا کر لے جا سکتے ہیں۔ میں اس کے پیغام کے اصل مقصد کو سمجھ گیا۔ یہ ہمارا کوڈ تھا' لہٰذا میں بھاگم بھاگ اس کے گھر پہنچا۔ اس وقت تقریباً رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ منصور گھر سے باہر آیا اور مجھ سے کہنے لگا "رات ایک اور دو بجے کے درمیان آیئے' ہم آپ کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوں گے۔ میرا متبادل سفیر اس وقت اندر موجود ہے اور مجھے الوداعی ڈنر دیا جا رہا ہے۔ مجھے صبح کی فلائٹ سے واپس کابل

براستہ نئی دہلی جانا ہے۔"

میں نے واپس آتے ہی ڈی جی آئی کو فون پر بتایا کہ "مہمان" آج رات "تشریف" لا رہے ہیں۔ ڈی جی آئی نے میری بات سنتے ہی مجھ سے کہا:

"ٹھہریئے مجھے صدر صاحب سے بات کر لینے دیجئے' میں سمجھتا ہوں اس سلسلے میں ان سے اجازت لینا ضروری ہے' پھر اگلا قدم اٹھائیں گے۔ آپ ابھی "مہمانوں" کو نہ لائیے۔ صدر اس وقت ایک سعودی شہزادے کے ساتھ سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں مصروف ہیں۔ معلوم نہیں ان سے میرا رابطہ ہوتا ہے یا نہیں' بہرحال میں کوشش کرتا ہوں' میرے فون کا انتظار کیجئے۔"

میں نے کہا "سر! ہمیں پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ صدر صاحب نے ہمیں ایک ذمہ داری سونپی تھی جسے ہم نے احسن طریقے سے پورا کر دیا ہے آپ کل صبح انہیں بتا سکتے ہیں کہ ہم نے آپ کے احکامات کی تعمیل کر دی ہے۔ سر! اگر ہم آج رات اسے نہ لائے تو پھر یہ وقت اور موقعہ ہاتھ نہیں آئے گا۔"

میں نے اپنے طور پر جنرل اختر سے یہ سب کہہ تو دیا مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ صدر صاحب کی اجازت کے بغیر ذرا سی جنبش بھی نہیں کریں گے۔ میری کیفیت بیک وقت جذباتی بھی تھی اور میں ڈر بھی رہا تھا کہ اگر صدر اور ڈی جی آئی نے "نو" کہہ دیا تو میری ساری محنت اکارت چلی جائے گی۔ اور شاید ہمیں دوبارہ بدلہ چکانے کا ایسا موقعہ پھر نہ ملے۔ میں نے اس منزل تک پہنچنے کے لئے انتہائی دشوار گزار راستہ اختیار کیا تھا اور اگر اس مرحلے پر اس معرکے کو سر نہ کیا گیا تو میرے لئے یہ انتہائی دل شکنی کی بات ہو گی۔

بہرحال بات میرے بس سے باہر تھی اور انتظار کے سوا میرے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اور جو بھی حکم ملتا اسے ماننا فرض تھا (بعدازاں مجھے خبر ملی کہ ڈی جی آئی نے اسی وقت صدر کے ملٹری سیکرٹری کو فون کیا اور کہا کہ فوری طور پر میری صدر سے بات کرائیں کیونکہ یہ ایک انتہائی اہم معاملہ ہے۔ صدر' کھانے کی میز سے اپنے مہمان سے معذرت کر کے فون پر آئے۔ انہیں معاملے کی نزاکت کا بخوبی احساس تھا۔ اس واقعہ کی عالمی سطح پر تشہیر ہو سکتی تھی اور یہ ہمارے لئے سفارتی بحران بھی پیدا کر سکتا تھا۔ کسی بھی "حادثے" کی صورت میں ڈی جی آئی اور صدر کو ہی اس کے مضمرات کا سامنا کرنا تھا۔ صدر نے ڈی جی آئی سے تمام تفصیلات سن کر بالآخر گرین سگنل دے دیا۔) میں اپنے دفتر کے کمرے میں بے چین ٹہل رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی' میں لپکا اور فون اٹھایا' ڈی جی آئی نے کہا "اجازت ہے' مہمان کو لے

آیئے۔"

ڈی جی آئی نے مجھ سے تفصیل پوچھی کہ "مہمان" کو لانے کے لئے کیا طریقہ کار اختیار کرو گے؟ میں نے انہیں بتایا کہ میں اپنی کار پر جاؤں گا اور "مہمانوں" کو لے کر فلاں گیسٹ ہاؤس میں چلا جاؤں گا جہاں ان کے رہنے کا بندوبست کیا جا چکا ہے۔ میری بات سنتے ہی جنرل اختر کا لہجہ بدل گیا۔

"مہمان کی بجائے اب مہمانوں کیوں کہہ رہے ہو؟"

میں نے کہا "سر" وہ' اس کی بیوی' دو بیٹے اور دو بیٹیاں' چھ مہمان رونق افروز ہوں گے۔"

ڈی جی نے پھر سوال کیا اور تم اکیلے ان کو لینے جاؤ گے؟"

"جی ہاں" میں نے جواب دیا۔

"تمہارا دماغ تو درست ہے؟ بے وقوف آدمی! یہ افغانیوں کی ایک چال بھی ہو سکتی ہے' تمہارا افغان سیکورٹی کے عملے سے تصادم بھی ہو سکتا ہے' کیوں اپنی موت کو آواز دے رہے ہو؟ اپنی حفاظت کے لئے گارڈ ساتھ لے کر جاؤ؟"

میں نے کہا "سر! یہ کام خاموشی سے کرنے کا ہے' اور میرا اللہ میرا محافظ ہے"

اس پر جنرل اختر بھنا کر بولے "تمہاری چالیں کبھی میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ اچھا جو جی میں آئے کرو' مگر احتیاط کرنا اور مشن مکمل ہوتے ہی مجھے رپورٹ کرنا۔ میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"یس سر" کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

پروگرام کے مطابق تقریباً ایک بجے رات میں اپنی کار میں منصور کے گھر پہنچا۔ میں نے گھر سے کچھ دور پہلے اپنی کار کی ہیڈ لائیٹس آف کر دیں اور پھر انجن بھی بند کر دیا۔ کار سرکتی ہوئی پورچ میں داخل ہوئی منصور گھبرایا ہوا باہر نکلا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔

"برادر! یہ کیا ہے؟ میرے ساتھ بہت سا غیر فروخت شدہ گھریلو سامان ہے۔ یہ سامان اس کار میں کیسے آئے گا؟ کسی بڑی وین یا گاڑی کا بندوبست کرو!"

وقت کی نزاکت کا تقاضا یہ تھا کہ اس وقت ایسی غیر ضروری باتوں سے پرہیز کیا جائے کیونکہ اس سے مشن کی تکمیل میں دیر ہونے کا احتمال تھا۔ مجھے منصور کی بات نے پریشان کر دیا۔ اب تک ہر کام منصوبے کے عین مطابق ہو رہا تھا مگر کسی بھی لمحے ایک چھوٹی سی غلطی سارا پروگرام چوپٹ کر سکتی تھی۔ مجھے خدشہ تھا کہ اگر ہم موبائل پولیس' افغان سیکورٹی

گارڈز' کسی روسی سفارتکار یا کسی خفیہ ایجنسی کے عملے کی نظروں میں آ گئے تو صورتحال پیچیدہ ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ کسی کتے کے بھونکنے کی آواز یا گاڑی کے ٹائروں کی چرچراہٹ بھی کسی کو متوجہ کر سکتی تھی۔ تاہم میں ذہنی طور پر ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے بالکل تیار تھا۔ میں ہر قیمت پر اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ میں نے انتہائی سوچ بچار کے بعد اس چیلنج کو قبول کیا تھا اور اب حتمی کامیابی کے لئے مجھے آخری لمحے تک جدوجہد کرنا تھی۔ میں نے پرسکون لہجے میں منصور سے کہا:

"پہلے ہم آپ کی بیوی اور بچوں کو محفوظ مقام تک چھوڑ آتے ہیں' بعد میں ہم دونوں آ کر سامان وغیرہ لے جائیں گے۔"

میرا خیال تھا کہ ایک بار جب اس کی بیوی بچے چلے جائیں گے تو یہ سامان والا کام جو میرے نقطہ نظر سے غیرضروری بھی تھا آسان ہو جائے گا۔ منصور کے بیوی بچوں کے بغیر کسی بھی غیر متوقع صورتحال سے نمٹنا بھی نسبتاً آسان ہو جائے گا۔ مگر وہ میرے مشورے پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھا۔

میں نے اس سے پوچھا:

"نیا ناظم الامور کہاں ہے؟" اس نے جواب دیا "میں نے اسے اس قدر شراب پلا دی ہے کہ کل دوپہر تک اس کے جاگنے کا کوئی امکان نہیں۔ میں نے پاکستانی پولیس گارڈز اور اپنے محافظوں کو بھی پوری طرح "ٹن" کر دیا ہے۔ اور اس وقت سب لوگ خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں۔"

میں نے اپنی تسلی کی خاطر گھر کا ایک چکر لگایا۔ وہاں واقعی "شہر خموشاں" کا سا سکوت طاری تھا جس کو ایک سپاہی کے خراٹے توڑ رہے تھے۔ پولیس کے سپاہی اور گارڈ مدہوش زمین پر پڑے تھے۔ ان کا اسلحہ بھی اٹھا کر لے جایا جا سکتا تھا۔

میں فوری طور پر وین لینے کے لئے نکلا اور آئی ایس آئی کے "موٹر پول" سے بڑی گاڑی نکال کر واپس منصور کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ اس آپریشن کے یہ آخری لمحے واقعی کوہ گراں کی طرح تھے' ہر لمحہ قیمتی تھا یا تو میں کامیاب ہو جاتا یا مارا جاتا۔

ہم سب نے مل کر گھر کا سامان انتہائی خاموشی اور احتیاط سے وین میں ڈالا۔ صندوق خاصے بھاری تھے اور سامان میں ایک فریج اور فریزر بھی شامل تھا۔ ہم نے سارا سامان گاڑی میں ڈالا اور خدا خدا کر کے اس کے گھر سے نکلے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس ساری

کارروائی کے دوران کسی نے ہمارا نوٹس نہیں لیا۔ یہ ساری کارروائی تقریباً دو گھنٹے میں مکمل ہوئی۔

ڈی جی آئی یقینی طور پر میرے فون کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ کیونکہ جب رات تین بجے کے قریب میں نے انہیں فون کیا تو پہلی گھنٹی پر ہی انہوں نے ریسیور اٹھایا اور میں نے کہا۔ "سر! مشن پورا ہو گیا" انہوں نے کہا "ویل ڈن" اور فون بند کر دیا۔

اگلی صبح جب افغان سفارتخانے کا عملہ مسٹر منصور اور اس کے اہل خانہ کو خدا حافظ کہنے کے لئے آیا تو انہیں غائب پا کر انہیں جو "جھٹکا" لگا اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اب وہاں ایک افراتفری کا عالم تھا۔ چند ہی منٹوں میں مسٹر منصور کا گھر تفتیش کرنے والوں اور ان کے ہمدردوں سے بھر گیا۔ ہر شخص اپنے اپنے اندازے لگا رہا تھا۔ گارڈ' نوکر اور پولیس والے بھی کچھ نہ بتا سکے۔ سب نے یہی کہا "صاحب اور بچے اندر ہی تھے۔" ہر آدمی قسم کھانے کے لئے تیار تھا کہ وہ اندر ہیں۔ تفتیش کرنے والوں کو وہاں سے کوئی "فنگر پرنٹ" نہ ملا۔ لہٰذا ان کی تفتیش بھی اندازوں کے گرد گھوم رہی تھی۔ افغان سفارتخانے کے بعض سفارتکار بھی تفتیشی ٹیم سمیت ان میں شامل ہو گئے۔ روسی تفتیشی اہلکاروں نے چند گھنٹوں میں ہوٹل' ائیرپورٹ' ریلوے اسٹیشن اور بس سٹینڈز کے علاوہ منصور کے مختلف دوستوں کے گھر پر بھی چھاپے مارے' مگر اس کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چل سکا۔

یہ بہرحال ایک ناظم الامور کی پراسرار گمشدگی کا معاملہ تھا۔ یہ خبر آگ کی طرح تمام سفارتخانوں میں پھیل گئی۔ سب لوگ حیران تھے کہ آخر مسٹر منصور اور ان کے بیوی بچوں کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ کسی بھی سپرپاور کو اس قسم کا سبق دے کر اس کے ردعمل کا نظارہ کرنا خفیہ والوں کے لئے ایک انتہائی دلچسپ منظر ہوتا ہے۔ ہم مسکراتے ہوئے روسی اور افغانی سفارتکاروں کو اپنے زخم چاٹتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

یہ لوگ دو روز تک پاگلوں کی طرح منصور کی تلاش میں بھاگتے رہے' مگر آخرکار ناکام ہو کر انہوں نے تلاش کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اب ان کے کیمپ پر ایک پراسرار خاموشی طاری تھی۔ ریڈیو' ٹی وی یا میڈیا بھی خاموش تھا' روسی یا افغانی سفارتکاروں نے بھی ہماری وزارت خارجہ سے کوئی رابطہ نہ کیا' صدر مملکت' ڈی جی آئی ایس آئی اور میرے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ منصور اور اس کے بیوی بچے کہاں ہیں' بہرحال ہمارا انتقامی پیغام ان تک پہنچ چکا تھا اور وہ سمجھ گئے تھے کہ ہم نے اپنے ایک جونیئر کمیشنڈ آفیسر کے جبری انحراف کا بدلہ ان

کے ناظم الامور کو منحرف کر کے چکا دیا ہے۔ اس صورتحال پر اب کسی تبصرے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

مسٹر منصور اور ان کے اہل خانہ کے آرام اور آسائش کا پورا بندوبست تھا اور انہیں اپنے اگلے اقدام کے لئے سوچنے کا بھرپور موقع دیا گیا۔ چند روز بعد انہوں نے اپنے عزیزوں کے پاس لندن جانے کا فیصلہ کیا۔ صدر کو اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ہم نے ان کے سفر کے لئے تمام ضروری اقدامات کئے اور بالآخر انہیں برٹش ایئرویز کی ایک پرواز سے لندن روانہ کر دیا۔

مسٹر منصور کے ساتھ لندن میں کیا بیتی۔ ہمیں آج تک ان کی طرف سے نہ تو کوئی اطلاع موصول ہوئی اور نہ ہی انہوں نے ہم سے رابطہ کیا۔ نہ مسٹر ملک کا کہیں سراغ تھا نہ اس کی ABC کمپنی کا۔

اس اپریشن میں نہ جبر کیا گیا نہ زبردستی' صرف بات چیت اور نفسیاتی جنگ کے ہتھیار کے موثر استعمال سے ہم نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔



اسرائیل

اسرائیلی انٹیلیجنس

اسرائیلی انٹیلی جنس اینڈ سیکورٹی سروسز نے ایک چھوٹے سے انفارمیشن یونٹ سے جسے SHAY کہا جاتا تھا' ایک بہت بڑے خفیہ ادارے کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ یہ ادارہ اب پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے اور اس کے اہلکار سراغرسانی اور جاسوسی کے جدید ترین سائنسی آلات سے لیس ہمہ وقت درپیش چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مستعد رہتے ہیں۔ اسرائیلی انٹیلی جنس اینڈ سیکورٹی سروسز کا شمار دنیا کی بہترین خفیہ ایجنسیوں میں ہوتا ہے۔ اس کے اہلکار اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں اور جدید تکنیک سے پوری دنیا میں اپنی خفیہ سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اور ان کی یہ اہلیت خاص طور سے عرب دنیا پر ان کی دسترس کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسرائیل کی چھوٹی سی مملکت اپنے وجود میں آنے کے دن ہی سے بے شمار سیاسی مسائل کا شکار ہے اور اس کے لئے اپنا وجود برقرار رکھنا بجائے خود ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی بقاء کی جدوجہد میں دنیا کے دیگر ممالک میں دہشت گردی' اغواء' قتل و غارت اور کمانڈو ایکشن جیسی کارروائیوں کو بھی بالکل جائز سمجھتے ہیں۔ انہوں نے متعدد عرب ریاستوں کا تختہ الٹنے کے لئے عالمی قوانین کو بارہا توڑا ہے۔ اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کسی عالمی ضابطے کی پرواہ نہیں کی۔ اس نے عراق کے ایٹمی مرکز کو بغیر کسی اشتعال کے تباہ کر دیا۔ 1967 میں اس نے ہمسایہ ممالک مصر' شام' اردن اور لبنان پر اچانک حملہ کیا اور سینائی' مغربی کنارے غزہ اور گولان کے پہاڑی علاقہ پر قبضہ کر لیا۔

اسرائیل نے انتہائی ڈرامائی انداز میں چربورگ سے گن بوٹس اڑا لیں' جنہیں فرانس نے اسرائیل کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ستمبر 1972ء میں میونخ کے اولمپکس کھیلوں کے میدان میں اسرائیلی کھلاڑیوں کا قتل آج بھی قارئین کو یاد ہو گا۔ اس واقعہ پر اسرائیلیوں کے انتقام کی آگ اس وقت تک ٹھنڈی نہ ہوئی جب تک انہوں نے اس کے ذمہ دار بارہ مشتبہ افراد کو دنیا کے کونے کونے سے تلاش کر کے ہلاک نہ کر ڈالا۔ اسرائیل

کے ایک مایہ ناز جاسوس آئسر ہارل نے نازی جرمنی کے ایخمن کو جو یہودیوں کے قتل عام کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا' ارجنٹائنا سے ڈھونڈ نکالا اور پھر اسے نہایت ہی خطرناک مراحل سے گزار کر اسرائیل لے آئے اور مقدمہ چلانے کے بعد سزائے موت دی۔ اسرائیل نے اپنے ایٹمی پلانٹ کے لئے یورینیم بھی چھاپہ مار جنگ اور سمگلنگ کی کارروائیوں سے حاصل کیا۔ اسرائیلی خفیہ ایجنسیوں کی کارروائیاں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے جس کونے میں چاہیں اور جو چاہیں کر گزرتے ہیں۔

آج کے سیاسی تناظر میں امریکہ' اسرائیل اور بھارت کے تعلقات جس تیزی سے پروان چڑھ رہے ہیں' ہماری سنٹرل ایجنسی کے اہلکاروں اور منصوبہ سازوں کے لئے یہ بے حد ضروری ہے کہ وہ اسرائیل کی انٹیلی جنس اور سیکورٹی سروسز کے بارے میں پوری معلومات حاصل کریں تاکہ اس کے خفیہ حملوں کا بروقت سدباب کیا جا سکے۔

ابتدا

اس صیہونی ایجنسی کا قیام 1929ء میں زیورچ (جرمنی) میں ہونے والی یہودیوں کی ایک عالمی کانگریس میں عمل میں آیا تھا۔ اس کے قیام کا بنیادی مقصد یہودیوں کے حقوق کا تحفظ کرنا اور خاص طور پر فلسطین میں یہودیوں کی بڑی آبادی کو قوت فراہم کرنا تھا۔ اس صیہونی ایجنسی کو اطلاعات فراہم کرنے کے لئے ایک ذیلی ادارہ SHAY قائم کیا گیا' جو بعدازاں یہودیوں کی زیر زمین تحریک HAGANAH کے انٹیلی جنس اور سیکورٹی کے دست راست کے طور پر ابھرا۔ یہ تحریک ان دنوں برطانوی راج کے خلاف برسرپیکار تھی۔ اس تنظیم نے جلد ہی پوری دنیا میں درج ذیل صیہونی مفادات کے لئے اپنا جال پھیلا دیا۔

1- نازی جرمنی کے خلاف معلومات اکٹھی کرنا' یہودیوں کی خفیہ سرگرمیوں کے لئے مدد فراہم کرنا اور جرمنی کے جنگی عزائم کو ناکارہ بنانا۔
2- مدافعت کرنے والی صیہونی فورسز کو اسلحہ فراہم کرنا اور انہیں ان کی کارروائیوں کے دوران تحفظ فراہم کرنا۔
3- فلسطین اور اس کی ہمسایہ ریاستوں میں مصروف کار' انتہا پسند اور جنگجو یہودیوں کے ساتھ رابطہ اور کنٹرول۔
4- مشرق وسطیٰ میں اپنے بعض عرب اور بظاہر یہودیوں کے مخالف ایجنٹوں کے ذریعے وہاں کی سیاسی صورتحال کی مکمل خفیہ نگرانی اور معلومات کا حصول۔

-5 برطانوی حکام کے بارے میں جاسوسی کرنا اور روزمرہ اطلاعات حاصل کر کے صیہونی قیادت کو ان سے باخبر رکھنا۔

-6 خودمختار اسرائیلی ریاست کے قیام کی کوششوں کو کامیاب بنانے کے لئے نفسیاتی حربوں کا استعمال اور اس کے حق میں پراپیگنڈہ۔

ادارے کی شبانہ روز محنت اور امریکہ کی حمایت سے بالاخر 1948ء میں اسرائیل کی ایک خودمختار ریاست معرض وجود میں آ گئی' جس کے بعد اس ادارے کو باقاعدہ سرکاری محکمہ بنا دیا گیا۔ جس کی شاخوں میں پولٹیکل انٹیلی جنس ونگ' کاؤنٹر انٹیلی جنس اینڈ انٹرنل سیکورٹی ڈیپارٹمنٹ' ملٹری انٹیلی جنس' پولیس برانچ آف ملٹری انٹیلی جنس اور نیول انٹیلی جنس اور سیکورٹی شامل ہیں۔ اسرائیل کے قیام کے ابتدائی برسوں میں ان اداروں کی کارکردگی کا حال یہ تھا کہ یہ عموی طور پر اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر کام کرتے لیکن بعض اوقات ایک دوسرے کے خلاف بھی برسرپیکار ہو جاتے۔ اس صورتحال میں کنفیوژن' بے یقینی اور ایک دوسرے پر شک و شبہے کا پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ ان اداروں کے آپس میں رابطوں کے فقدان کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات دو یا تین ونگ ایک ہی ایجنٹ کے ذریعے ایک ہی ٹارگٹ کا پیچھا کر رہے ہوتے۔ اسرائیل کے حکمرانوں نے اس صورتحال کا سختی سے نوٹس لیا اور 1951ء میں اسرائیلی وزیراعظم کی ہدایات پر ریون شیلوہ نے اسرائیلی انٹیلی جنس کے پورے ڈھانچے کو نئے سرے سے استوار کیا جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

وعادا (VAADA)

یہ تمام سروسز کے سربراہوں پر مشتمل کمیٹی ہے جسے پرنسپل انٹیلی جنس اینڈ سیکورٹی اتھارٹی کا درجہ حاصل ہے۔ یہ اتھارٹی تمام متعلقہ ایجنسیوں کے اپریشنز اور دیگر سرگرمیوں کو مربوط کرتی ہے۔ موساد کا چیئرمین اس کمیٹی کا بھی سربراہ ہے۔

موساد (MOSSAD)

یہ اسرائیل کی سیکرٹ انٹیلی جنس سروس ہے' جس کا بنیادی کام بیرونی ممالک میں جاسوسی اور خفیہ سرگرمیاں انجام دینا ہے۔ اسرائیل کا وزیراعظم براہ راست اس سروس کا سربراہ ہے۔

شین بیتھ (SHIN BETH)

یہ کاؤنٹر انٹیلی جنس اور اندرون ملک کی سیکورٹی ایجنسی ہے۔ جس کی اہم ذمہ داری وی آئی پی اور وی وی آئی پی‘ فوجی سربراہوں‘ سیاستدانوں‘ اعلیٰ سرکاری عہدیداروں‘ صنعتی تنصیبات‘ ہوائی اڈوں‘ اسرائیل کی ایئر لائن‘ بندرگاہوں اور بیرون ممالک اسرائیلی سفارتخانوں کی حفاظت کرنا ہے۔ یہ ایجنسی اندرون اور بیرون ملک اپنے فرائض انجام دیتی ہے۔ اس ادارے کی سربراہی بھی اسرائیلی وزیراعظم کے پاس ہے۔

ملٹری انٹیلی جنس

اس ادارے کی ذمہ داری اہداف کی فوجی حکمت عملی کے بارے میں عمومی اور الیکٹرانک رپورٹیں حاصل کرنا ہے۔ یہ قومی انٹیلی جنس کے تخمینے بھی تیار کرتی ہے اور اس کا سربراہ اسرائیلی افواج کا چیف آف سٹاف ہوتا ہے۔ جو دوسرے محکمے اسرائیلی انٹیلی جنس کے کام میں اس کی مدد کرتے ہیں‘ ان میں ریسرچ اینڈ پولیٹیکل پلاننگ سنٹر‘ منسٹری آف فارن افیئرز‘ پولیس کا سپیشل ٹاسک ڈویژن جس کے ذمہ تفتیش کا کام ہے‘ سرحدی گارڈز‘ ملٹری آف فانس‘ EIAI‘ اسرائیل کی قومی ایئر لائنز‘ ZIN‘ قومی جہاز ران کمپنی‘ صیہونی تنظیمیں اور اندرون ملک اور بیرون ملک بسنے والے تمام یہودی نسل کے لوگ شامل ہیں۔

اسرائیلی انٹیلی جنس کا یہ ڈھانچہ تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ چلتا رہا‘ مگر اکتوبر 1973ء میں ”جنگ رمضان“ میں اسرائیلی انٹیلی جنس کو خاصی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ناکامی کی تحقیقات کے لئے نومبر 1973ء میں آرگناٹ کمیشن قائم کیا گیا جس نے تفصیل سے اس ناکامی اور انٹیلی جنس اینڈ سیکورٹی سروسز کی کارکردگی کا جائزہ لیا اور درج ذیل سفارشات مرتب کیں:

1- سپیشل ایڈوائزر ٹو پرائم منسٹر کے عہدے کو مزید مضبوط بنایا جائے اور اس عہدے پر کسی ایسے شخص کو تعینات کیا جائے جو انٹیلی جنس اینڈ سیکورٹی سروسز کی رپورٹوں کو سمجھنے‘ ان کا بغور جائزہ لینے‘ ان رپورٹوں کی روشنی میں سروسز کی سرگرمیوں کا درست اندازہ لگانے اور وزیراعظم کو اس موضوع پر درست بریفنگ دینے کا اہل ہو۔ (جنرل راحاوام زیوی‘ اسرائیلی وزیراعظم کے پہلے انٹیلی جنس ایڈوائزر تھے)۔

2- موساد میں ایک ریسرچ یونٹ قائم کیا جائے جو انٹیلی جنس کی تخمینہ سازی کے کام کرے اور ملٹری انٹیلی جنس سے جدا ہو۔

3- وزارت خارجہ میں ایک پولٹیکل پلاننگ سینٹر قائم کیا جائے جس کا رابطہ اور تعلق خاص طور پر موساد کے ساتھ ہو اور دیگر سروسز کے ساتھ اس کا عمومی ربط برقرار رہے۔ اس سفارش کا مقصد یہ تھا کہ ملٹری انٹیلی جنس کے اندازوں پر کلی بھروسہ اور اعتماد نہ کیا جائے بلکہ ایک اور ادارہ بھی اسے چیک کرے۔

4- سروسز کا' عملی طور پر' اطلاعات اور رپورٹیں اکٹھی کرنے کے حوالے سے آپس میں بنیادی ربط تو رہے مگر مختلف ایجنسیوں کے تیار کئے گئے حتمی نتائج اور سفارشات ایک دوسرے کو نہ دکھائی جائیں اور یہ رپورٹیں مختلف سروسز ہیڈ کوارٹرز اور وزیراعظم کو بھجوائی جائیں۔

ان سفارشات کے نتیجے میں سروسز میں بہت سی تبدیلیاں کی گئیں اور بہت سے عہدوں پر نوجوانوں کی تعیناتی کی گئی اور 1977ء میں فیڈریل کمیٹی آن سیکورٹی افیئرز بھی قائم کی گئی۔

انتظامیہ

مختلف اپریشنز کو خفیہ رکھنے کے لئے اور خاص طور پر اخراجات کو خفیہ رکھنے کے لئے وزارت دفاع اور آئی ڈی ایف ان سروسز کو تمام تر انتظامی معاونت فراہم کرتی ہے۔ اصل اخراجات پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے اور انہیں ہمیشہ خفیہ رکھا جاتا ہے۔ ان کا علم وزارت خزانہ کے چند اعلیٰ حکام اور ناظمین ہی کو ہوتا ہے۔ ناظم ان اخراجات کا سالانہ آڈٹ کرتے ہیں جو قومی دولت کو ان سرگرمیوں پر درست طریقے اور ایمانداری سے خرچ کرنے کو یقینی بناتا ہے اور ان اخراجات کے درست یا غلط استعمال کے بارے میں حتمی رپورٹ تیار کرتا ہے۔

گورنمنٹ اور خفیہ ایجنسیوں کے تعلقات

اس بات کو یقینی بنایا جاتا ہے کہ سیکورٹی سروسز کی تمام سرگرمیوں اور منصوبوں سے وزیراعظم کو آگاہ رکھا جائے۔ تمام ایجنسیاں وزیراعظم کو اپنے مقاصد اور متوازن تخمینوں اور اندازوں سے بھی باخبر رکھتی ہیں۔ وزیراعظم کی مدد ان کا انٹیلی جنس ایڈوائزر کرتا ہے۔ یہ ایڈوائزر' انٹیلی جنس کا ایک پیشہ ور شخص ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف موصول ہونے والی رپورٹوں کا ناقدانہ جائزہ لیتا ہے بلکہ وزیراعظم کو تازہ ترین صورتحال سے ہمہ وقت باخبر رکھتا ہے۔ وہ وزیراعظم کو مختلف سروسز کے اہلکاروں کے درمیان غلط فہمیوں اور ان اداروں کے پیشہ ورانہ

ادراک سے بھی مطلع کرتا رہتا ہے۔ خفیہ ایجنسیاں وزارت خارجہ کے ساتھ انتہائی قریبی رابطہ رکھتی ہیں۔ عام طور پر اعلیٰ ترین سفارتی عہدوں پر خفیہ اور تخریبی سرگرمیوں کا تجربہ رکھنے والے معمر افراد کو تعینات کیا جاتا ہے۔ اور خاص طور پر ان عہدوں پر ایسے افراد کو ترجیح دی جاتی ہے جو اسرائیلی انتظامیہ میں اہم عہدوں پر فائز رہ چکے ہوں۔ یہ سفارتکار غیر ملکی سفارتخانوں میں نہ صرف سروسز کے خفیہ ایجنٹوں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں بلکہ خود بھی خفیہ سرگرمیوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ فارن سروس کے کسی بھی آفیسر کی اپنے کسی سفارتی ذریعے سے حاصل کی گئی معلومات کو فوری طور پر انٹیلی جنس آپریٹر تک پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ وہ اس کی روشنی میں مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کر سکے۔ اسی طرح پرائیویٹ اور پبلک انڈسٹریل یونٹوں میں منیجر کے عہدے کے افراد کا طریقہ کار بھی خفیہ والوں جیسا ہوتا ہے اور اپنے روزمرہ کے کام میں وہ بھی اسی رویے اور عمل پر کاربند رہتے ہیں۔

عوام اور خفیہ ایجنسیوں کا رابطہ

اسرائیل کے وجود کو قائم رکھنے کے لئے اسرائیلی عوام اور خفیہ ادارے مل کر جدوجہد کرتے ہیں اور آج بھی اسرائیل کی نظریاتی اور جغرافیائی حدود کا تحفظ نہ صرف ان اداروں کی ذمہ داری ہے بلکہ عوام بھی اسے اپنے ایمان کا جزو لاینفک سمجھتے ہیں اور قومی سلامتی کے فرائض کی ادائیگی میں ان اداروں کا بھرپور ساتھ دیتے ہیں۔ ان اداروں کی عوام کی نظروں میں اہمیت اور عزت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ اسرائیل کے ساتھ عربوں کی مسلح جدوجہد میں ان اداروں کے اہلکاروں نے ہمیشہ قومی جذبے کے ساتھ اپنے فرائض نبھائے ہیں۔ ان اداروں نے دنیا بھر میں صیہونی مفادات کے تحفظ کے لئے جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں ان کی وجہ سے ان کا احترام ہر یہودی کے دل میں موجود ہے اور وہ ان اداروں کو اپنے تحفظ اور سلامتی کا علمبردار مانتے ہیں۔

پیشہ ورانہ مہارت

جیسا کے پہلے بتایا گیا ہے اعلیٰ ترین عہدوں پر انتہائی تجربہ کار، تربیت یافتہ اور مکمل طور پر پیشہ ورانہ مہارت رکھنے والے افراد کو تعینات کیا جاتا ہے۔ اور ان کے انتخاب میں ان کے اعلیٰ کردار، وطن دوستی، دیانتداری اور صیہونی مقاصد کے لئے جان بھی قربان کر دینے کے جذبے کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اسرائیلی سروسز کی یہ روایات ایک وراثت کے طور پر دوسری جنگ عظیم سے نسل در نسل منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ یہ افراد انتہائی پڑھے لکھے،

چار یا اس سے زیادہ زبانوں پر عبور اور خفیہ سرگرمیوں کا تمام تر تجربہ رکھتے ہیں۔ ان میں عمر کی کوئی قید نہیں' جب تک ایک تجربہ کار کارکن ملک کی خدمت انجام دے سکتا ہے اسے ریٹائر نہیں کیا جاتا۔

سروسز میں نوجوان اہلکاروں کی بھرتی کے بعد انہیں انتہائی دشوار اور تھکا دینے والے تربیتی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے تاکہ وہ بھی اس پیشہ ورانہ معیار کے حامل ہو سکیں جو اسرائیل کی انٹیلی جنس اور سیکورٹی سروسز کا طرۂ امتیاز ہے' حتیٰ کہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے بیرون ملک جانے والے طلبہ کو بھی خفیہ سرگرمیوں کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ افراد اور اداروں کی سیکورٹی کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ اور سروسز میں اپنا کیریئر بنانے کے خواہشمند نوجوانوں کے انتخاب سے پہلے ان کے بارے میں مکمل تحقیقات کی جاتی ہیں اور ان کے ذاتی کردار کی تفصیلی چھان پھٹک کی جاتی ہے۔

ایک بار منتخب ہو جانے کے بعد ان کی پوزیشن اور حیثیت کو انتہائی خفیہ رکھا جاتا ہے۔ یہ راز داری اس حد تک ہوتی ہے کہ ان لوگوں کے عزیز و اقارب اور دوست احباب کو بھی ان کے کام کے بارے میں علم نہیں ہوتا اور سرکاری ادارے بھی ان کی اصلیت سے آگاہ نہیں ہوتے۔ اس معاملے میں اس قدر احتیاط کی جاتی ہے کہ ان کے صیہونی نام بھی تبدیل کر دیئے جاتے ہیں اور انہیں انگریزی ناموں سے پکارا جاتا ہے جس سے ان کی پہچان دوسروں کے لئے اور بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ جو افراد سروسز کے پیشہ ورانہ معیار اور سیکورٹی کے مطلوبہ معیار پر پورے نہیں اترتے انہیں کسی قیمت پر بھی سروسز میں شامل نہیں کیا جاتا۔



آگ اور خون کا کھیل

اسرائیل اور امریکہ کی دوستی' چالاک بلی اور نادان چوہے کی دوستی کے مترادف ہے۔ اسرائیل کی خفیہ ایجنسی موساد نے امریکنوں کو کئی بار اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا ہے اور عجب مہارت سے ان کو بیوقوف بنایا ہے۔ امریکی بھی عجب قوم ہیں کہ بدستور احمق بنتے چلے جا رہے ہیں۔

امریکہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہودی دنیا میں جہاں کہیں بھی ہو اپنی اسرائیلی ریاست کی خدمت کے لئے ہر لحظہ تیار رہتا ہے اور امریکہ میں بسنے والے یہودی امریکہ سے انتہائی خفیہ تکنیکی راز چرا کر موساد کے ایجنٹوں کو پہنچا دیتے ہیں۔ مگر پھر بھی امریکہ ہر میدان میں اسرائیل کی پشت پناہی کے لئے تیار رہتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے موساد کے ایک سابق ایجنٹ' وکٹر اوسٹروسکی' نے اپنی ایک کتاب "By Way of Deception" میں موساد کی چند کارروائیوں کا راز فاش کیا ہے۔ اوسٹروسکی لکھتا ہے کہ ریاستی دہشت گردی' اسرائیل کی حکومتی پالیسی کا ایک بنیادی اور اہم عنصر ہے۔ موساد اسرائیل کے امور خارجہ اور حکمت عملی کو کنٹرول کرتا ہے اور وزرات خارجہ کی جرات نہیں کہ موساد کی حکم عدولی کر سکے یا اس کی ہدایات کے برعکس کوئی فیصلہ کرے۔ جب سے موساد معرض وجود میں آیا ہے' اس گھڑی سے اب تک یہ دہشت گردی کی درجنوں کارروائیاں کر چکا ہے اور امریکہ' انگلستان' فرانس اور دوسرے ممالک کو بیوقوف بنا چکا ہے۔

تصور کیجئے ایک ایسی دنیا کا جس میں اسرائیل کا وجود نہ ہو' کیا یہ دنیا ایک پرسکون' خوشحال اور دوستانہ ماحول کا خطہ نہیں نظر آئے گی؟ دنیا میں موجود بیشتر خباثتوں کا بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کا سرچشمہ اسرائیل ہی ہے۔ دنیائے سیاست کی ہر برائی جو مسلمانوں کے خلاف ہے' شاید یہیں جنم لیتی ہے۔

اسلام دشمنی' یہود و نصاریٰ کا جزو ایمان تو ہے ہی پر اسرائیلی فلسطینیوں کو اپنا ازلی دشمن سمجھتے ہیں۔ تقریباً پچاس برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اسرائیلیوں نے فلسطین پر قبضہ جما رکھا ہے اور بیچارے فلسطینی دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ موساد کے درندے ہر جگہ فلسطینیوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور ان کی حرکات و سکنات کی پوری نگرانی کرتے

ہیں۔ جو فلسطینی مجاہد انصاف اور مادر وطن کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں وہ موساد کا خاص نشانہ ہیں۔

موساد کے ماسٹر ایجنٹ ہمہ وقت اس جستجو میں رہتے ہیں کہ فلسطینی باشندوں ہی میں سے ایسے مخبر ڈھونڈیں جو فلسطینی مجاہدین کے سرکردہ لڑاکوں' اہداف' پروگرام اور دوسری سرگرمیوں کی خبر موساد تک پہنچاتے رہیں۔ مخبر بھرتی کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ پہلے تو ضمیر فروشوں کی تلاش رہتی ہے جو کم و بیش ہر ملک و قوم میں مل ہی جاتے ہیں۔ اور تھوڑی سی رقم کے بدلے اپنے دوستوں کی سلامتی دشمن کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ بعض لوگ عورت اور شراب کی بوتل پر ہی بک جاتے ہیں۔ موساد ان فلسطینیوں کا پیچھا بھی کرتی ہے جو دوسرے مغربی ممالک میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ انہیں بھی دھمکیوں لالچ' یا دوسرے طریقوں سے بلیک میل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

فلسطینی مجاہدین اگر کہیں پکڑے جائیں تو موساد کے ایجنٹ شکاری کتوں کے ساتھ ان کا پیچھا کرتے ہیں۔ اور تپتے ہوئے صحراؤں میں کچھ دن ان کو خوب بھگاتے ہیں اور جب وہ تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں تو انہیں شکار کر کے لطف لیتے ہیں۔ چند ایک کو پوچھ گچھ اور مزید تفتیش کے لئے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔

تل ابیب کے قریب نیز زیونا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں پوچھ گچھ کا ایک مرکز ہے۔ سنا ہے یہاں کوئی بھی مشتبہ شخص جو اندر لیجایا گیا ابھی تک زندہ سلامت باہر نہیں آیا۔ درحقیقت یہ ایک ایٹمی' جراثیمی اور کیمیائی ہتھیاروں کی تجربہ گاہ ہے' جہاں ان مجاہدوں پر مختلف تجربات کر کے ان ہتھیاروں کی افادیت کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ ان تجربات کے لئے فلسطینیوں سے سستا انسان اسرائیلیوں کو اور کہاں سے مل سکتا ہے؟

جنوبی افریقہ میں جوہانزبرگ سے باہر سوتیو کا ایک قصبہ ہے جہاں برگواناتھ ہسپتال میں صرف سیاہ فام باشندے علاج معالجے کے لئے جاتے ہیں۔ یہ ہسپتال ونی منڈیلا اور بشپ ڈسمنڈ ٹوٹو کی رہائش گاہ کے بالکل قریب ہے اور بالٹی مور کا ہسپتال اس کی مدد کرتا ہے۔ یہاں چند یہودی ڈاکٹر "انسانی ہمدردی" کے طور پر "خدمات" انجام دینے آئے۔ درحقیقت انہوں نے یہاں بھی جراثیمی ادویات کے بے دریغ تجربات کئے اور کئی مریضوں کو تجربے کے طور پر استعمال کیا اور ہلاک کر دیا۔ ظاہر ہے وہ ایسے تجربات اپنے اسرائیلی ہسپتالوں میں تو کر نہیں سکتے تھے۔

اوسٹروسکی لکھتا ہے کہ اسرائیل نے بین الاقوامی سطح پر امریکنوں کو بہت مرتبہ اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا اور بیوقوف بنایا۔ امریکہ ابھی تک اسرائیلیوں کے ہاتھوں

بیوقوف بنتا چلا آ رہا ہے مگر ابھی تک اس نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

فروری 1986ء میں اسرائیل نے لیبیا میں آپریشن ٹراجن ہارس شروع کیا۔ اسرائیلی خفیہ ایجنٹوں نے ٹراجن نامی ایک وائرلیس ٹریپولی کی الجمہوریہ سٹریٹ کے ایک اپارٹمنٹ میں نہایت چالاکی سے نصب کر دیا۔ اسرائیلی نفسیاتی جنگ کے ماہر' سمندر میں لنگر انداز اپنے جنگی جہاز سے پیغام نشر کرتے جو "ٹراجن" دوبارہ براڈکسٹ کرتا۔ ٹراجن وائرلیس اسی فریکونسی پر پیغام نشر کرتا جو لیبیا کے سرکاری وائرلیس سیٹ کی فریکونسی تھی اور امریکی جہاز یہ پیغامات ریکارڈ کر لیتے۔ ان جھوٹے پیغامات سے یہ تاثر ملتا جیسے لیبیا بیرونی ممالک میں مقیم اپنے سفارتکاروں کو یہ ہدایات دے رہا ہو کہ "فلاں دن فلاں جگہ یہ تخریب کاری کی جائے"۔ پھر نہایت چالاکی اور ہوشیاری کے ساتھ اسی قسم کی "خبر" موساد کے جاسوس مختلف ممالک میں امریکی سفارتکاروں کو بھی پہنچا دیتے۔ جب امریکی سی آئی اے کے ایکسپرٹ ان من گھڑت خبروں کا تجزیہ کرتے تو وہ ان کو سچ سمجھ لیتے۔ امریکی ایکسپرٹ یہ بنیادی بات بھی بھول جاتے کہ کوئی بھی ملک خفیہ تخریبی کارروائیوں کے احکامات وائرلیس پر نشر نہیں کرے گا۔ لیبیا دشمنی نے امریکہ کو اس قدر اندھا کر دیا کہ انہیں خبروں کی سیاہی اور سفیدی کا فرق نظر آنا بند ہو گیا اور اس کے نتیجہ میں 14 اپریل 1986ء کو امریکہ کے 160 جہازوں نے تقریباً 60 ٹن کے مختلف اقسام کے بم ٹریپولی کے ہوائی اڈے' باب العزیز بیرک' سدی بلال نیول بیس' بن غازی شہر اور کرنل معمر قذافی کے گھر پر گرا دیئے جس سے کرنل قذافی کی لے پالک بیٹی اور چالیس کے قریب دوسرے بے گناہ شہری مارے گئے۔

موساد کے ایجنٹوں نے "اپریشن ٹروجن ہارس" کی کامیابی پر خوشیوں کے نقارے بجائے اور امریکنوں کو پوری طرح احمق بنانے پر ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔ اس اپریشن سے اسرائیل کے تین ہدف پورے ہوئے۔ پہلے یہ کہ کرنل قذافی کو ہمیشہ کے لئے تخریب کار قرار دے دیا گیا اور آئندہ کسی بین الاقوامی مفاہمت کی مشاورت سے ان کو خارج کروا دیا' دوسرے حزب اللہ کے ساتھ بات چیت منقطع ہو گئی۔ اس سے امریکہ کی عرب۔ اسرائیل پالیسی اور حکمت عملی کھل کر سامنے آ گئی اور تیسرے اس سے موساد کے ایجنٹوں کے حوصلے بہت بلند ہو گئے کہ وہ امریکہ جیسی قوت کو بھی اسرائیل کے مفاد میں بڑی کامیابی سے استعمال کر سکتے ہیں۔

موساد کے ایجنٹ' سی آئی اے کے ایجنٹوں کی موجودگی میں' بڑی ہوشیاری سے سری لنکا میں اسلحہ بیچتے رہے۔ اسرائیل' سری لنکا کی سرکاری افواج اور تامل ٹائیگرز' دونوں کے ہاتھ بیک وقت اسلحہ بیچتا اور اس کی کوشش تھی کہ یہ تنازعہ طول پکڑے تاکہ زیادہ سے زیادہ

اسلحہ فروخت کر کے زیادہ سے زیادہ رقم کمائی جا سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سری لنکا میں بھی امریکیوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔

اسی طرح اسرائیل نے مصر میں اخوان المسلمین کو بھی اس بہانے سے اسلحہ فروخت کیا کہ وہ افغانستان میں روسی فوجوں سے برسرپیکار تھے۔

سیاسی میدان میں اسرائیل کا موقف یہ ہے کہ فلسطین اسرائیل کا مسئلہ نہیں۔ چونکہ اردن کی پچھتر فیصد سے زائد آبادی فلسطینی باشندوں پر مشتمل ہے اس لئے باقی ماندہ فلسطینیوں کو بھی اردن میں جا کر آباد ہو جانا چاہیے۔ اسرائیل نے شاہ حسین کی حکومت کو مزید کمزور کرنے کے لئے جعلی کرنسی نوٹ مارکیٹ میں پھینک دیئے۔ کچھ انتہا پسند مذہبی تنظیموں کو اسلحہ سپلائی کیا اور چیدہ چیدہ لیڈروں کو ہلاک بھی کیا۔ اور یہ سب کچھ کمال جرات کے ساتھ امریکہ کی موجودگی میں کیا۔

ایران عراق جنگ میں بھی اسرائیل نے بہت فعال کردار ادا کیا۔ امریکہ یہ چاہتا تھا کہ کسی طور ایران میں اسلامی انقلاب کو شکست دی جائے۔ چنانچہ امریکہ نے عراق کو اکسایا کہ یہ وقت ہے کہ عراق' ایران کے شاہ کی زیادتیوں کا بدلہ لے اور یکطرفہ طور پر 1975ء کا معاہدہ الجزائر منسوخ کر دے اور ایران پر حملہ آور ہو کر اپنی تاریخی جغرافیائی حدوں پر پہنچ جائے۔ صدام حسین اس جھانسے میں آگیا اور 1975ء کا معاہدہ الجزائر پھاڑ کر ایران پر حملہ آور ہو گیا۔

عراق کی جنگی صلاحیتیں بڑھانے کے لئے امریکہ نے سعودی عرب اور کویت کو حکم دیا کہ وہ اپنے تیل کی دولت کا منہ عراق کے لئے کھول دیں۔ امریکہ اور اس کے مغربی اتحادی ملکوں کی اسلحہ کی فیکٹریوں نے دن رات کام کرنا شروع کر دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تقدیر بدل گئی۔ بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور بھوک ننگ کے دھانے پر پہنچے ہوئے یہ تہذیب' انسانی حقوق اور انصاف کے دعویدار ممالک دنوں ہی میں خوشحال ہو گئے۔

اسرائیل بھی اس دولت میں ہاتھ رنگنے میں پیچھے نہ رہا۔ اس نے ایک طرف تو عراق کو جنوبی افریقہ کے ذریعے اسلحہ اور تکنیکی صلاحیتیں بیچنی شروع کیں اور دوسری طرف ایران کو لمبے راستے سے جنگی سامان بیچنا شروع کر دیا۔ پہلے تو جرمنی میں ایرانی ہوا بازوں کی تربیت کے لئے ساز و سامان مہیا کیا۔ پھر ساتھ ہی ساتھ' اٹلی سے جرمنی' جرمنی سے ڈنمارک اور ڈنمارک سے ایران' اسلحہ کی سپلائی لائین بچھا دی۔ یہ سب کچھ موساد نے اپنے ہم پیشہ' خفیہ ایجنسیوں کے ایجنٹوں کے ذریعے سے کیا۔ غرضیکہ ایران عراق جنگ طویل ہوتی گئی اور دنیائے اسلام کے خزانوں' ان کے جوان ہمت نوجوانوں' اور دولت کا بے انتہا ضیاع ہوا۔

ایران عراق جنگ کے خاتمے کے بعد اسرائیل کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں عراق کی فوجی قوت کسی اسلام دوست لیڈر کے ہاتھ نہ آ جائے۔ اور وہ اسرائیل کے لئے خطرناک نہ ثابت ہو۔ چنانچہ انہوں نے یہ کوشش شروع کر دی کہ صدام حسین تو سلامت رہے کیونکہ اس سے بہتر دوست اور دنیائے اسلام کا دشمن ان کو ملنا مشکل تھا' لیکن عراق کی جنگی صلاحیتیں تباہ ہو جائیں۔ چنانچہ اسرائیل نے امریکہ کو باور کرانا شروع کر دیا کہ صدام کی فوجوں نے اپنے ہی کردوں پر کیمیائی ہتھیار استعمال کئے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ ایران کی شہری آبادی پر سکڈ میزائلوں سے حملہ کرتا رہا ہے۔ ظاہر ہے نہ ہی امریکہ کو یہ معلوم ہو سکا اور نہ ہی اسرائیل نے یہ بتایا کہ وہ خود کرد لیڈروں کو اور برزانی کو کیمیائی ہتھیار فراہم کرتا رہا ہے اور جو عراقی میزائل ایرانی شہروں پر گرائے گئے ان کو اسرائیل کے ریڈار ہی سمت بتاتے تھے۔

ایک طرف اسرائیل' امریکہ اور مغربی اتحادیوں کو عراق کے خلاف رپورٹیں دیتا رہا' دوسری طرف صدام حسین کے خلاف جو بھی منصوبے بنتے تھے ان کی پیشگی اطلاع اپنے سفارتی نمائندوں کے ذریعے عراقی سفارت خانوں کو پہنچا دی جاتی تھی۔

اس حکمت عملی سے اسرائیل ایک مرتبہ پھر کامیاب ہو گیا۔ نہ صرف صدام حسین نے اپنے محسن کویت پر حملہ کر دیا' بلکہ امریکہ اور اس کے اتحادی اس حد تک حقیقت سے بے بہرہ رہے کہ انہوں نے عراق پر چڑھائی کر دی اور عراقی فوجی طاقت تہس نہس کر کے رکھ دی۔ اسرائیل کے پلان کے مطابق صدام حسین ابھی تک سلامت ہے اور عراقی بچے اور عوام بھوک اور بیماریوں کے لامتناہی آلام میں جکڑے ہوئے ہیں۔

اسرائیل کی حکمت عملی اور اس کی خفیہ ایجنسیوں کے نہایت ہی فعال منصوبہ بندی اور کردار کے پیش نظر پاکستان اور اس کی خفیہ ایجنسیوں کو اک مکار اور خطرناک دشمن کا سامنا ہے' یہ بات ایک مستند حقیقت کے طور پر باور کر لینی چاہئے کہ اسرائیل پاکستان کے خلاف ہمہ وقت سرگرم عمل ہے اور وہ کئی راستوں سے چوری چھپے شب خون مارنے کے درپے ہے۔ اس کے ایجنٹ ہمارے درمیان موجود ہیں اور ان کو حکومتی ایوانوں تک رسائی حاصل ہے۔ ہندوستان سے اس کا گٹھ جوڑ پاکستان دشمنی کا ایک حصہ ہے۔

اسرائیل جانتا ہے کہ دنیائے اسلام میں پاکستان اور ایران ہی اس کے بڑے دشمن ہیں اور ان کو آپس میں لڑانا اور پھر علیحدہ علیحدہ کرنا بھی اس کے آئندہ پروگرام کا لازمی حصہ ہو سکتا ہے۔

○

اپنے ہی لوگ

فلائٹ پی کے- 326

پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز کی پرواز پی کے- 326' 2 مارچ 1981ء کو دو بج کر پینتالیس منٹ پر کراچی ایئرپورٹ سے روانہ ہوئی جسے اپنے شیڈول کے مطابق چار بج کر پچیس منٹ پر پشاور کے ہوائی اڈے پر اترنا تھا۔ پرواز میں اس وقت 105! مسافر اور عملے کے 12 افراد سوار تھے۔ پرواز معمول کی رفتار سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ جہاز کا میزبان عملہ میزبانی کے فرائض سے فارغ ہو کر لینڈنگ کی تیاری کر رہا تھا۔ اس وقت تقریباً 4 بجے تھے اور جہاز میانوالی کی فضاؤں میں پرواز کرتے ہوئے اپنی بلندی کم کر رہا تھا کہ ایک مشکوک نوجوان بے چینی کے عالم میں کاک پٹ میں داخل ہوا۔ بھرا ہوا پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے جہاز کے عملے سے کہا کہ میرا تعلق پاکستان پیپلز پارٹی سے ہے' میرے دیگر ساتھی جہاز میں موجود ہیں اور ہم جہاز کو ہائی جیک کر رہے ہیں۔

جہاز میں اس نوجوان کے علاوہ اس کے دو اور ساتھی بھی تھے' جنہوں نے اس کے کاک پٹ میں داخل ہوتے ہی پستول نکال لئے اور تمام مسافروں کو ان کی زد میں لے لیا۔ ہائی جیکروں کے سرغنہ نے کپتان کو حکم دیا کہ جہاز کو دمشق لے چلو! مگر کپتان نے کہا کہ جہاز میں اتنا ایندھن نہیں ہے کہ اسے دمشق لے جایا جا سکے۔ اس پر ہائی جیکر نے اسے طرابلس جانے کا حکم دیا مگر کپتان نے کہا کہ طرابلس تو اس سے بھی دور ہے۔ "تو پھر کابل لے چلو" ہائی جیکر غرایا اور کپتان نے جہاز کا رخ کابل کی طرف موڑ دیا۔

پرواز کے دوران مسافروں کو ہائی جیکروں نے مختلف طریقوں سے ہراساں کئے رکھا' بعض مسافروں کو انہوں نے تھپڑ اور ٹھڈے بھی مارے۔ وہ جہاز کو اڑا دینے کی مسلسل دھمکیاں دیتے رہے۔ ہائی جیکروں نے تمام مسافروں سے ان کے شناختی کارڈ' پاسپورٹ اور دیگر دستاویزات لے کر ان کی پڑتال شروع کر دی۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ جہاز میں کوئی اہم شخصیت یا فوج کا کوئی افسر تو موجود نہیں۔

پی آئی اے کی یہ فلائٹ تہران سے آنے والی فلائٹ سے مربوط تھی' چنانچہ بین الاقوامی روٹ کے کچھ مسافر بھی جہاز میں موجود تھے' جنہوں نے اپنے پاسپورٹ ہائی جیکروں

کے حوالے کر دیئے۔ ان مسافروں میں تہران میں پاکستان سفارتخانے کے تھرڈ سیکرٹری کیپٹن طارق رحیم بھی شامل تھے۔ طارق رحیم' ذوالفقار علی بھٹو کے اے ڈی سی بھی رہ چکے تھے اور یہ بات ہوائی قذاقوں کو بھی یاد آگئی۔ چند روز پہلے طارق کے والد جنرل رحیم کا انتقال ہوا تھا اور طارق اپنی والدہ اور بھائی بہنوں سے ملنے کے لئے پشاور جا رہے تھا۔ ہائی جیکروں نے طارق رحیم کو دوسرے مسافروں سے علیحدہ کر دیا اور انہیں بیٹھنے کے لئے الگ نشست دے دی۔

جہاز جونہی کابل ایئر پورٹ پر اترا افغان فوجیوں نے فوری طور پر اسے گھیرے میں لے لیا۔ جہاز کا پچھلا دروازہ کھلا اور ایمرجنسی سیڑھی آکر لگ گئی۔ ہائی جیکروں کا سرغنہ سلام اللہ ٹیپو جس نے اپنا تعارف جہانگیر کے نام سے کرایا تھا جہاز سے باہر نکلا اور جہاز کے قریب موجود مرتضٰی بھٹو سے ملاقات کی۔

بعدازاں انکشاف ہوا کہ پی کے۔ 326 کے اغوا کا منصوبہ دراصل مرتضٰی بھٹو نے شام کے چیف آف انٹیلی جنس جنرل کھولی KHOLI کی نگرانی میں تیار کیا تھا۔ مرتضٰی بھٹو سے ہدایات حاصل کرنے کے بعد ٹیپو واپس جہاز میں آیا اور اس نے اعلان کیا کہ اس طیارے کو پاکستان لبریشن آرمی کے دہشت گرد ونگ الذوالفقار نے ہائی جیک کیا ہے۔ ٹیپو نے یہ اعلان بھی کیا کہ 16 فروری 1981ء کو پوپ کی کراچی آمد پر نیشنل سٹیڈیم میں اور کراچی ہائی کورٹ کے احاطہ میں 5 جنوری 1981ء کو بموں کے دھماکے بھی الذوالفقار نے کیے تھے۔

مرتضٰی بھٹو' ذوالفقار علی بھٹو کی اقتدار سے علیحدگی کے فوراً بعد ملک چھوڑ کر چلا گیا تھا اور جنرل کھولی سمیت شامی لیڈروں اور کابل کے راہنماؤں حفیظ اللہ امین' ببرک کارمل' انٹیلی جنس کے سربراہ اسداللہ سروری اور ڈاکٹر نجیب اللہ سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھا۔ حالات بتا رہے تھے کہ مرتضٰی بھٹو پاکستان میں ہونے والی دہشت گردی کی کارروائیوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ مگر ہمارے پاس اس الزام کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ تاہم پیپلز پارٹی کے بعض سرگرم ارکان مقامی قیادت کے اکسانے پر بعض ملک دشمن اور تخریبی کارروائیوں میں ملوث ہو چکے تھے۔ ان میں ایک نام لالہ اسد کا بھی تھا جو ایک دہشت گرد کی حیثیت سے خاصا بدنام ہو چکا تھا۔ لالہ اسد کا بڑا بھائی لالہ اسلم نیشنل سٹیڈیم میں بم کا دھماکہ کراتے ہوئے ہلاک ہو گیا تھا۔

ہائی جیکروں کا سرغنہ سلام ٹیپو' جماعت اسلامی کے حافظ اسلم کے قتل کے الزام میں بھی مطلوب تھا۔ ہمارے پاس قتل' بسوں کو آگ لگانے' ریلوے کی پٹڑیاں اکھاڑنے' بم دھماکے

کرنے اور انفرادی اور چھوٹے گروپوں کی سطح پر مارشل لاء کے خلاف پمفلٹ وغیرہ تقسیم کرنے کی اطلاعات تو موجود تھیں مگر اس وقت تک ہمارے پاس پاکستان لبریشن آرمی یا الذوالفقار کے بارے میں کوئی معلومات نہیں تھیں۔ یہ ہمیں ٹیپو کے اعلان ہی سے علم ہوا کہ مرتضیٰ بھٹو' پاکستان لبریشن آرمی کا سیکرٹری جنرل ہے اور اس نے پی پی پی کا یہ نعرہ بھی بلند کیا "ذوالفقار علی بھٹو کا انتقام' بھٹو ازم کا فروغ اور انتخابات"۔

ہائی جیکروں کا مطالبہ تھا کہ پی پی پی کے جیالے جو قید میں ہیں انہیں فوراً رہا کیا جائے' تاہم ٹیپو کے پاس ماسوائے ان 5 افراد کے جنہیں 26 فروری 1981ء کو کراچی یونیورسٹی میں ہونے والے طلباء کے دو گروہوں کے درمیان تصادم کے وقت گرفتار کیا گیا تھا' دیگر نظربند افراد کی کوئی فہرست نہ تھی۔ ہائی جیکروں نے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر ان کا مطالبہ تسلیم نہ کیا گیا تو وہ تمام مسافروں کو ایک ایک کر کے ہلاک کر دیں گے۔

جنرل ضیاء اس وقت ملک سے باہر تھے اور جنرل اقبال قائم مقام چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ادھر ببرک کارمل اس وقت ایک اعلیٰ سطحی افغان نمائندہ وفد کے ساتھ ماسکو میں کمیونسٹ کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے۔ اس وقت روسی فوج کا کوئی سینئر جرنیل یا کوئی اہم شخصیت افغانستان میں موجود نہ تھی۔ چنانچہ افغانستان میں اس وقت تمام اختیارات کا مالک نجیب اللہ ہی تھا اور ان حالات میں نجیب اللہ سے کوئی خاص امید نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ بہرحال فوری طور پر ڈائریکٹر جنرل سول ایوی ایشن کی سربراہی میں ایک ٹیم ہائی جیکروں اور افغان راہنماؤں سے مذاکرات کے لئے کابل روانہ ہو گئی۔

اس ٹیم کی کامیابی کی توقع اس لئے نہیں تھی کہ افغان انتظامیہ بالکل تعاون پر آمادہ نہیں تھی۔ اور ان کی ساری ہمدردیاں ہائی جیکروں کے ساتھ تھیں۔ وہ پاکستان کی حکومت پر مسلسل یہ دباؤ ڈال رہے تھے کہ ہائی جیکروں کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے۔ افغان ٹی وی اور ریڈیو پر ہر گھنٹے کے بعد ہائی جیکنگ کے حوالے سے ایک خصوصی بلیٹن نشر ہونا شروع ہو گیا جس میں پاک آرمی' پاکستان اور جنرل ضیاء کے خلاف بھرپور پراپیگنڈا کیا جا رہا تھا۔ عالمی میڈیا اور دنیا کی اہم شخصیات ہائی جیکروں کو مراعات دینے' ان کے مطالبات کی حمایت کرنے اور فضائی قذاقی جیسے قبیح فعل کو جائز قرار دینے پر افغان حکومت پر سخت تنقید کر رہی تھیں۔

4 مارچ کو خواتین کے عالمی دن کے موقعہ پر ایک افغان خاتون وزیر انیتا رطب زادہ نے ہائی جیکروں سے "اپیل" کی کہ جہاز میں موجود خواتین اور بچوں کو رہا کر دیا جائے۔ جس کے

نتیجے میں 36 خواتین اور بچے اور 2 بیمار مسافروں کو رہا کر دیا گیا جنہیں 5 مارچ کو پشاور پہنچا دیا گیا۔

دوسرے روز ہائی جیکروں نے ایسے 92 افراد کی فہرست فراہم کی جو ان کی اطلاع کے مطابق، نظر بند تھے یا جیلوں میں سزا کاٹ رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ لسٹ مرتضیٰ بھٹو اور اس کے ساتھیوں نے تیار کی تھی کیونکہ ٹیپو میں تو اتنا دماغ نہیں تھا کہ 92 نام یاد ہی رکھ سکے۔ اس فہرست کے ملتے ہی قانون نافذ کرنے والے تمام ادارے، سیکورٹی ایجنسیاں اور وزارت داخلہ کے افسران سر جوڑ کر بیٹھ گئے، مگر ان کے لئے ان فہرست میں شامل تمام افراد کی شناخت بہت بڑا مسئلہ بن گیا۔ اس میں کچھ نام ایسے بھی تھے جن کا پیپلز پارٹی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ (بعد میں ہم نے ڈور کا سرا یہیں سے پکڑا اور چند ناموں پر کام شروع کر دیا۔) ہائی جیکروں سے مذاکرات کرنے والی ٹیم کو بتا دیا گیا کہ ہمارے پاس اس فہرست میں دیئے گئے افراد میں سے بہتوں کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے اس لئے یہ تمام افراد ان کو نہیں دیئے جا سکتے۔

طارق رحیم کو ہائی جیکر مسلسل دھمکا رہے تھے کہ اگر مطالبات نہ مانے گئے تو سب سے پہلے تمہیں گولی مار دی جائے گی۔ طارق رحیم خاصا گھبرا گیا تھا۔ اس نے نشست پر بیٹھے بیٹھے متعدد خطوط لکھے اور خاموشی سے اپنی پچھلی نشست پر بیٹھی ایک خاتون کے حوالے کر دیئے۔

6 مارچ کی شام کو ہائی جیکروں کی جانب سے دیئے گئے 24 گھنٹے کے الٹی میٹم کی معیاد ختم ہو گئی۔ ٹیپو نے اپنے ساتھی ناصر جمال سے طارق رحیم کو فرسٹ کلاس کے ایریا میں لانے کو کہا۔ ناصر یہ حکم سنتے ہی طارق رحیم کو گھسیٹتے اور زدوکوب کرتے ہوئے ٹیپو کے پاس لے گیا۔ ٹیپو نے طارق رحیم کو گولی ماری اور جہاز کا دروازہ کھول کر اسے باہر پھینک دیا۔ یہ خونی ڈرامہ کابل ایئرپورٹ کے کنٹرول ٹاور میں بیٹھے مرتضیٰ بھٹو، شاہنواز بھٹو اور سہیل سیٹھی بھی دیکھ رہے تھے۔ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ ٹیپو نے مرتضیٰ بھٹو کے حکم کے بغیر طارق رحیم کو گولی ماری ہو گی۔ ٹیپو محض ایک کارندہ تھا اور اسے سارے ڈرامے کی ہدایات مرتضیٰ بھٹو، نجیب اللہ، اور شام کے جنرل کھولی دے رہے تھے۔

طارق رحیم کے خون کے چھینٹوں نے افغانیوں کے چہرے زرد کر دیئے اور وہ خود کو گنہگار اور بے چین محسوس کرنے لگے۔ دنیا میں ہر طرف افغان حکومت کو اس خون کا ذمہ دار ٹھہرایا جا رہا تھا، شاید اور خون برداشت کرنے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔ انہوں نے مرتضیٰ بھٹو کو مشورہ دیا کہ فوری طور پر جہاز کو کابل سے لے جانے کی ہدایات دے دو!

پاکستان کی اپیلوں کے باوجود افغانیوں نے جہاز میں ایندھن بھرا' ہائی جیکروں کو مزید خودکار اسلحہ فراہم کیا' مرتضیٰ بھٹو کو طیارے میں بٹھایا اور اسے کابل سے روانہ کر دیا۔

جنرل ضیاء اپنا دورہ مختصر کر کے واپس آ چکے تھے اور دنیا کے متعدد راہنماؤں سے بات چیت کر کے ان سے مداخلت کی اپیل کر رہے تھے۔ ان راہنماؤں میں شام کے حافظ اسد' سعودی عرب کے شاہ خالد' فرانس کے صدر جسکارڈ اور یو این او کے سیکرٹری جنرل کرٹ والڈہیم بھی شامل تھے۔ تاہم افغانستان کے منفی رویے اور شام کی حکومت کی سرد مہری کی وجہ سے بات چند بیانات سے آگے نہ بڑھ سکی۔ جنرل ضیاء کے پاس اس وقت دو ہی راستے تھے۔ اول یہ کہ وہ ہائی جیکرں کے مطالبے تسلیم کرنے سے انکار کرتے رہیں اور جہاز کے مسافروں کی زندگیاں داؤ پر لگا دیں۔ یا ان افراد کی تعداد کے بارے میں حتمی مذاکرات کریں جن کی رہائی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اغواء شدہ جہاز کے مسافروں کے عزیز و اقارب اور خاص طور پر امریکہ کی جانب سے جنرل ضیاء پر دباؤ بڑھ رہا تھا کیونکہ طیارے میں تین امریکی بھی موجود تھے۔ یہ میر مرتضیٰ بھٹو اور جنرل ضیاء کے درمیان اعصابی جنگ تھی۔ جنرل ضیاء کے اعصاب اپنے مقابل سے کہیں زیادہ مضبوط تھے مگر حالات ان کے خلاف تھے۔

شام کی حکومت کا رویہ بھی پاکستان کی حکومت کو نیچا دکھانے کا تھا۔ انہوں نے نہ تو مسافروں کی رہائی کے لئے کسی کمانڈو ایکشن کی اجازت دی اور نہ ہی اس سلسلے میں مرتضیٰ بھٹو اور ہائی جیکروں پر کوئی دباؤ ڈالا۔ 10 مارچ کو سلام ٹیپو کے والد اور ناصر جمال کی والدہ کو ایک خصوصی پرواز سے دمشق بھیجا گیا۔ ٹیپو کے والد نے اپنے بیٹے سے بات کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر ٹیپو نے یہ کہہ کر اسے واپس بھیج دیا "میں آپ کو نہیں جانتا' میرے باپ کا نام ذوالفقار علی بھٹو ہے اور نصرت بھٹو میری ماں ہیں۔ پلیز آپ واپس چلے جائیں اور اپنا وقت ضائع نہ کریں"۔ ناصر جمال نے بھی اپنی ماں سے یہی کچھ کہہ کر ملنے سے انکار کر دیا۔

آخر کار ہائی جیکروں نے اس فہرست پر نظر ثانی کی اور اسے 92 سے گھٹا کر 54 کر دیا۔ جنرل ضیاء کی ہر ممکن کوشش کے باوجود ہائی جیکروں کے خلاف دباؤ نہ بڑھا سکے اور بالآخر حکومت نے ہائی جیکروں کے مطالبات مان لئے اور طے پایا کہ مطلوبہ 54 افراد کو رہا کر دیا جائے گا اور انہیں ایک خصوصی پرواز کے ذریعے طرابلس' لیبیا پہنچا دیا جائے گا۔ جہاں ان کے بدلے اغواء شدہ طیارے کے مسافر حکومت پاکستان کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔

پروگرام کے مطابق پاکستان کے مختلف علاقوں سے ان 54 افراد کو کراچی میں اکٹھا کیا گیا

جہاں سے انہیں لیبیا روانہ ہونا تھا۔ ان میں سے متعدد افراد اور ان کے رشتہ داروں کے رویے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لیبیا جانے کی بجائے پاکستان کی جیلوں میں ہی رہنا چاہتے ہیں۔ انہیں اپنی منزل کا کوئی علم نہ تھا اور نہ ہی وہ خود پر دہشت گرد کا لیبل لگوانا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک جام ساقی بھی تھے۔ انہوں نے جانے سے صاف انکار کر دیا اور انہیں نہ بھجوایا جا سکا۔ مناظر عجیب و غریب اور انتہائی دلخراش تھے۔ بعض لوگوں کو زبردستی ان کے رشتہ داروں سے کھینچ کر الگ کیا گیا اور جہاز میں ڈالا گیا۔ ان مناظر کو دیکھنے والے اسے انتظامیہ کا غیر انسانی سلوک تو قرار دے سکتے ہیں مگر انتظامیہ کی مجبوری یہ تھی کہ اسے دمشق ایئرپورٹ پر کھڑے پی آئی اے کے اغوا شدہ جہاز کے معصوم مسافروں کی جانیں بچانا تھیں۔ روانگی کے اس منظر کو دیکھ کر ہر آنکھ اشک بار تھی۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ تاہم اس موقع پر چند نوجوانوں نے فوج اور جنرل ضیاء کے خلاف نعرہ بازی بھی کی۔

اس ڈرامے کے مصنفین کی طرف سے تمام انتظامات کی تکمیل کی یقین دہانی کے بعد یہ خصوصی طیارہ صبح 11 بج کر 26 منٹ پر کراچی ایئرپورٹ سے روانہ ہوا اور پاکستانی وقت کے مطابق 4 بج کر 37 منٹ پر ایلی پو (شام) میں اتر گیا۔ وہاں سے جہاز طرابلس روانہ ہو گیا مگر عین وقت پر لیبیا نے اس سارے ڈرامے میں پارٹی بننے سے انکار کر دیا۔ ان کا یہ فیصلہ شاید ان کی ضمیر کی آواز تھا یا وہ سمجھ گئے تھے کہ جو فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا وہ تو نجیب اللہ اور جنرل کوہلی نے اٹھا لیا' لیبیا خواہ مخواہ اب اس قصے میں کیوں آئے۔ بہرحال انہوں نے پاکستان اور شام کی حکومت کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ جہاز کو اپنا روٹ تبدیل کرنا پڑا اور وہ ایندھن لینے کے لئے ایتھنز ایئرپورٹ پر اتر گیا۔ اس نئی صورتحال کے پیش نظر جنرل ضیاء نے شام کے صدر حافظ الاسد سے بات کی اور یہ فیصلہ ہوا کہ مسافروں کا تبادلہ دمشق میں ہی کیا جائے۔

یوں تیرہ روز کے جان لیوا انتظار کے بعد پی کے۔ 326 کے مسافروں کو کسی جرم کے بغیر ملنے والی قید سے رہائی ملی۔ پاکستانی ڈاکٹروں اور نرسوں کی ایک ٹیم پہلے ہی سے دمشق کے ایک ہسپتال میں پہنچا دی گئی تھی جنہوں نے ان رہا شدہ افراد کا تفصیلی معائنہ کیا اور سعودی عرب کے شاہ خالد کی خصوصی دعوت پر یہ تمام افراد عمرہ کی سعادت حاصل کرتے ہوئے وطن واپس پہنچے۔

میر مرتضیٰ بھٹو کے لئے یہ سارا کھیل انتہائی اعصابی دباؤ کا باعث تھا۔ اسے اچانک یہ خیال آیا کہ "میں اس ڈرامے میں بری طرح ملوث ہو چکا ہوں اور اس خود ساختہ کھیل سے

خود کو بچا لینا اب میرے بھی بس کی بات نہیں رہی۔" اس میں نہ تو اتنے بڑے واقعہ سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت تھی اور نہ ہی اس کے پاس اتنے وسائل تھے کہ وہ اس سے بخوبی نمٹ لیتا۔ وہ مکمل طور پر الجھن کا شکار تھا اور اسے قطعی کوئی علم نہیں تھا کہ اس کی جھولی میں جن 54 خواتین و حضرات کو ڈال دیا گیا ہے وہ ان کے مستقبل کے بارے میں کیا لائحہ عمل اختیار کرے۔ اس نے ان افراد سے خطاب کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا کہ "نہ تو میرے پاس تمہاری بحالی کا کوئی منصوبہ ہے اور نہ میں اس موقع پر تمہیں کوئی گائیڈ لائن دے سکتا ہوں اور نہ ہی میں تمہاری مدد کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔" اس کی ساری بہادری اور دلیری کافور ہو چکی تھی اور 54 افراد کا یہ اجتماع اس کے زرد چہرے کو حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ان افراد کو بے یار و مددگار شام کے صحراؤں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ ان میں سے کچھ تو سیاسی پناہ حاصل کرنے کے لئے لندن روانہ ہو گئے' چند نے وطن واپس آنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے اور صرف 25 افراد ایسے تھے جنہوں نے حتمی طور پر مرتضٰی بھٹو کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور تقریباً ایک ماہ بعد نئی دہلی کے راستے کابل پہنچ گئے۔

ہمارے دشمن ملک بھارت نے عملی طور پر میر مرتضٰی بھٹو کی مدد کی۔ اس کے منصوبوں کی تکمیل کے لئے نہ صرف سرمایہ فراہم کیا بلکہ اس کے ساتھیوں کو پاکستان میں تخریب کاری کی سرگرمیوں کے لئے ضروری تربیت بھی دی۔

جہاں تک ہائی جیکروں کی تقدیر کا معاملہ ہے تو سلام اللہ ٹیپو کو مرتضٰی بھٹو کے حکم پر پارٹی سے بغاوت کا مجرم قرار دے دیا گیا اور قتل کروا دیا گیا۔ ناصر بلوچ کو گولی مار دی گئی اور ان کے دیگر ساتھیوں ملک ایوب' سیف اللہ خالد اور محمد عیسٰی کو پاکستان آنے پر گرفتار کر لیا گیا اور 14_14 سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ ہائی جیکروں کے مطالبے پر رہائی پانے والے بہت سے افراد دنیا کے مختلف ممالک میں بے یار و مددگار پھرتے رہے اور بعد میں شرمندگی اور بے عزتی کے احساس کے ساتھ واپس وطن لوٹ آئے۔

تنہائی کے لمحات میں میر مرتضٰی بھٹو کو اپنے ان ساتھیوں کی یاد یقیناً آتی ہو گی جنہوں نے اس کے حکم پر دیوانہ وار جدوجہد کی اور اپنی جان و مال کی قربانیاں دیں۔ مگر ان سب قربانیوں کے نتیجے کو دیکھ کر میر مرتضٰی بھٹو کو یقیناً یہ احساس بھی تنگ کرتا ہو گا کہ آخرکار اسے اس ساری جدوجہد سے حاصل کیا ہوا؟ وہ ایک ایسی بے سود منزل کے حصول کے لئے جدوجہد کیوں کرتا رہا جس تک پہنچنے کے لئے اس نے نہ تو کوئی مناسب منصوبہ بندی کی تھی

اور نہ ہی اسے اس منزل تک پہنچنے کے لئے لائحہ عمل کا مکمل شعور تھا' نہ ہی اس کے پاس اتنے ذرائع تھے کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق کامیابی حاصل کر سکتا۔ وہ محض سراب کے پیچھے بھاگتا رہا اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اس نے اس مقصد کے حصول کے لئے پاکستان کے جانے پہچانے دشمنوں سے بھی مدد حاصل کی اور ان کے ہاتھوں میں کھیلتا رہا۔

ہائی جیکروں کے مطالبے پر پاکستان کی جیلوں سے رہا ہونے والے افراد کی فہرست' مقدمہ اور جرم کی نوعیت درج ذیل ہے :

نام	مقدمہ
ڈاکٹر غلام حسین	لیاقت باغ فائرنگ کیس (مارچ 24)
جاوید حکیم قریشی	//
جاوید حسن شاہ	//
کرنل حبیب خان	//
علی بابا	//
سلطان علی فضل	//
محمد افضل	//
قادر بخش جتوئی	قتل' آتش زنی اور لوٹ مار
محمد حسین	//
رشید الرب	//
طارق چیمہ	//
اکرم قائم خانی	//
محمد ریاض	//
حنیف میمن	//
محمد اشرف	//
سیف اللہ	//
پرویز شنواری	//
فرید انصاری	//
نذر حسین میر	//

محمد خالد شاہ	//
علی حیدر شاہ	//
ارشد اعوان	//
محمد اعظم بٹ	//
فیض بروہی	اسلحہ کی سمگلنگ' آتش زنی' تخریب کاری اور لوٹ مار
سلیم مغل	//
اتفاق بلوچ	//
منظر عالم	//
کامریڈ نیر	//
فضل رحیم راجہ	//
مصباح الدین	//
معین اللہ	//
کامران حیدر	//
ارشد بٹ	تخریب کاری
خاقان مرزا	//
جاوید اختر	//
احسان الحق محسن	//
بشیر احمد	//
منصور احسان	//
سمیع منیر	//
ایس ایچ حسن	//
شاہ محمد شاہ	حکومت کے خلاف پمفلٹ چھاپنے اور تقسیم کرنے کا الزام
رحمت اللہ انجم	//
وہاب صدیقی	//
خلیل قریشی	//
جان عالم	//
الیاس صدیقی	//

اے آر ناصر	//
محمد الیاس	//
سربلند	//
محمد آصف بٹ	//
الطاف عباس	وہشت گردی کی تربیت اور جاسوسی
مظہر علی	//
مسز فرخندہ بخاری	//
منیر احمد وڑائچ	//

ہمیں اس فہرست میں منیر احمد وڑائچ کا نام دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔ ہماری مصدقہ اطلاعات کے مطابق اس کا پی پی پی یا پی ایل اے سے قطعاً" کوئی تعلق نہیں تھا۔ یقیناً یہ فہرست کہیں اور تیار کی گئی تھی۔ وڑائچ جاسوسی ناولوں کے مخصوص ہیرو کے کردار کی طرح تھا۔ وہ خاصا تہذیب یافتہ' پڑھا لکھا' نشست و برخاست کی اعلیٰ روایات کا حامل' عورتوں اور شراب کا رسیا اور ہم جنس پرستی کی خصوصیات کا حامل بھی تھا۔ عورت اور شراب کے مہنگے ذوق' بیوی کی مہنگی شاپنگ کے شوق مگر محدود آمدنی نے اسے جاسوسی کے "کار خیر" کے لئے ایک بہترین امیدوار بنا دیا تھا۔

وہ اپریل 1946ء میں قادیان میں پیدا ہوا۔ اس نے لاہور کے کانونٹ آف جیسس اینڈ میری اور کراچی کے سینٹ ڈینس ہائی سکول اور سینٹ پیٹرک سکول میں تعلیم حاصل کی۔ 1967ء میں اس نے پاکستان نیوی میں کمیشن حاصل کیا۔ 1968ء میں اس کی شادی ہوئی۔ 1974ء میں اسے وزارت خارجہ میں بھیج دیا گیا۔ 1978ء میں اسے فارن آفس سے فارغ کر دیا گیا اور وہ متحدہ امارات کی نیوی میں ملازم ہو گیا۔

دفتر خارجہ میں ملازمت کے دوران مشرقی یورپ کے ایک ملک نے جاسوس کے طور پر اس کی خدمات حاصل کیں اور وہ انہیں اہم معلومات فراہم کرتا رہا۔ ان خفیہ سرگرمیوں کا علم اس وقت ہوا جب وہ وزارت خارجہ چھوڑ چکا تھا۔ اس کی گرفتاری کا کریڈیٹ نیول انٹیلی جنس ڈائریکٹوریٹ کو جاتا ہے جنہوں نے اس پر مکمل نظر رکھی اور 1981ء میں جب وہ تعطیلات گزارنے پاکستان آیا تو اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس کا کورٹ مارشل ہوا اور جرم ثابت ہونے پر اسے 14 سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

وڑائچ نے اپنا ضمیر اور مادر وطن کا سودا محض وہسکی کی چار بوتلوں اور مشرقی یورپ سے

خاص طور پر اس کی خدمت کے لئے درآمد کی گئی ایک بازاری عورت کے عوض کیا۔
فہرست میں وڑانچ کا نام دیکھ کر میں نے یہ محسوس کیا کہ اس کی رہائی کے لئے قادیانیوں نے شاید اسی دن سے کوششیں شروع کر دی تھیں جس روز اسے گرفتار کیا گیا تھا۔ یا پھر وہ جس ملک کے لئے کام کر رہا تھا اس ملک کا بھی میر مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ رابطہ تھا اور وہ مرتضیٰ کے ذریعے وڑانچ کو رہا کروانے میں کامیاب ہو گیا۔



باغی جرنیل

میجر جنرل تجمل حسین کو پاک فوج میں ایک پیشہ ور سپاہی کی حیثیت سے خاصی مقبولیت حاصل تھی۔ انہوں نے فروری 1947ء میں کمیشن لیا اور اپریل 1976ء میں حکومت کے خلاف بغاوت کی منصوبہ بندی کرنے پر انہیں ریٹائر کر دیا گیا۔ جنرل تجمل لاہور کے محاذ پر 1965ء کی جنگ میں نمایاں خدمات انجام دے چکے تھے اور انہوں نے 1971ء میں مشرقی پاکستان کے محاذ پر بھی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ ان دونوں جنگوں میں انہوں نے بڑے ماہرانہ انداز میں قیادت کے فرائض انجام دیئے جس کے لئے انہیں خراج تحسین بھی پیش کیا گیا۔ زمانہ امن میں بھی وہ اپنے ماتحت افسروں اور جوانوں کو معروف رکھنے اور سخت گیری سے پیش آنے میں خاصی شہرت رکھتے تھے اور ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ہر شخص اور ہر بات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' ان کی اس عادت پر انہیں خاموش تنقید کا سامنا بھی رہتا تھا۔ ان کے متعدد ماتحت افسروں نے ان کے بارے میں ان الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا:

"جنرل تجمل کو نہ جانے یہ خوش فہمی کیوں تھی کہ اس ملک میں اور خاص طور پر فوج میں صرف ایک وہ ہی دیانتدار اور سچے ہیں اور باقی سب بددیانت اور جھوٹے ہیں" جنرل تجمل کو اپنی شخصیت کے اس عدم توازن کی وجہ سے خاصے مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا اور یہی وجہ ہے کہ جب انہیں اچانک ریٹائر کیا گیا تو ایک آنکھ بھی ایسی نہ تھی جس میں ان کی جدائی کے غم میں نمی آئی ہو۔

جنرل تجمل کو نہ جانے کیوں یہ خبط ہو گیا تھا کہ اللہ نے انہیں اس ملک میں خلافت راشدہ کا نظام قائم کرنے کے لئے چن لیا ہے اور اب اس قوم کی راہنمائی کرنا ان کا دینی فریضہ ہے۔ ان کے خوابوں کا محل اس وقت چکنا چور ہوا جب وہ ڈویژنل کمانڈر تھے اور اگلے رینک میں ترقی کے لئے انہیں نظرانداز کر دیا گیا۔[1] وہ چونکہ خود کو پاک فوج کا سب سے قابل اور ماہر افسر سمجھتے تھے لہٰذا یہ جھٹکا ان کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ شاید یہی وہ لمحہ تھا جب انہوں نے سوچا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ کمانڈر انچیف کے بجائے سربراہ مملکت

بننے کے لئے منصوبہ بندی کریں۔

انہوں نے فوجی بغاوت کے اس منصوبے کا کچھ حصہ اپنے کرنل سٹاف کرنل اسلم زبیری کو بتایا۔ کرنل زبیری کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ ان کے مرہون منت ہیں اس لئے ان کے وفادار ہیں۔ کرنل زبیری کا تعلق چونکہ سگنلز سے تھا لہٰذا جنرل تجمل نے انہیں کہا کہ آپ ملک کے مواصلاتی نظام کے بارے میں مجھے مکمل معلومات فراہم کریں کیونکہ میری بغاوت کی کامیابی کا انحصار اسی پر ہے۔ اگلے ہی روز کرنل زبیری سیدھا راولپنڈی چلے گئے اور یہ منصوبہ چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق کے گوش گزار کر دیا۔ جنرل تجمل کو فوری طور پر جی ایچ کیو طلب کیا گیا۔ ان کے کیس کی فوری سماعت ہوئی اور انہیں فوج سے ریٹائر کر دیا گیا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد جنرل تجمل لاہور آگئے اور مولانا مودودی سے رابطہ قائم کیا۔ وہ دراصل مولانا مودودی کے اسلامی ریاست کے فلسفے سے متاثر تھے۔ انہوں نے مولانا مودودی سے اسلامی ریاست کا ایک مجوزہ نقشہ بھی حاصل کیا۔ مولانا مودودی کی مجبوری یہ تھی کہ وہ جنرل تجمل کو اپنی سوچ اور سیاسی فکر سے تو آگاہ کر سکتے تھے مگر اس پر عمل کرانے کے لئے ان کے پاس مناسب ذرائع نہ تھے۔ مولانا مودودی بنیادی طور پر ایک مفکر اور مورخ تھے۔ ان کی فکر انقلاب کے بجائے ارتقاء کے فلسفے پر مبنی تھی۔

مولانا مودودی کے در سے مایوس ہونے کے بعد جنرل تجمل نے ریٹائرڈ ائیر مارشل اصغر خان کے دروازے پر دستک دی جن کے بارے میں مشہور تھا کہ بھٹو کے خلاف امریکہ نے انہیں ایک بار منتخب کیا مگر پھر ہاتھ کھینچ لیا۔ ائیر مارشل اصغر خان اس صورتحال کی وجہ سے خود بھی انتہائی بے چینی کی کیفیت میں مبتلا تھے۔ بہرحال 1979ء میں اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد دو سال کا عرصہ پورا ہوتے ہی جنرل تجمل نے ائیر مارشل کی تحریک استقلال میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر لی۔

چند ماہ بعد ہی جنرل تجمل کو اندازہ ہو گیا کہ ائیر مارشل کے تھیلے میں بھی کچھ نہیں اور یہاں بھی ان کی اقتدار حاصل کرنے کی خواہش پوری نہیں ہو سکتی تو انہوں نے تحریک استقلال کو خیرباد کہہ کر اسلامی انقلابی پارٹی کے قیام کا اعلان کیا اور ایک طویل عرصہ تک اس پارٹی کا اکلوتا رکن رہنے کے بعد انہوں نے ہار مان لی۔

آئی ایس آئی کے پاس اس کے علاوہ جنرل تجمل سے متعلق کوئی رپورٹ نہیں تھی۔ فیلڈ سے آنے والی رپورٹوں کے مطابق ان کی سرگرمیاں متعدد سیاسی راہنماؤں کے ساتھ

ملاقاتوں تک محدود تھیں اور بس۔ انہوں نے پاکستان کی تاریخ کو اپنے جذبات کے حوالے سے مرتب کرنے کی کوشش کی لیکن آثار قدیمہ کا حصہ بن گئے۔

تاہم اگر ان کے رویے اور کردار پر گہری نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جوں جوں وقت گزر رہا تھا جنرل تجمل کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ یقیناً ایک اصول پرست انسان تھے مگر ان کے ذہن میں جس انقلاب کا خاکہ تھا اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے نہ تو وہ کسی فعال تنظیم کا کوئی بنیادی ڈھانچہ تیار کر سکے تھے اور نہ ہی ان ذرائع پر ان کی دسترس ہو سکی جن کو استعمال کر کے وہ اپنا خواب پورا کر سکتے۔ نتیجتاً وہ ذہنی انتشار کا شکار رہے۔ انہیں غالباً اس حقیقت کا ادراک نہیں تھا کہ محض خواب دیکھنے سے نہ تو کامیابی حاصل ہو سکتی ہے اور نہ ہی جنگ جیتی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے جن وسائل کی ضرورت ہوتی ہے وہ شاید جنرل تجمل کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔

اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے عوام کو اپنا نقطہ نظر سمجھانے اور انہیں اپنے گرد اکٹھا کرنے کی قابلیت نہ ہونے کی وجہ سے انہیں جس ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اس نے انہیں انتقام کی آگ میں ڈال دیا۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کے شدید ترین مخالف تھے اور انہیں فاشسٹ کہتے تھے۔ انہوں نے جنرل ضیاء کی بھی سخت مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ جنرل ضیاء نے اسلام کے نام پر اقتدار پر قبضہ کیا مگر اسلامی نظام نافذ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ چنانچہ اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ جنرل ضیاء کو بھی طاقت کے ذریعے اقتدار سے الگ کر دیا جائے۔

مارچ 1980ء کی ایک خوشگوار صبح ڈی جی آئی جنرل اختر نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا۔ ان کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ اپنے عمومی انداز میں وہ بولے ”تمہیں معلوم ہے پاکستانی آرمی میں کیا ہو رہا ہے؟ تم اور تمہاری ٹیم بالکل بے خبر ہو۔ تم سب اپنی آنکھیں بند کئے رکھتے ہو۔ آئی ایس آئی کے سفید ہاتھی اور اس میں کام کرنے والے رپورٹروں کی کیا ضرورت ہے اگر ہمیں یہ بھی پتہ نہ چل سکے کہ فوج میں بغاوت ہو رہی ہے۔“

وہ نہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔ اس قسم کی صورتحال سے نمٹنے کا میرا اپنا سٹائل تھا۔ میں نے جنرل اختر کو پورا موقع دیا کہ وہ اپنا غبار نکال لیں۔ میں اس وقت ان کی بمباری کا اکلوتا نشانہ تھا۔ جب ان کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا تو میں نے پوچھا

”بغاوت کی منصوبہ بندی کون کر رہا ہے؟“

”کیا تم جنرل تجمل کو جانتے ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی ہاں! جہاں تک مجھے یاد ہے انہیں بغاوت کے الزام میں فوج سے ریٹائر کر دیا

گیا تھا۔ ہمارے پاس ان کی مکمل فائل ہے" میں نے جواب دیا "وہ فائل فوراً لاؤ" ڈی جی آئی نے حکم دیا۔

میں فائل جنرل اختر کے پاس لے گیا۔ فائل اپنے طور پر مکمل اور اپ ڈیٹ تھی۔ فائل کا مطالعہ کرنے کے بعد جنرل صاحب کا لہجہ بالکل بدل گیا۔

"سنئے! کرنل اشفاق گیلانی نے اطلاع دی ہے کہ جنرل تجمل نے فوجی بغاوت کا پھر منصوبہ بنایا ہے اور وہ اس مقصد کے لئے فوجی افسر بھرتی کر رہا ہے۔ وہ قرآن پاک پر راز رکھنے کا حلف لیتا ہے۔ کرنل گیلانی نے بتایا ہے کہ وہ جی ایچ کیو میں ہونے والی سالانہ کور کمانڈرز کانفرنس کے موقع پر خونی انقلاب کا منصوبہ بنا چکا ہے' جہاں فوج کے تمام اعلیٰ افسروں کو ہلاک کر دیا جائے گا۔ یا پھر 23_ مارچ کو پاکستان ڈے پریڈ کے موقع پر جنرل ضیاء کو مصر کے صدر انوار سادات کے سٹائل میں قتل کیا جا سکتا ہے۔ انوار سادات کے قاتل اسد اسلا مبو علی کی طرح جنرل تجمل کا بیٹا کیپٹن نوید' جنرل ضیاء پر گولیاں برسائے گا۔ جنرل تجمل نے اس منصوبے کی تکمیل کے لئے ایک انقلابی کمانڈ کونسل بھی قائم کر لی ہے جو ملک کا نظام سنبھالے گی۔

گیلانی نے اس منصوبے سے جنرل مجیب الرحمٰن کو آگاہ کیا تھا (جو ان دنوں سیکرٹری انفرمیشن تھے) اور وہ دونوں بھاگم بھاگ ایوان صدر پہنچے اور صدر کے چیف آف سٹاف جنرل کے ایم عارف تک یہ خبر پہنچائی۔ گیلانی کے مطابق جنرل تجمل کا بھتیجا میجر ریاض مری میں ملٹری انٹیلی جنس سکول میں ہے اور ان کا بیٹا کیپٹن نوید ان دنوں راولپنڈی ریس کورس میں بٹالین کے ساتھ پریڈ کے لئے آیا ہوا ہے' میرا بھی خیال ہے کہ پریڈ کے دوران جنرل ضیاء پر قاتلانہ حملہ بھی کیپٹن نوید ہی کرے گا۔ ہماری اطلاع کے مطابق جنرل تجمل ان دنوں ایبٹ آباد میں ہے۔ تم ان تینوں کا پتہ لگاؤ ان پر نظر رکھو اور اگلے احکامات کا انتظار کرو۔"

میں نے اپنے آفس جاتے ہی اپنی پوری ٹیم کو اکٹھا کیا اور انہیں ضروری ہدایات جاری کر دیں۔ چند گھنٹوں میں ہم نے ان تینوں کا پتہ چلا لیا اور ان کی نگرانی شروع کر دی۔ ہم نے حساس مقامات کی نگرانی کا بھی مکمل انتظام کر لیا تاکہ کوئی بھی واقعہ غیر متوقع طور پر رونما نہ ہو سکے۔ اگلے روز ہفتہ وار چھٹی تھی۔

جنرل اختر اور جنرل عارف' جی۔ ایچ۔ کیو میں ڈائریکٹر ملٹری انٹیلی جنس (ڈی ایم آئی) بریگیڈیئر افضل کے دفتر میں آئے۔ اور مجھے بلایا' میں نے ان افسران کو اپنی تمام پوزیشنوں سے آگاہ کر دیا۔ مجھے بتایا گیا کہ جنرل تجمل میجر ریاض اور کیپٹن نوید کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کر

لیا گیا ہے۔

اب یہ ڈی ایم آئی کے لئے کڑا امتحان تھا کہ وہ گرفتاریاں کس طرح کرتے ہیں۔ صورتحال انتہائی پیچیدہ تھی۔ کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ جنرل تجمل نے کس کس کو اپنے ساتھ شامل کیا ہوا ہے۔ کس کس سے قرآن پاک پر حلف لیا ہوا ہے۔ اس میں فوج کے یونٹ بھی شامل ہیں یا نہیں۔ کس پر بھروسہ کیا جائے اور کس کو خطرے کی نگاہ سے پرکھا جائے؟

میں نے انہیں بتایا کہ اس وقت جنرل تجمل سرگودھا کے ملک فدا کے نام پر رجسٹرڈ کار نمبرLEO-28 پر راولپنڈی کی طرف آ رہے ہیں اور مری سے میجر ریاض بھی اپنے دو ساتھی افسروں کے ہمراہ راولپنڈی آ رہا ہے جبکہ کیپٹن نوید اس وقت راولپنڈی ریس کورس گراؤنڈ میں اپنے یونٹ کے ہمراہ ہے اور اپنے خیمے میں موجود ہے۔ ہم جنرل عارف اور بریگیڈیئر افضل کو لحہ بہ لحہ باخبر رکھ رہے تھے۔

ہمارے نگرانی کے عملے نے اطلاع دی کہ میجر ریاض وغیرہ سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی میں ایک گھر میں داخل ہوئے ہیں جس کے دروازے پر عزیزالرحمٰن کے نام کی تختی لگی ہے۔ میں نے فوراً یہ اطلاع ڈی جی آئی کو اور ڈی ایم آئی کو پہنچا دی جو سر جوڑے ان افسروں کی گرفتاری کا منصوبہ بنانے میں مصروف تھے۔

ڈی ایم آئی کا خیال تھا کہ ان کی اطلاع کے مطابق میجر ریاض ہی مرکزی کردار ہے۔ ریاض جسمانی طور پر خاصا صحت مند اور سر پھرا سا نوجوان تھا۔ جو ہر وقت اپنا ذاتی ہتھیار اپنے پاس رکھتا اور کسی بھی غیر متوقع صورتحال میں اسے استعمال کرنے سے بھی گریز نہ کرتا۔ لہٰذا سب سے اہم بات یہ تھی کہ اسے اس ہتھیار کو استعمال کرنے کا موقع دیئے بغیر قابو کر لیا جائے۔ سوال یہ بھی تھا کہ اس کے ساتھ دوسرے دو افسر کون ہیں؟ کیا وہ بھی اس انقلابی ٹیم کا حصہ ہیں؟ کیا وہ بھی مسلح ہیں؟ عزیز الرحمٰن کون ہے؟ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ عزیز کے گھر کو منصوبے کی تکمیل گاہ کی حیثیت حاصل ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس کے پاس بھی اسلحہ ہو۔ ڈی ایم آئی کا خیال تھا کہ ایسے افراد کی گرفتاری کے لئے مروجہ اور عمومی طریقہ اختیار کیا جانا چاہئے اور مزید مہلت دیئے بغیر ان کی گرفتاری کو یقینی بنا لینا چاہئے' چنانچہ انہوں نے فوری طور پر عزیز کے گھر پر چھاپہ مارنے اور اس میں موجود افراد کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ انہوں نے ایک کرنل کو اس ٹاسک فورس کا کمانڈر مقرر کیا اور حکم دیا کہ تم دو انفنٹری پلاٹونوں کو فوری طور پر اس مشن کے لئے تیار کرو جو پوری طرح مسلح ہوں۔

کرنل نے ان دستوں کو پانچ گروپوں میں تقسیم کیا۔

- نگران پارٹی
- گھیرا پارٹی
- چھاپہ مار پارٹی
- گرفتار کرنے والی پارٹی
- تلاشی لینے والی پارٹی

نگران پارٹی کا کام یہ تھا کہ گھر میں آنے جانے والوں پر نظر رکھے۔ چھاپہ مار پارٹی گلی اور ساتھ والے گھروں کی چھتوں پر مورچہ سنبھال لے اور گھر کو پوری طرح اپنے گھیرے میں لے لے۔ چھاپہ مار پارٹی کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اشارہ ملتے ہی اپنے ہتھیاروں کے ساتھ گھر کی دیواریں پھلانگ کر اندر داخل ہو جائے اور شور مچاتے اور فائرنگ کرتے ہوئے اہل خانہ کو ہراساں کرے اور مطلوبہ افراد کو قابو کر لے۔ اس کے بعد گرفتار کرنے والا گروپ اپنا کام کرے اور آخر میں تلاشی لینے والا گروپ گھر بھر کی اچھی طرح تلاشی لے اور نقشے یا کاغذات قبضے میں لے لے۔

جب میں جی ایچ کیو پہنچا تو دیکھا کہ ہتھیار وغیرہ تیار ہو رہے ہیں اور یہ منصوبہ تقریباً مکمل تھا۔ ہمارا کام یہ تھا کہ ان کی عزیز کے گھر تک راہنمائی کریں۔ میں نے جب یہ منصوبہ سنا تو اس کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا' میری ڈی ایم آئی اور ان کے ماتحت افسروں سے خاصی بحث ہوئی۔ میرا موقف تھا کہ اتنی زیادہ فورس استعمال کر کے مشن کے دائرے کو خواہ مخواہ بڑھایا جا رہا ہے جس کی قطعی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اتنی گنجان آبادی میں اتنی تعداد میں اسلحہ اور فوج دیکھ کر افراتفری مچ جائے گی' اس سے صورتحال قابو سے باہر بھی ہو سکتی ہے۔ افواہیں پھیلیں گی۔ ہم دشمن کے علاقے میں تو نہیں جا رہے۔ عزیز کے گھر میں اس کے بال بچے بھی ہوں گے اور ہماری اس کارروائی سے کسی بے گناہ کی جان بھی جا سکتی ہے۔ جہاں تک ہمسایوں کے گھروں کا تعلق ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ فوج کی پوری دو پلاٹونیں دن کی روشنی میں راز داری سے ان گھروں کی چھتوں تک پہنچ جائیں۔ اگر یہ مشن اسی طرح مکمل کیا گیا جیسے ڈی ایم آئی نے منصوبہ بنایا ہے تو ہمیں نہ صرف اپنی قوم بلکہ میڈیا کے سامنے بہت سے سوالوں کے جواب دینا پڑیں گے۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ اگر آپ کا یہی منصوبہ ہے تو پھر آئی ایس آئی اس سے لاتعلق رہے گی۔

جب بحث بہت طویل ہو گئی تو ڈی جی آئی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "آپ سب

رک جائیں اور یہ کام اس پر چھوڑ دیں۔ پھر انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "ترمذی! تم خود جاؤ اور ریاض کو گرفتار کر کے لے آؤ۔" ڈی جی آئی کے اس حکم میں طنز کی بجائے آئی ایس آئی اور مجھ پر اعتماد کا اظہار تھا۔ انہیں یقین تھا کہ ہم یہ مشن باآسانی مکمل کر سکتے ہیں۔ ڈی ایم آئی کا چہرہ بھی کھل اٹھا۔ ان کے سر سے بوجھ اتر گیا کیونکہ اب یہ چیلنج براہ راست میں نے قبول کر لیا تھا۔ کمرہ چھوڑتے وقت میں نے محسوس کیا کہ ڈی جی آئی کا فیصلہ ان کے اعتماد اور محبت کا غماز تھا۔ انہیں اس بات کا خیال بھی ہو گا کہ یہ انتہائی خطرناک مشن ہے اور آئی ایس آئی کی ذمہ داری بھی نہیں ہے۔ ہمارے پاس ایسے چھاپوں کے لئے ضروری ساز و سامان اور افرادی قوت بھی نہیں ہے اور اس سے قبل ایسا کوئی مشن آئی ایس آئی نے مکمل بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈی جی یہ بھی جانتے تھے کہ میں اگلے محاذ پر لڑنے والا سپاہی ہوں اور خوف کبھی میری راہ میں حائل نہیں ہوا۔ انہوں نے مجھ سے صرف اتنا کہا:

"ہتھیار لے لو اور دو مضبوط آدمی بھی ساتھ لے جاؤ۔ ریاض ایک خطرناک اور وحشی کردار ہے۔ میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتا ہوں"۔

صورتحال ایسی تھی کہ کسی نے بھی مجھ سے میرے لائحہ عمل کے بارے میں جاننے کی زحمت تک گوارہ نہ کی۔ میں جی ایچ کیو سے سیدھا راولپنڈی میں اپنی کمانڈ پوسٹ پر پہنچا۔ جلد ہی اپنی ٹیم کو بریفنگ دی۔ میرے احکامات یہ تھے:

"ہمیں میجر ریاض کو گرفتار کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اس کے لئے ہمیں یہ طریقہ کار اختیار کرنا ہو گا۔ ہمارے پاس کل تین کاریں ہوں گی۔ میں اپنی کار میں تنہا جاؤں گا۔ باقی دونوں کاریں جن میں ایک آفیسر اور ایک جونیئر کمیشنڈ آفیسر ہو گا اس طرح میرے پیچھے آئیں گی کہ میری کار ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہو تاہم دو اور کاریں کسی بھی غیر متوقع صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے یونٹ لائنز میں کھڑی رہیں گی۔ ہر ساتھی کے پاس ذاتی ہتھیار ہو گا۔ تمام کاروں میں خفیہ وائرلیس ہوں گے۔ وائرلیس سیٹ پر اس وقت تک مکمل "خاموشی" رہے گی' جب تک میں خود یا میرے سیکنڈ ان کمانڈ افسر اس کو نہ توڑیں۔ اور وہ کار جو پہلے ہی سے اس علاقے میں معمول کی نگرانی پر ہے وہ وہیں رہے گی۔"

روانگی سے قبل میں نے اپنے سیکنڈ ان کمانڈ کو ہدایت دی:

"خود کو اتنے فاصلے پر رکھنا کہ مجھے دیکھ سکو۔ اس بات کی پرواہ نہ کرنا کہ میں ریاض کو کب اور کیسے گرفتار کرتا ہوں۔ اگر تم دیکھو کہ ریاض نے مجھے گولی مار دی ہے تو آگے بڑھنا

اور ہتھیار صرف اس صورت میں استعمال کرنا جب اس کے استعمال کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔ بصورت دیگر مجھے بالکل ڈسٹرب نہ کرنا۔"

میں نے بسم اللہ پڑھ کر گاڑی سٹارٹ کی اور ہم ۔۔ ٹاؤن کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں اس علاقے سے اچھی طرح واقف تھا۔

وہاں پہنچ کر انکشاف ہوا کہ جس گلی میں عزیز کا گھر تھا وہ ایک طرف سے بند تھی۔ میں اپنی گاڑی لے کر گلی کے بند حصے کی طرف چلا گیا اور دوسری دونوں گاڑیوں کو گلی کی دوسری جانب اس طرح کھڑا کر دیا گیا کہ اس میں سوار میرے ساتھی مجھے بخوبی دیکھ سکیں۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ اس وقت کا انتظار کیا جائے جب ریاض اور اس کے ساتھی گھر سے باہر نکلیں' پھر آسانی سے ان کی کار کو اپنی کاروں کے درمیان میں لے کر چلتے رہیں اور کسی مناسب جگہ پر کاریں روک کر اسے گرفتار کر لیں۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ میں عزیز کے گھر کے اندر چلا جاؤں اور انہیں یہ کہہ کر گرفتار کر لوں کہ تمہیں ہر طرف سے گھیرے میں لیا جا چکا ہے اور اب تمہارے لئے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

میں ابھی مختلف ترکیبوں پر غور ہی کر رہا تھا کہ ریاض اور اس کے ساتھ آنے والا ایک افسر باہر نکلے۔ دونوں نے آپس میں الوداعی ہاتھ ملایا اور وہ افسر اسی کار میں بیٹھ کر چلا گیا جس میں یہ لوگ مری سے آئے تھے۔ میں نے فوری طور پر اپنی ریزرو گاڑی کو اس کار کا پیچھا کرنے کا حکم دیا۔ ہماری گاڑی نے رات تک اس کار کا پیچھا کیا اور جب یہ یقین ہو گیا کہ اس افسر کا اس کھیل سے کوئی تعلق نہیں ہے تو اسے جانے دیا گیا حالانکہ اسے گرفتار کرنا انتہائی آسان تھا مگر ابھی وہ ہمارا مطلوبہ ٹارگٹ نہیں تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میجر ریاض اور اس کا دوسرا ساتھی باہر نکلے۔ اس نے بھی ریاض سے ہاتھ ملایا اور پھر مری روڈ کی طرف پیدل چلنا شروع کر دیا۔ ہماری نگران ٹیم اس پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ وہ اسلام آباد جانے والی ایک بس میں سوار ہوا اور ٹیم نے اسلام آباد میں اسے اپنے گھر میں داخل ہونے تک اس کی نگرانی کی' اس کا پتہ وغیرہ بھی نوٹ کر لیا تاکہ اگر ضرورت پڑے تو اسے بعد میں گرفتار کر لیا جائے۔

اب گھر میں غالباً ریاض اور عزیز ہی موجود تھے۔ اب میرے لئے یہ ممکن ہو گیا تھا کہ میں کسی کے نوٹس میں آئے بغیر عزیز کے گھر میں داخل ہو جاؤں اور وہاں سے ریاض کو گرفتار کر کے لے آؤں۔ اگر عزیز بھی اس منصوبے میں شامل ہو اور وہ مزاحمت کرنے کی کوشش کرے تو اسے بھی گرفتار کیا جا سکتا تھا۔

میں اپنے ساتھیوں کو حکم دینے ہی والا تھا کہ میں عزیز کے گھر داخل ہو رہا ہوں اور تم بھی تیزی سے میرے پیچھے آ جاؤ' مگر میں نے جونہی اپنی گاڑی آگے بڑھائی عزیز کے گھر کا دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ میں نے فوراً بریک لگائی۔ گاڑی روکی اور وائرلیس سیٹ بند کر دیا۔ اس مرتبہ عزیز اور ریاض باہر نکلے۔ انہوں نے بھی الوداعی مصافحہ کیا۔ عزیز گھر کے اندر چلا گیا اور ریاض نے مری روڈ کی طرف پیدل چلنا شروع کر دیا۔ میں نے اسے فوری طور پر گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اس وقت گلی سنسان تھی۔ میں ابھی اس سے تقریباً دس گز کے فاصلے پر تھا کہ یکایک تیز بارش شروع ہو گئی۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی مدد ہے' (یقین کیجئے میں نے اپنی چھوٹی چھوٹی مہمات اور فوجی ملازمت کے دوران بہت مرتبہ اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد آتے دیکھی ہے۔) ریاض نے اپنا سر جھکایا کندھے سکیڑے اور کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے قریب جا کر گاڑی روکی' دروازہ کھولا اور اسے لفٹ آفر کی۔ وہ کود کر گاڑی میں آ بیٹھا اور میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہنے لگا "آپ اس وقت فرشتہ بن کر نازل ہوئے ہیں۔"

ہم آپس میں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ میں اطمینان سے گاڑی چلاتا رہا۔ ہم رسمی سی گفتگو کر رہے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کس گاڑی میں بیٹھا ہے اور اس کی اگلی منزل کونسی ہے۔ بظاہر میں اس سے باتیں کر رہا تھا مگر میرا ذہن اس وقت اس کشمکش میں تھا کہ میں اس کو کس طرح قابو کروں۔ وہ میرے ساتھ تو تھا مگر ایکشن ابھی باقی تھا۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ صورتحال یہ رخ اختیار کرے گی۔ میں لمحہ لمحہ گن رہا تھا۔ میں نے خود کو انتہائی پرسکون رکھا اور میرے ساتھی آخری معرکہ سر کرنے کے لئے میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ وہ اپنی آنکھیں اور کان کھولے ہوئے تھے۔ انہیں ریاض کے پستول کی اس گولی کی آواز کا انتظار تھا جو وہ مجھ پر فائر کر سکتا تھا یا ان کی نگاہیں اس منظر کی منتظر تھیں کہ ریاض اپنا پستول میری پسلیوں پر رکھے اور مجھے ہائی جیک کر لے۔

ہم جونہی سیٹلائٹ ٹاؤن سے باہر نکلے میں نے اپنی گاڑی صدر کی طرف موڑ دی۔ میں نے ریاض سے پوچھا کہ "آپ کہاں جانا پسند کریں گے۔ اس نے کہا "اگر آپ مجھے ویسٹرج ڈراپ کر دیں تو بڑا احسان ہو گا کیونکہ اس قدر شدید بارش میں ٹیکسی کا حصول تقریباً ناممکن ہے۔" یہ درخواست میرے منصوبے کی تکمیل کے لئے سو فیصد کارگر تھی۔ میں نے کہا "مجھے ویسٹرج ہی جانا ہے مگر راستے میں ایک دوست کو ایک پیغام دینے کے لئے چند لمحے رکوں گا" اس نے فوراً رضامندی کا اظہار کر دیا۔ ایک تو اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں

تھا اور دوسرے اب ہم "دوست" بن چکے تھے۔

بارش کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا اور اندھیرا بھی بڑھ رہا تھا۔ مال روڈ پر چلتے ہوئے میں نے گاڑی کا رخ اپنے پنڈی آفس کی طرف موڑ دیا۔ جونہی ہم دفتر کے قریب پہنچے گارڈ نے میری گاڑی کو پہچانتے ہی دروازہ کھول دیا۔ میری گاڑی کے اندر داخل ہوتے ہی پیچھے آنے والی دونوں گاڑیاں بھی اندر آگئیں۔ میں نے اپنے مخصوص انداز میں ہارن بجایا اور سب اپنی اپنی جگہ مستعد ہو گئے۔ ریاض کے چہرے پر چھائی ہوئی حیرت دیدنی تھی' جنگل کے اس شیر کی بے بسی کی طرح جو اچانک خود کو پنجرے میں پائے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور اس نے دل ہی دل میں تسلیم کر لیا کہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔ ہم دونوں کے ہونٹوں پر خاموشی تھی۔ میرے ایک ماتحت افسر نے کار کا دروازہ کھولا۔ ریاض گاڑی سے باہر نکلا اور خاموشی سے اس افسر کے پیچھے چل دیا۔ میں بھی ان کے ساتھ دفتر میں چلا گیا۔ میں نے ملازم کو چائے لانے کو کہا اور ہم سب خاموشی سے چائے پینے لگے۔ پنڈی آفس کے کمانڈر' کرنل خلیق نے مجھ سے چٹ پر لکھ کر پوچھا کہ ریاض کی تلاشی لی جائے یا نہیں۔ میں نے چٹ پر لکھ کر جواب دیا کہ میرے خیال میں ریاض کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے اور فرض کر لیا جائے کہ وہ مسلح بھی ہے تو اس حالت میں اس میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ وہ یہ ہتھیار استعمال کر سکے۔ ہم اسے پوری عزت اور احترام دیں گے تاہم میں نے اس سے کہا "ریاض آپ کے پاس ہتھیار ہے تو دے دیجئے" اس نے جواب دیا' "سر میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں" میں نے اس پر یقین کر لیا اور اس کی تلاشی نہ لی۔

شہر کا موسم ابھی تک ابر آلود تھا اور وقفوں وقفوں سے بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ ہم نے ریاض کو جی ایچ کیو میں ملٹری انٹیلی جنس کے ڈائریکٹوریٹ کے حوالے کر دیا۔ ڈائریکٹر جنرل انٹیلی جنس اور صدر پاکستان کو اس مشن کی کامیابی کی خبر دے دی گئی جو بہرحال ان کے لئے اطمینان اور سکون کا باعث تھی' مگر لطف کی بات یہ ہے کہ آج تک کسی متعلقہ افسر نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے ریاض کو کیسے گرفتار کیا۔ جس کی گرفتاری کے لئے فوج کی دو پلٹونیں ترتیب دی جا رہی تھیں اور جس کو گرفتار کرنا تمام حساس اداروں کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بنا ہوا تھا' اس کی گرفتاری کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی' نہ شور' نہ ہنگامہ' نہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ' یہ سب کیسے ہوا؟ جنرل اختر نے اس لئے نہ پوچھا کہ وہ اپنی ٹیم سے مشن فیل ہونے کی خبر سننے کے عادی ہی نہیں تھے۔ انہیں ٹیم پر پورا اعتماد تھا۔

تاہم ریاض کو منزل مقصود تک پہنچانے کے بعد میں کنٹرول روم میں گیا تاکہ دوسرے

مشتبہ افراد کی نقل و حرکت کے بارے میں تازہ ترین معلومات حاصل کر سکوں۔

ہمارے "ہیرو" جنرل تجمل ابھی تک جی ٹی روڈ پر ہی سفر کر رہے تھے۔ میں نے ڈی جی آئی کو ریاض کی گرفتاری اور جنرل تجمل کی پوزیشن کے بارے میں مطلع کرتے ہوئے پوچھا کہ ڈی ایم آئی والے جنرل تجمل اور دیگر لوگوں کو کب اور کہاں گرفتار کریں گے۔ کیونکہ مرکزی اور خطرناک ترین کردار' ریاض کی گرفتاری نے اب اس کام کو آسان بنا دیا تھا۔

"ویل ڈن! ترمذی اب یہ فیصلہ ہوا ہے اور صدر صاحب یہ چاہتے ہیں کہ جنرل تجمل اور ان کے بیٹے کو بھی تم یعنی آئی ایس آئی ہی گرفتار کرے گی' ہم اس کے لئے ایم آئی کو زحمت نہیں دینا چاہتے۔"

میں نے فوراً جنرل تجمل کو گرفتار کرنے سے متعلق منصوبہ بنانا شروع کر دیا۔ ہماری نگران ٹیم نے رپورٹ دی کہ جنرل تجمل کی کار اسلام آباد میں انٹیلی جنس بیورو کے کرنل ٹی۔ ڈی۔ کے غازی کے گھر داخل ہوئی مگر صرف ایک منٹ رک کر اس کے دوسرے دروازے سے باہر نکل گئی ہے۔ گاڑی کی نگرانی جاری تھی۔ اس کے بعد ملنے والی رپورٹ کچھ اس طرح تھی کہ اب کار نمبر LEO-28 جو فدا کے نام پر رجسٹرڈ تھی آئی ایس آئی کے ایک آفیسر کے گھر میں داخل ہو گئی ہے جو سرگودھا میں فرائض انجام دے چکا ہے اور فدا کا جاننے والا ہے۔ ہمارے لئے یہ بہت حیرت کی بات تھی کہ اس گھر میں فدا اور اس کی کار تو موجود تھے مگر جنرل تجمل موجود نہیں تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فدا' جنرل تجمل کو کرنل غازی کے گھر ڈراپ کر کے اگلے لمحے دوسرے گیٹ سے باہر نکل گیا تھا۔

میں کرنل غازی کو اچھی طرح جانتا تھا' چنانچہ اگلے چند لمحوں میں' میں غازی کے گھر کے دروازے کی گھنٹی بجا رہا تھا' گھنٹی کی آواز سن کر کرنل غازی خود باہر نکلے' بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ مگر جنرل تجمل وہاں بھی نہیں تھے۔ یہ صورتحال میری بے چینی میں اضافہ کرنے کے لئے کافی تھی' میں نے کرنل غازی سے پوچھ ہی لیا کہ "کیا جنرل تجمل تو آپ کے ہاں نہیں آئے۔" "نہیں" انہوں نے جواب دیا" دراصل وہ اپنی جیپ یہاں چھوڑ کر کسی دوست کی کار میں چلے گئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے وہ یہاں آئے تھے مگر مجھے ملے بغیر اپنی جیپ لے کر چلے گئے ہیں' بارش بھی تو بڑے زوروں سے ہو رہی ہے۔" میں نے جلدی سے کرنل غازی سے اجازت لی اور ہیں کی طرف چل پڑا۔

جنرل تجمل کو ہماری نظروں سے اوجھل ہوئے آدھ گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔

ہماری نگران ٹیم LEO-28 کا پیچھا کرتی رہی اور وہ جیپ میں نکل گئے تھے۔ بارش ابھی تک جاری تھی اور اب اندھیرا بھی گہرا ہو چکا تھا۔ اس قسم کے مشن پر کم سے کم تین کاریں استعمال کی جاتی ہیں مگر ہمارے پاس صرف ایک ہی کار تھی' تاہم ہمارے عملے نے ابھی تک شکست نہیں کھائی تھی اور ان نامساعد حالات اور کم وسائل کے باوجود اپنا مشن جاری رکھے ہوئے تھا۔ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ جنرل تجمل کو اس بات کی خبر نہیں ہے کہ گزشتہ دو روز سے ان کی مسلسل نگرانی کی جا رہی ہے۔ کیونکہ اگر وہ اس سے باخبر ہوتے تو ان کا ردعمل قطعی مختلف ہوتا۔ اب اس مشن کا سب سے مشکل مرحلہ درپیش تھا۔ ہمیں ڈی جی آئی کو ہر حال میں یہ اطلاع دینا تھی کہ جنرل تجمل فی الحال بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں' مجھے علم تھا کہ یہ خبر سن کر جنرل اختر عبدالرحمٰن کا ردعمل کیا ہو گا' لیکن انہیں بہرحال خبر کرنا لازم تھا' ایسے موقعوں پر ان کا رویہ انتہائی بے رحم ہوتا تھا۔ میں جنرل اختر کو اس کا الزام نہیں دیتا کیونکہ وہ اپنے طور پر صدر کو یہ بتانے کے لئے تیار بیٹھے تھے کہ جنرل تجمل کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اور ادھر ہم ان کو یہ خبر دینے والے تھے کہ جنرل تجمل کا کہیں کوئی نشان نہیں مل رہا۔ بہرحال میں نے فون پر ان کو بتایا کہ ٹارگٹ ہم سے مس ہو گیا ہے۔ ان کا ردعمل میری توقع سے بھی کچھ زیادہ ہی تھا' اور وہ اپنے ریمارکس میں ہماری ساری مشقت اور پہلی کامیابی کو بھی بھول گئے۔ برا بھلا کہنا تو ایک طرف انہوں نے نگرانی پر مامور افسر کو گرفتار کرنے اور اس کے خلاف انکوائری کا حکم دینے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ کی۔

"کیپٹن .... کو انڈر اریسٹ کیجئے اور کل صبح میں اس کو اس کی نااہلی کی سزا خود دوں گا۔ میں جنرل ضیاء کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ مجھے فوراً جنرل تجمل چاہئے اور بس' تم اسے کہیں سے بھی لاؤ۔ یہ تمہارا کام ہے۔"

"یس سر! آپ کے حکم کی تعمیل ہو گی مگر پہلے میرے اگلے قدم کے بارے میں سن لیجئے۔ میرے خیال میں جنرل تجمل اپنے گاؤں جا سکتے ہیں یا لاہور میں اپنے گھر جا سکتے ہیں یا ریس کورس گراؤنڈ پنڈی میں اپنے بیٹے کے پاس جا سکتے ہیں جو اپنی یونٹ کے ساتھ وہاں موجود ہے۔ میں نے ان تمام مقامات کو مکمل طور پر کور کر لیا ہے۔ جنرل تجمل آج رات انشاء اللہ ہمارے مہمان ہوں گے۔ انہوں نے نہ جانے میری بات کس حوصلے سے سنی' ابھی میرا آخری جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک بار پھر برس پڑے۔

"میں نہیں جانتا تم کیا کرتے ہو مجھے صبح تک جنرل تجمل جی ایچ کیو میں چاہئے۔"

جنرل تجمل کے غائب ہو جانے کی خبر ڈی ایم آئی کو بھی ملی۔ انہوں نے فوراً ہماری نا

اہل سے متعلق چہ مگوئیاں شروع کر دیں اور دل ہی دل میں خوش بھی ہوئے کہ آئی ایس آئی پھنس گئی۔ میرے ماتحت اپنا کام نیک نیتی سے انجام دے رہے تھے اور مجھے یقین تھا کہ ہم جنرل تجمل کو جلد گرفتار کر لیں گے۔

میں نے اگلا لائحہ عمل تیار کیا اور مناسب احکامات دینا شروع کر دیئے۔ وہ افسر جس نے جنرل تجمل کو گنوا دیا تھا وہ بھی میری اور جنرل اختر عبدالرحمٰن کی گفتگو سن چکا تھا۔ سب سے پہلے میں اسی سے مخاطب ہوا "ویل ڈن' تم نے واقعی بڑی محنت کی ہے' ٹارگٹ کا گم ہونا معمولی بات ہم اسے ڈھونڈ لیں گے۔ گھبراؤ مت۔ نہ تو تم زیر حراست ہو اور نہ تمہارے خلاف کوئی انکوائری ہو گی۔ ڈی جی ائی کو میں خود سنبھال لوں گا۔" میرے ان الفاظ نے اس کے چہرے کا رنگ تبدیل کر دیا۔

میں نے فوری طور پر اپنے لاہور ڈی ٹیچمنٹ کمانڈر سے بات کی اور ان سے کہا کہ آپ کو جنرل تجمل کو گرفتار کرنا ہے۔ آپ فورا ان کے گھر جائیں۔ آئی ایس آئی کا کارڈ دکھا کر اپنی شناخت کروائیں اور انتہائی احترام سے انہیں حراست میں لے کر اپنے کیمپ لے جائیں اور پھر مجھے رپورٹ کریں۔ اسی طرح کے احکامات کے ساتھ ایک ٹیم کو جنرل تجمل کے گاؤں روانہ کر دیا گیا۔ اور ایک تیسری ٹیم ان کے بیٹے کیپٹن نوید کو گرفتار کرنے کے لئے روانہ کر دی گئی۔ یہ احتمال بھی تھا کہ جنرل تجمل بھی اپنے بیٹے کے پاس ہوں چنانچہ انہیں بھی واضح ہدایت دی گئی کہ ایسی صورت میں باپ بیٹے دونوں کو گرفتار کر لیا جائے۔

تقریباً آدھی رات کے وقت ہمیں لاہور سے اطلاع ملی کہ جنرل تجمل راوی کا پل پار کر کے لاہور میں داخل ہو رہے ہیں۔ جونہی وہ اپنے گھر پہنچے ہماری ٹیم نے ویسے ہی کیا جیسے کہ انہیں ہدایت دی گئی تھی۔ جنرل تجمل نے ان کے ساتھ بحث مباحثہ کرنے کی کوشش کی' کچھ آوازیں بھی بلند ہوئیں۔ ملازموں کے کوارٹروں سے کسی نے فائر بھی کیا مگر اس وقت تک ہمارے لوگ جنرل کو گاڑی میں ڈال کر ان کے گھر کا گیٹ پار کر چکے تھے۔ پہلے انہیں لاہور کیمپ آفس لے جایا گیا اور پھر راولپنڈی منتقل کر دیا گیا۔ اس سارے سفر کے دوران میں وہ سخت قسم کی حیرت کا شکار رہے اور ایک لفظ بھی نہ بولے۔

جنرل اختر کو اطلاع دی کہ جنرل تجمل ہمارے مہمان ہیں اور گاڑی ان کو لے کر لاہور سے چل پڑی ہے' صبح تک انشاء اللہ وہ جی ایچ کیو میں ہوں گے' کیپٹن نوید کو گرفتار کرنے میں قطعی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ اپنے خیمے میں موجود تھا اور بارش سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

ہم ایک گولی چلائے بغیر اپنا سارا مشن مکمل کر چکے تھے۔

ڈی ایم آئی کی ایک ٹیم نے جنرل تجمل اور ان کے ساتھیوں سے مکمل پوچھ گچھ کی' سب نے جو کیا تھا اس کا اعتراف کر لیا' جنرل تجمل نے بھی کہانی کاغذ پر لکھ دی' اور ان سب کو مختلف معیاد کی سزائیں سنائی گئیں۔

ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ ڈی ایم آئی اور ان کے کئی دیگر ساتھی افسران کو اس "بہادری" پر کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ جہاں تک میرا اور آئی ایس آئی کے دیگر افسروں کا تعلق تھا جو اس مشن کی تکمیل کے لئے اپنی جانیں ہتھیلی پر لئے پھرتے رہے ان کے حصے میں صرف ایک تھپکی' چند جھاڑیں اور اگلے مشن کے احکامات آئے۔

آئی ایس آئی کے لئے ہر صبح کا سورج نئے مسائل' نئے چیلنج اور نئی مشکلات لے کر آتا ہے۔ یا شاید آئی ایس آئی میں دن اور رات میں کوئی فرق نہیں' مسلسل ایک ہنگامہ رہتا ہے۔



شرمندگی

"اے ایمان والو اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو' (ایسا نہ ہو کہ) کسی قوم کو نادانی سے نقصان پہنچاؤ' پھر اپنے کئے پر نادم ہو۔"

(سورہ الحجرات آیت 6 : 49)

کہتے ہیں انسان خطا کا پتلا ہے۔ بعض اوقات انجانے میں اس سے ایسی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں جن کی تلافی وہ عمر بھر نہیں کر سکتا۔ ایک واقعہ ایسا ہے جس کا مجھے دکھ رہے گا۔ ہماری ایک چھوٹی سی بھول کہہ لیں یا جھوٹی خبر پر اعتماد کرنے کی وجہ کہہ لیں بہرحال ہم نے بعض بے گناہ لوگوں کو نقصان پہنچایا' اسی لئے میں اس واقعہ کو آپریشن "شرمندگی" کہوں گا۔ خدا ہماری یہ خطا معاف کر دے۔

یہ اوائل جولائی 1980ء کا واقعہ ہے۔ صدر نے ڈی جی آئی جنرل اختر عبدالرحمٰن کو ایک ہنگامی میٹنگ کے لئے بلایا۔ اس خصوصی میٹنگ سے واپس آتے ہی انہوں نے مجھے اپنے آفس میں طلب کر لیا۔ یہ ایک معمول کی طلبی تھی مگر مجھے ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی حالت دیکھ کر حیرت ہوئی۔ کمرے کا ائیرکنڈیشن پوری قوت سے چل رہا تھا مگر جنرل صاحب کا چہرہ سرخ تھا اور وہ پسینے میں شرابور تھے۔ ان کی حالت سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ کہیں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔

ہمیں پہلے ہی جنرل اختر کے سخت رویے کا تجربہ تھا مگر آج انہوں نے جب لب کشائی کی تو یوں لگ رہا تھا کہ صدر ضیاء نے انہیں ہم سب کو نوکری سے برخاست کر دینے کا حکم سنایا ہے اور آئی ایس آئی کے دفاتر پر تالے لگائے جانے والے ہیں۔ بغیر تمہید کے وہ یوں گویا ہوئے :

"یہ ہمارے لئے انتہائی شرم کی بات ہے کہ دشمن ہمارے اندر گھس کر ہمارے لوگوں کو قتل کر رہا ہو اور ہمیں اس کا قطعی علم نہ ہو۔ میں تم سب کے خلاف سخت کارروائی کرنے والا ہوں۔ تم سب سو رہے ہو یا بے معنی اور بے مقصد کاموں میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ صدر نے مجھ کو یہ طعنہ دیا ہے کہ ہمیں کام کرنا ہی

نہیں آتا۔" جنرل اختر عبدالرحمٰن اپنے مخصوص لاہوری اور امرتسری لہجے میں اپنی کمان کے سارے تیر پے در پے مجھ پر برسا رہے تھے۔ اور میں خاموش کھڑا سن رہا تھا' مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ماجرہ کیا ہے' میں دل میں سوچ رہا تھا "یااللہ ہم سے کہاں کوتاہی ہوئی" بہرحال اصل مسئلے پر روشنی ڈالے بغیر انہوں نے اپنی بمباری جاری رکھتے ہوئے کہا "ایئر فورس نے سی۔ 130 کا بندوبست کیا ہے۔ ہم ابھی کراچی جائیں گے۔ فوراً جا کر ڈائریکٹر ایئر انٹیلی جنس (ڈی اے آئی) سے رابطہ کرو اور اس سے پرواز کا وقت معلوم کرو۔"

ان کے اس حکم سے مجھے صرف اتنا اندازہ ہو سکا کہ پی اے ایف کراچی میں گڑبڑ ہے' مگر ہمارے کراچی آفس نے ہمیں اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ شاید وہ بھی میری طرح معاملے کی نوعیت سے بے خبر تھے۔ ڈی جی آئی کے کمرے سے باہر آتے ہی میں نے پہلے کراچی میں اپنے آفس سے معلوم کیا کہ معاملہ کیا ہے جس کی صدر صاحب کو خبر مل گئی ہے مگر ہم سب بے خبر ہیں۔ حسب توقع وہ بھی لاعلم تھے۔ اس کے بعد میں نے ڈی اے آئی ایئر کموڈور زمان سے پرواز کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ ہم گیارہ بجے روانہ ہوں گے۔ میرے استفسار پر انہوں نے صرف اتنا کہا کہ کراچی ایئر فورس بیس پر کچھ گڑبڑ ہے' مگر میں فون پر اس کی تفصیلات نہیں بتا سکتا۔ میں نے ڈی جی آئی کو پرواز کا وقت بتایا اور خود فوراً چک لالہ ایئر بیس کے لئے روانہ ہو گیا۔ دراصل میں روانگی سے قبل ڈی اے آئی سے معاملے کی سنگینی کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ پی اے ایف فیلڈ انٹیلی جنس یونٹ کراچی نے اپنے بیس پر ایک بھارتی ایجنٹ کو پکڑا ہے۔ جس نے ابتدائی تفتیش کے دوران بتایا ہے کہ کراچی میں بھارت کا ایک پورا نیٹ ورک کام کر رہا ہے۔ دشمن کے ان ایجنٹوں نے جاسوسی کرنے کے علاوہ مسلح افواج کے کچھ جوانوں کو ہلاک بھی کیا ہے۔ اس نیٹ ورک کا سربراہ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کراچی کا فوڈ منیجر ہے اور ایئر فورس کے بہت سے حاضر سروس افسر بھاری معاوضوں پر اس کے لئے کام کر رہے ہیں۔ یہ سب معلومات ایئر مارشل انور شمیم نے صدر کو دی ہیں۔

میں نے یہ سب سننے کے بعد کہا "زمان صاحب! ہمارا آپس میں قریبی رابطہ ہے' آپ نے ہمیں یہ اطلاع پہلے کیوں نہیں دی تاکہ ہم بھی اپنے ذرائع سے کچھ معلومات حاصل کر لیتے۔؟"

"مجبور تھا" زمان نے جواب دیا' "دراصل میں یہ اطلاع آپ تک پہنچانا چاہتا تھا مگر میرے چیف نے مجھے آئی ایس آئی کو لاتعلق رکھنے اور اپنے طور پر اس معاملے سے نمٹنے کو کہا تھا۔

"آپ کو پتہ ہے' صدر صاحب نے اب یہ کیس ہمیں دے دیا ہے" میں بولا "ٹھیک ہے اگر یہی اشکالات ہیں تو پھر ہم مل کر اسے حل کرتے ہیں" زمان نے خوش ہو کر کہا۔

"مگر کیا آپ نے ایجنٹ سے پوچھ گچھ کی ہے یا صرف آفیسر کمانڈنگ ہی سے معلومات حاصل کی ہیں" میں نے پوچھا۔

"نہیں! میں نے ایجنٹ سے پوچھ گچھ نہیں کی' مگر میں نے اس کی تفصیلی بریفنگ رپورٹ حاصل کر لی ہے" زمان نے بتایا۔

"کیا آپ کو اپنے کسی یونٹ سے کسی فرد کی پراسرار گمشدگی کی اطلاعات بھی ملی ہیں؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"ہاں! کچھ لوگ غیر حاضر ضرور ہیں مگر ہمیں کسی کے قتل کی اطلاع نہیں ملی۔" زمان بولا۔

"کیا وہاں کچھ بے نام قبریں بھی ہیں؟ کیا کسی نے ایجنٹ کی اطلاع پر اپنے طور پر کوئی تفتیش کی ہے۔" زمان سے میرا اگلا سوال تھا۔

"نہیں! ہم نے ایسی کوئی تفتیش نہیں کی۔ کیونکہ چیف کا خیال تھا کہ چونکہ یہ معاملہ انتہائی سیریس اور گھمبیر ہے اس لئے اس کی اطلاع فوراً صدر صاحب کو کر دینی چاہئے۔"

زمان سے میں نے کہا۔ "زمان صاحب آپ ایک سینئر اور تجربہ کار آفیسر ہیں۔ آپ کو معلوم ہے صدر صاحب خود تو تفتیش نہیں کرتے۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے اس لئے آپ کو اس کیس کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد اپنے چیف کو رپورٹ کرنا چاہئے تھا۔ مجھے نہ جانے ان تمام حالات میں حقائق کیوں کم کم دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنے سنگین معاملے کا علم ہمیں کسی ذریعے سے بھی نہ ہوا ہو؟"

میری ان باتوں سے ڈی اے آئی کے چہرے کا رنگ کچھ بدل گیا۔ وہ بھی میری اس بات کو سمجھ رہے تھے کہ یہ فائر اندھیرے میں کیا گیا ہے۔ اس اثناء میں ڈی جی آئی تشریف لے آئے اور ہم سی۔ 130 میں سوار ہو گئے۔

سی۔ 130 ایسا مسافر بردار طیارہ ہے جس کا شور اس قدر ہوتا ہے کہ بات بہت اونچی آواز میں کرنی پڑتی ہے' لیکن پرواز کے دوران ہم سب خاموش تھے' بہرحال کراچی پہنچتے ہی ڈی جی آئی نے ڈی اے ای کو حکم دیا کہ وہ ہمیں بریف کریں۔ او سی فیلڈ بھی وہاں موجود تھے۔ ڈی اے آئی نے ایک بار پھر وہ سب کچھ دہرا دیا جو وہ مجھے چک لالہ میں بتا چکے تھے۔ اس کے بعد او سی نے بعض تفصیلات بتانی شروع کیں۔ انہوں نے کراچی میں ہونے والی جاسوسی کی سرگرمیوں کی ایک پراسرار تصویر پیش کرتے ہوئے ایئر فورس کے بعض مشتبہ افراد

کی فہرست بھی سنائی جو ان کی معلومات کے مطابق کراچی کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کے فوڈ منیجر کے اشارے پر ان سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ ان کے بیان کے مطابق یہ شخص معصوم انسانوں کے خون کے پیاسے مشہور زمانہ افسانوی کردار ڈریکولا یا جاسوسی فلموں کے معروف کردار جیمز بونڈ یا الفرڈ ہچ کاک کی فلموں کے پراسرار کرداروں کے مانند تھا۔

اس کی بریفنگ کے بعد میں نے اس پر جرح شروع کی تو وہ ہر جملے پر ہکلانے لگا۔ ڈی جی آئی بے چین ہو گئے اور بولے "ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ فوراً ان سب افراد کو گرفتار کر کے تفتیش شروع کر دیں۔ ہم ان سب کو اسلام آباد لے جائیں گے۔ آپ اسلام آباد آفس کو مطلع کریں کہ وہ فوراً 20 افراد کے لئے قید خانوں کا بندوبست کریں اور تفتیشی ٹیمیں تشکیل دے دیں" میں جنرل اختر کے ساتھ ہی بیٹھا تھا' میں نے آہستگی سے انہیں مشورہ دیا:

"سر! میرا خیال ہے کہ ہمیں سب سے پہلے اس جاسوس سے پوچھ گچھ کرنی چاہئے جس نے یہ سب معلومات فراہم کی ہیں اور جو اس گروہ کا رکن ہونے کا دعویدار بھی ہے۔ ہمیں گمشدہ افراد کی تلاش کے ساتھ ساتھ ان کی مبینہ قبروں کو بھی ڈھونڈنا چاہئے۔ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کے فوڈ منیجر کو زیر نگرانی رکھ کر اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھنی چاہئے۔ محض ابتدائی اطلاع پر میرے خیال میں اس طرح گرفتاریاں کرنا مناسب نہ ہو گا۔ ایک عام آدمی بھی اس الف لیلیٰ کی داستان کو سن کر اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس میں کہاں کہاں جھول ہیں۔ کم سے کم ہمیں جرم کی مضبوط شہادتیں تو اکٹھی کر لینی چاہیں۔"

میرا یہ مشورہ ڈی جی آئی صاحب کو مطلق پسند نہ آیا' وہ ایک بار پھر برسے "صدر صاحب کا حکم ہے کہ اس کیس میں ملوث سب افراد کو فوراً گرفتار کر کے ان کے خلاف کارروائی کی جائے۔ یہ احکامات بالکل واضح اور صاف ہیں" ڈی جی آئی کے اس حکم کے بعد جو انہیں صدر صاحب نے دیا تھا' کسی مزید بحث کی گنجائش نہ تھی۔ جنرل اختر عبدالرحمن کا یہ معمول تھا کہ صدر ضیاء اگر انہیں کوئی حکم دیتے تو وہ اس کی صدق دل سے تعمیل کرتے اور دوسروں کو بھی ایسا کرنے پر مجبور کرتے۔ یہ ان کا عمومی رویہ تھا۔

چنانچہ اب ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اس حکم کو ماننا ہمارے منصب کا تقاضا تھا۔ ڈی اے آئی کے ذمے ایئر فورس کے مشتبہ افراد کی گرفتاری کا فریضہ تھا اور ہمیں یعنی آئی ایس آئی کو ہوٹل کے فوڈ منیجر کو گرفتار کرنا تھا۔ رات کو میں اپنی ٹیم کے ہمراہ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل گیا جہاں ہم نے مطلوبہ شخص کی گرفتاری کے لئے ابتدائی منصوبہ بندی کی۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ وہ شخص خاصا خطرناک ہے اور گرفتاری سے بچنے کے لئے اسلحہ بھی استعمال کر سکتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ مسلح رہتا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ہوٹل کے عملے میں بھی

اس کے کارکن شامل ہوں۔

میں نے سادہ کپڑوں میں چار مسلح افراد کو مختلف مقامات پر تعینات کر دیا۔ ہم نے اپنے منصوبے کی ریہرسل بھی کی اور اس کے منفی اور مثبت نتائج کا موازنہ بھی کیا۔ میری خواہش تھی کہ مطلوبہ شخص کو کسی ہنگامے اور شور کے بغیر گرفتار کر لیا جائے۔ چونکہ مقامی شہری انتظامیہ کو اس سلسلے میں اعتماد میں لینا بھی ضروری تھا' اس لئے ہم نے مقامی مجسٹریٹ سے باقاعدہ تلاشی اور گرفتاری کے وارنٹ حاصل کئے اور پولیس فورس کا اہتمام بھی کیا۔ اس ضمن میں فوری طور پر ہمیں ایک ایف آئی آر بھی درج کرانا تھی۔

میں رات بھر بستر پر لیٹا اس کہانی کو دہراتا رہا مگر مجھے نہ جانے کیوں اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں بار بار یہی سوچ رہا تھا کہ اگر یہ کہانی سو فیصد درست ہے تو پھر واقعی خاصی خوفناک ہے۔ بہرحال اگلے روز تمام ٹیمیں اپنے اپنے مشن پر روانہ ہو گئیں۔

ہم ہوٹل پہنچے' سفید کپڑوں میں ملبوس ہمارے ساتھی اپنے اپنے طے شدہ مقامات پر کھڑے کر دیئے گئے۔ مجسٹریٹ اور پولیس پارٹی کو کار پارک میں کھڑا کر دیا گیا۔ میں' او سی کراچی کے ساتھ خود مینیجر کے کمرے میں داخل ہوا جہاں وہ اپنے معمول کے کام میں مصروف تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اسے باہر آنے کے لئے کہا۔ وہ ہمیں گاہک سمجھ کر ہمارے ساتھ باہر آ گیا۔ پہلی نظر میں مجھے اس میں کوئی غیر معمولی بات محسوس نہ ہوئی۔ وہ ایک عام ہوٹل ایگزیکٹو تھا اور میرا خیال ہے وہ مسلح بھی نہیں تھا۔ ہم اسے سیدھا کار پارک میں مجسٹریٹ کے پاس لے گئے جو وہاں ہمارا منتظر تھا۔ مجسٹریٹ نے اس کا اور اس کے باپ کا نام لیا' اس نے جواب دیا "جی ہاں" تو مجسٹریٹ فوراً بولا "تمہیں جاسوسی کے الزام میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔" مجسٹریٹ کا یہ حکم سن کر اسے ایک زبردست دھچکا لگا۔ اس کے حواس گم ہو گئے' پولیس کے انسپکٹر نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی ہمارے کراچی آفس چلی گئی۔

ہم نے ہوٹل کے جی ایم کو رسمی طور پر مطلع کر دیا اور پولیس کی نگرانی میں ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ اسے نظر بند کرنے کے بعد ہم اس کی رہائش گاہ پر پہنچے جس کی تلاشی کے وارنٹ پہلے ہی حاصل کئے جا چکے تھے۔ چھاپے کے وقت اس کے گھر میں صرف دو خواتین تھیں۔ ہمارے کہنے پر انہوں نے ہمسائے سے اپنے کسی بزرگ چچا کو بلوا لیا۔ میں نے اس بزرگ کو بتایا کہ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ہوٹل میں ایک معمولی سی چوری ہو گئی ہے۔ اور ہم اس سلسلے میں گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ اس بزرگ نے اندر جا کر مستورات سے بات کی اور چند لمحوں کے بعد خواتین اپنے اسی بزرگ کے ہمراہ ان کے ہاں

چلی گئیں۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے ایک معمر خاتون نے کہا "میرا بیٹا بہت ایماندار ہے وہ کوئی غلط کام نہیں کر سکتا۔" وہ یہ جملہ نہ بھی کہتی تو میں پہلے ہی سے یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ ہم ایک بے مقصد مشن پر اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔

بہرحال سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس والوں کے ساتھ ہم نے گھر کی تلاشی لینا شروع کی۔ وہ بزرگ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ چونکہ ہماری زیادہ دلچسپی ہتھیاروں یا ایسی دستاویزات میں تھی جن سے اس کی مبینہ سرگرمیوں کا کوئی ثبوت مل سکے' لہٰذا ہم نے ایک ایک چیز کا بھرپور جائزہ لیا۔ بھارے کونوں کھدروں کو اچھی طرح کھنگالا مگر پورے گھر میں کوئی انوکھی یا خاص چیز دکھائی نہ دی۔ گھر میں کچھ تصاویر تھیں خوشگوار لمحوں کی یادیں۔ معمول کے مخطوط' خوشی غمی کی اطلاعات' نازک احساسات اور جذبات سے بھرے ہوئے دوست احباب رشتہ داروں اور پیاروں کے سندیسے اور بس' یہ تاثر بھی نہ ملا کہ یہ کسی ایسے شخص کا گھر ہے جو اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرتا ہو۔ یا پر تعیش زندگی گزار رہا ہو' ہم نے بزرگوار کا شکریہ ادا کیا اور ان سے معذرت کر کے ہم خالی ہاتھ اس کے گھر سے واپس آ گئے۔

سورج غروب ہونے سے پہلے ہی ہم تمام مشتبہ افراد کو ہتھکڑیاں لگا کر سی۔ 130 سے اسلام آباد کے لئے روانہ ہو گئے۔ یہی حکم حاکم تھا۔ چکلالہ پہنچتے ہی انہیں مختلف تفتیشی ٹیموں کے حوالے کر دیا گیا۔ جنہوں نے فوری طور پر اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ لیکن دو روز کی مسلسل اور بھرپور تفتیش کے باوجود کسی ٹیم کو ان لوگوں کے جرم کی کوئی شہادت نہ مل سکی۔ ان ٹیموں کے انچارج ایک ایک کر کے میرے پاس آئے اور سب نے یہی کہا کہ یہ لوگ بے گناہ ہیں اور ان کے ہاتھ تو صاف ہیں۔ میں نے فوری طور پر ایئر کموڈور زمان سے رابطہ کیا اور ان کی بتائی ہوئی تفتیشی ٹیموں کے نتائج سے ان نتائج کا موازنہ کیا۔ ان کا نتیجہ بھی یہی تھا' ماسوائے ایک کیس کے جس کا اس من گھڑت کہانی سے کوئی تعلق نہ تھا۔

میں نے ڈی اے آئی سے اس نام نہاد بھارتی ایجنٹ کو میرے حوالے کرنے کے لئے کہا تاکہ میں خود اس سے تفتیش کر کے یہ معلوم کر سکوں کہ اس نے ایک بے بنیاد کہانی گھڑ کر ہمیں گمراہ کیوں کیا۔ یا دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اب بھی ہم سے کچھ چھپا رہا ہے۔ انہوں نے کہا "میں خود اس ایجنٹ سے بات کر چکا ہوں اور اس کا کہنا ہے کہ وہ اس معاملے میں بے قصور ہے کیونکہ یہ طوطا کہانی اسے او سی نے پڑھائی تھی۔ او سی کا خیال تھا کہ ہم زبردستی چند افراد کو گنہگار ثابت کر دیں گے اور اس طرح اس کی ترقی ہو جائے گی۔"

میرے لئے یہ اطلاع انتہائی پریشان کن تھی۔ ہمارے ہاتھوں کئی بے گناہ اور بے قصور افراد پریشان ہوئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کی عزت نفس اور معاشرتی مقام کو داغ دار

بتانے پر ہمارا ضمیر ہمیں کیسے معاف کرے گا۔ میرے نزدیک یہ ظلم اور غیر انسانی حرکت تھی جسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سوچتے ہی اس معمر خاتون کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا جو کہہ رہی تھی:

"میں نے پہلے ہی نہیں کہا تھا کہ میرا بیٹا بے گناہ ہے" میں نے تصور میں ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور کہا "برائے مہربانی' مجھے معاف کر دیجئے۔ آپ نے بالکل درست فرمایا تھا' آپ کا بیٹا واقعی بے گناہ اور بے قصور ہے۔"

اگلے ہی لمحے میں اسی عجیب و غریب جذباتی کیفیت سے دوچار جنرل اختر عبدالرحمٰن کے کمرے میں جا پہنچا۔ میں نے انہیں تفتیش کے نتائج سے آگاہ کیا۔ میرا لہجہ خشک اور بھرایا ہوا تھا۔ میری آنکھیں مجسم سوال تھیں "کیا میں نے نہیں کہا تھا سر کہ ہمیں ان لوگوں کو گرفتار کرنے سے پہلے خود تفتیش کر لینی چاہئے؟"

مگر ان کے چہرے پر کسی پریشانی کے آثار نہیں تھے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا "ڈی اے آئی سے کہو کہ ان لوگوں کو رہا کر دے' میں صدر سے خود بات کر لوں گا۔" ہم نے ان لوگوں سے معذرت کرتے ہوئے انہیں فوری طور پر رہا کر دیا۔

میں آج بھی یہی سوچتا ہوں کہ ہم نے ان بے گناہ لوگوں کو جو دکھ پہنچایا اس کا ازالہ ناممکن ہے۔ واقعی ہم رب العزت کا فرمان بھول چکے تھے ورنہ ہم سے یہ غلطی سرزد نہ ہوتی۔



شیعہ فوجیوں پر پابندی

متعدد دیگر مسلم ممالک کی طرح سعودی عرب کے ساتھ پاکستان کے بھی ہمیشہ سے روایتی برادرانہ تعلقات ہیں اور اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ یہ رشتہ تاریخی' مذہبی اور ثقافتی ہم آہنگی کی بنیاد پر استوار ہے اور یہی وجہ ہے کہ دونوں ممالک مشکل اوقات میں اور ہر مسئلے میں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے اپنے قومی جذبات اور وقار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دونوں برادر ممالک نے ہمیشہ ایک دوسرے کے جذبات' احساسات اور روایات کا احترام کیا ہے۔

اپنے عقیدے اور مسلک کے حوالے سے سعودی عرب کے حکمرانوں کے شیعوں کے ساتھ دوستی اور اعتماد کے جذبات کچھ سرد رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی ہر حکومت نے اسے ایک غیر تحریری قانون اور قومی پالیسی کا حصہ سمجھا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سعودی عرب میں پاکستانی سفارتخانے میں کسی شیعہ کو تعینات نہ کیا جائے اور نہ ہی کسی شیعہ فوجی کو تربیت یا کسی اور فوجی مشق کے لئے وہاں بھیجا جائے۔

یہاں یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ "ڈیزرٹ شیلڈ" اور "ڈیزرٹ سٹارم" کے حوالے سے امریکی' برطانوی' جرمن' فرانسیسی' عیسائی' یہودی حتیٰ کہ ہم جنس پرست اور لونڈیاں تو بغیر روک ٹوک ارض مقدس میں آتی جاتی رہی ہیں مگر پاکستان سے شیعوں کا داخلہ ممنوع رہا ہے۔

تبوک میں ایک پاکستانی بریگیڈ کی تعیناتی کے سلسلے میں جنرل ضیاء نے بحیثیت صدر اور چیف آف دی آرمی سٹاف' سعودی عرب سے جو معاہدہ کیا اس کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ اس بریگیڈ میں کوئی شیعہ افسر یا سپاہی نہیں بھیجا جائے گا۔ ہمیں اس حقیقت کا علم یوں ہوا کہ اس فیصلے کو یقینی بنانے کے لئے آئی ایس آئی کو باقاعدہ طور پر یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ سعودی عرب جانے والے دستوں میں ہر ایک کی انفرادی سیکورٹی کلیرنس کرتے وقت اس بات کو بھی یقینی بنایا جائے کہ کہیں کوئی شیعہ کلیر نہ ہو جائے۔ بہرحال اپنی معمول کی کارروائی میں ہمیں محسوس ہوا کہ اس بریگیڈ میں جانے والے مالی فوائد کے حوالے سے تو

خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور ہمیں یہ توقع بھی تھی کہ ہمارے سعودی عرب کے ساتھ فوجی تعلقات کو بھی فروغ ملے گا اور اس سے ہمارے قومی مفاد کو بھی تقویت حاصل ہو گی' مگر عمومی طور پر شیعہ افراد کے حوالے سے اس حکم پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس بریگیڈ میں کوئی شیعہ سعودی عرب نہ جاتا مگر اس پابندی پر بہت سے افسران اور ماتحتوں نے برہمی کا اظہار کیا۔ چہ مگوئیاں ہونے لگیں اور بالآخر واضح طور پر اس برہمی کی بازگشت سنی جانے لگی۔ سنی اور شیعہ دونوں مل کر اس فیصلے پر خاموش احتجاج کر رہے تھے۔ پاکستانی فوج کی یہ عجب اور ناقابل فہم تقسیم تھی اور اس کے اثرات بہت گہرے بھی ہو سکتے تھے۔

آئی ایس آئی نے احتجاج کی بڑھتی ہوئی شدت کو محسوس کرتے ہوئے ایک رپورٹ مرتب کی جس میں کہا گیا کہ معمولی مفادات کے حصول کے لئے ہمیں اپنی فوج کو عقیدے کی بنیاد پر گروہوں میں تقسیم نہیں کرنا چاہئے۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہو گا کہ ہماری افواج کے چمکتے ماتھے اور معصوم چہرے پر ایک بدنما داغ لگ جائے گا۔ ہماری افواج نے ہمیشہ اسلام کی خاطر جہاد کیا ہے اور اسلام کے نام پر قربانیاں دی ہیں اور اگر ہم نے پاکستان میں اسلام کو کسی مخصوص فقہ کے عقیدے کے حوالے سے کوئی مخصوص معنی پہنائے تو کافروں کے خلاف اپنے فوجیوں میں جوش اور شہادت کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی مضبوط بنیاد نہ رہے گی۔ ہم نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی لکھا کہ پاک فوج میں مذہبی تفریق کا سلسلہ تو پہلے ہی سے شروع ہو چکا ہے' اگر اس میں فقہ کے لحاظ سے بھی گروہ بندی شروع ہو گئی تو پھر گروہ ہی گروہ بنتے جائیں گے اور اس سے ہماری فوج کا پورا ڈھانچہ متاثر ہو جائے گا اور بالآخر یہ پاکستان کی سلامتی کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم پہلے ہی عیسائی اور قادیانیوں کو الگ کر چکے ہیں' اب شاید کوئی عیسائی یا قادیانی سپاہی پاکستان کی سلامتی کی جنگ میں اپنی جان دینے کو تیار نہ ہو۔

ایک بھارتی دانشور نے کہا تھا "اگر تم پاکستان کو تباہ کرنا چاہتے ہو تو اس کی فوج کو تباہ کر دو اور پاکستانی فوج کو تباہ کرنے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ اسے مذہبی' علاقائی اور لسانی گروہوں میں تقسیم کر دو۔" بھارت نے اس فلسفے کا اطلاق مشرقی پاکستان میں کیا اور وہ آج بنگلہ دیش کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اگر ہم بنگالی فوجیوں کو پاکستان کا وفادار رکھنے کی کوشش کرتے اور انہیں محرومیوں اور مایوسیوں کے پراپیگنڈا کا شکار نہ ہونے دیتے تو یقیناً پاکستان دولخت نہ ہوتا۔ اس ضمن میں مجھے ایک بنگالی افسر کا واقعہ یاد آتا ہے۔ پاک فوج کی

آرٹلری کا یہ آفیسر اپنی چھ توپوں میں سے صرف تین کی دیکھ بھال اور صفائی کرتا تھا۔ ایک بار اس کے آفیسر نے اس سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ "سر جب ہم بنگلہ دیش بنالیں گے تو یقینی طور پر ساز و سامان بھی تقسیم ہو گا' لہٰذا ہمارے حصے میں تین توپیں ہی آئیں گی' میں انہیں تینوں کو ساتھ لے جاؤں گا۔" یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے کی سوچ بہت پہلے مسلح افواج کے بنگالی افسروں میں سرایت کر گئی تھی اور اس کی سب سے بڑی وجہ وہی تھی جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

مشرقی پاکستان کے محاذ پر پاکستانی افواج کی شکست اور ان کا ہتھیار ڈالنا تو بہر طور اذیت ناک مرحلہ تھا ہی لیکن یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ بھارتی حکمرانوں نے اپنی کوتاہ اندیشی اور فتح کی ٹرافی حاصل کرنے کی بچگانہ خواہش کی وجہ سے پاکستانی افواج کو بھارتی کمانڈر کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا اور انہیں جنگی قیدی بنا کر بھارت لے گئے۔ اگر ان میں تھوڑی بہت "عقل" ہوتی تو وہ مکتی باہنی کو پاکستانی افواج کا کنٹرول سنبھالنے اور پاکستانی کمانڈروں کو مکتی باہنی کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے لئے کہتے۔ انہوں نے مکتی باہنی میں پاکستان کے خلاف نفرت کا زہر اس حد تک بھر دیا تھا کہ ایسی صورت میں مکتی باہنی پاک فوج کے جوانوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی۔ بالکل اس طرح جس طرح انہوں نے پاک فوج کے ہتھیار ڈالنے سے پہلے کئی ایک پنجابی افسروں کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا تھا۔

ہماری اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہو گی کہ ہم اپنے ہی ہاتھوں پہلے خود ایسے حالات پیدا کرتے ہیں جن سے دشمن بھرپور فائدہ اٹھا سکتا ہے اور پھر بعد میں اس کا الزام دوسروں پر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دشمن تو ہمیشہ ایسے موقعوں کی تاک میں رہتا ہے اور انہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور جانے بھی کیوں دے؟

ہمیں ہمارے سینئر بتاتے ہیں کہ برطانیہ کے دور میں تقریباً ہر بٹالین میں مخلوط دستے ہوتے تھے۔ فوج میں سیاست یا مذہب پر بحث کرنے کی اجازت ہی نہ تھی۔ کیونکہ ایسے مباحثے ہمیشہ کشیدگی کا باعث بنتے تھے۔ افسران کو حکم دیا گیا تھا کہ آپ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں اگر آپ کے ماتحت کمپنی میں سکھ یا ہندو ہیں تو آپ پر لازم ہے کہ ہندو اور سکھ تہواروں پر انہیں مندر اور گوردوارے جانے کی اجازت دیں۔ برطانوی حکمرانوں کا فیصلہ بالکل درست تھا اور ہمیں بھی اس پر عمل کرتے ہوئے' فقہی' لسانی' علاقائی گروہ بندی سے حتماً" پرہیز کرنا چاہئے۔ اتحاد' یک جہتی' ایک دوسرے کی عزت اور کامریڈ شپ ہی ایک سپاہی کا مذہب اور سیاست ہے اور لسانی' مذہبی' سیاسی اور علاقائی اختلاف کے نظریہ کے خلاف

اس کی بھرپور تربیت کی جانی چاہئے۔ ہم مسلمان اور پاکستانی ہیں' ہماری حب الوطنی اور وفاداری غیر مشروط اور ناقابل تقسیم ہے۔ یہ ہماری اپنے ایمان اور ملک کے ساتھ مکمل یک جہتی کی آئینہ دار ہے۔

بہرحال بعدازاں ہمیں علم ہوا کہ ہماری رپورٹ پر جنرل ضیاء نے سعودی سفیر ریاض الخطیب سے اس معاملے پر گفتگو کی اور ان سے کہا کہ پاکستان کو آپ کی یہ شرط منظور نہیں ہے۔ شیعہ افراد کی سکروٹنی کے احکامات واپس لے لئے گئے اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ پاک فوج کے جو دستے بھیجے گئے ان میں شیعہ سنی فوجیوں کی کوئی تخصیص نہ رہی۔ اس بریگیڈ میں جانے والے شیعہ فوجیوں نے یقیناً سعودی عرب میں کسی انقلاب کے لئے کام نہیں کیا۔ کیونکہ وہ بھی اپنے اہلسنت ساتھیوں کی طرح اسلام کے فدائی سپاہی ہیں اور ایک خاص ڈسپلن کے پابند ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ بروقت اس مسئلہ کو نمٹا دیا گیا اور آئی ایس آئی نے سیکورٹی آف آرمڈ فورسز کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری' احسن طریقے سے انجام دی۔



پیسہ بولتا ہے

مسلح افواج کے جوان اور افسران جو صدر مملکت یا وزیراعظم کے ساتھ خدمات انجام دینے کے لئے تعینات کئے جاتے ہیں' ان کا انتخاب انتہائی رازداری' احتیاط اور سکیورٹی ایجنسیز کی باقاعدہ کلیئرنس کے بعد عمل میں آتا ہے' مگر کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مخصوص ذمہ داریوں کے لئے صدر یا وزیراعظم خود اپنے پسندیدہ افراد کی تعیناتی کی سفارش کر دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں سکیورٹی کلیئرنس وغیرہ کا خیال نہیں رکھا جاتا' جس کا نتیجہ بعض اوقات یہ بھی نکلتا ہے کہ ایوان صدر یا وزیراعظم ہاؤس کی دسعتوں میں کام کرنے والے بعض اہم عہدیدار اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور سربراہان کے ساتھ قربت کی وجہ سے وہ خود کو کبھی کبھار کسی اور ہی دنیا کی باسی سمجھنے لگتے ہیں۔

چونکہ بہت سے اہم قومی امور اور حساس معاملات ان کے سامنے طے پاتے ہیں اور اکثر اوقات حساس ترین معاملوں تک ان کی رسائی بھی ہو جاتی ہے' اس لئے وقتاً" فوقتاً" ان کی نگرانی بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ یوں بھی من حیث القوم ہم سکیورٹی کی کوئی خاص پرواہ نہیں کرتے اور ہمارے پاس ایسا کلیئرنس سسٹم بھی نہیں ہے جو متعدد یورپی ممالک کے ہاں موجود ہے۔ لہٰذا اس بات کا احتمال ہر وقت موجود رہتا ہے کہ دشمنوں کے ایجنٹ ایسے لوگوں تک رسائی حاصل کر لیں' ان سے دوستیاں قائم کر لیں اور تحفے تحائف دینے کا سلسلہ شروع کر کے انہیں اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کریں یا وہ دانستہ یا غیر دانستہ طور پر دشمن کی معاونت کریں۔ دشمن کے کسی بھی شاطر ایجنٹ کو ایسے ہی اہم لوگوں کی تلاش ہوتی ہے جن کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

ہمارے ریکارڈ میں ایک ایسی رپورٹ بھی موجود ہے جس کے مطابق ایک امریکی سفارتکار نے راولپنڈی کے ایک جیولر سے سونے کے 16 سیٹ بنوائے اور عید کے موقعہ پر یہ سیٹ اعلیٰ حکام کی بیگمات کو تحفے کے طور پر دے دیئے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ بعض اوقات بہت ہی سینئر سٹاف آفیسروں کے دشمن کے پے رول پر ہونے کا شک گزرتا ہے یہ ہمیشہ ہی سے ایک نہایت مشکل مشق رہی ہے کہ صدر یا وزیراعظم کے کسی سٹاف ممبر کی

کبھی سیکورٹی کے حوالے سے نگرانی کی گئی ہو یا اس پر شبہہ کا اظہار بھی کیا گیا ہو۔ خاص طور پر ترقی پذیر ممالک میں ایسی کوئی روایت نہیں اور کوئی یہ تصور بھی نہیں کرے گا کہ کوئی سینئر سٹاف آفیسر دشمن کے پے رول پر ہو سکتا ہے۔ یوں بھی ان ممالک میں اور خاص طور پر پاکستان میں سیکورٹی ایجنسیوں کے بارے میں عوام کی رائے کبھی بھی اچھی نہیں رہی اور ان کے بارے میں خوف اور نفرت کی سی فضاء ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔ اتفاق سے اگر کسی اعلیٰ سرکاری عہدیدار کے بارے میں کسی تحقیق کا آغاز ہو بھی جائے تو متعلقہ اداروں کو بہت سے سوالات اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ سیکورٹی چیک انتہائی لازمی ہے۔

اس ضمن میں جنرل ضیاء کے دور کا ایک واقعہ مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ جنرل ضیاء ایک ملک کے دورے پر جانے والے تھے۔ ظاہر ہے وہاں اس ملک کے وزیراعظم کے ساتھ ان کی باضابطہ ملاقات اور گفتگو بھی ہونا تھی۔ اس ملاقات کے لئے چونکہ کسی مخصوص ایجنڈے کا اعلان نہیں کیا گیا تھا لہٰذا ہمارے دفتر خارجہ نے صدر صاحب کو تمام متوقع موضوعات پر' جو اس ملاقات میں زیر بحث لائے جا سکتے تھے' بریفنگ دی ۔ صدر صاحب نے کئی روز تک خارجہ امور کے ماہرین کے ساتھ ملاقاتیں کیں اور پوری طرح تیاری کرنے کے بعد دورے پر روانہ ہوئے۔

ادھر میزبان وزیراعظم نے ملاقات کے طے شدہ وقت سے صرف ایک رات پہلے اپنے سینئر معاونین کے ساتھ ملاقات میں پاکستانی صدر کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے حوالے سے ایک خفیہ میٹنگ کی۔

جب صدر ضیاء میزبان ملک پہنچے تو ائیر پورٹ کی معمول کی تقریبات کے بعد ان سے اس ملک میں قائم اپنے سفارتخانے آنے کی درخواست کی گئی۔ یوں بھی ابھی باضابطہ ملاقات میں کافی وقت تھا۔ ان سے کہا گیا کہ آپ اس ملاقات سے پہلے وہاں بھی ایک مختصر سی بریفنگ لے لیں۔ سفارتخانے پہنچتے ہی گذشتہ رات میزبان وزیراعظم' ان کی کابینہ اور اعلیٰ حکام کے مابین ہونے والی خفیہ میٹنگ کی تمام کارروائی تحریری طور پر ان کے سامنے پیش کر دی گئی۔ ہمارے سفارتخانے نے یہ خفیہ کارروائی کاغذ کی سیاہی خشک ہونے سے پہلے ہی حاصل کر لی تھی۔ نتیجتاً صدر ضیاء پوری تیاری کے ساتھ اس ملاقات میں شریک ہوئے' انہیں ہر اس موضوع کا پوری طرح علم تھا جس پر اس میٹنگ میں بات ہونا تھی۔ ظاہر ہے جب ہم اس طرح کی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں تو دشمن کے پاس بھی یقیناً ایسے

وسائل موجود ہیں کہ وہ بھی ہمارے حکمرانوں کے قریب رہنے والوں میں اپنے ایجنٹ تلاش کر لے۔ انہوں نے بھی یقیناً ایسی کوششیں کی ہیں اور ہمیں ان کی ان کوششوں کو ناکام بنانے کے لئے بہت کچھ کرنا ہوتا ہے۔

مجھے جنرل ضیاء الحق کے ایک اے ڈی سی کا واقعہ بھی ابھی تک یاد ہے۔ یہ ایک انتہائی سمارٹ نوجوان تھا مگر نہ جانے اس کے ذہن میں اس اہم ذمہ داری پر موجود رہنے کے ساتھ ساتھ کچھ اور ذرائع سے "رزق حلال" کمانے کا خیال کیسے آگیا۔ ان دنوں چوہدری ظہور الٰہی محنت' افرادی قوت اور سمندر پار پاکستانیوں کے امور کے وفاقی وزیر تھے۔ وہ ملک میں موجود سینکڑوں ریکروٹنگ ایجنسیوں کو افرادی قوت ملک سے باہر بھجوانے کا کوٹا الاٹ کیا کرتے تھے۔ ان اے ڈی سی صاحب نے بھی ان سے ایوان صدر میں ان کی کسی حاضری کے دوران ان سے 20 افراد ماہانہ باہر بھجوانے کا کوٹا مختص کرنے کی درخواست کی' سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ بیگم شفیقہ ضیاء الحق نے بھی ہمدردی اور مہربانی کا اظہار کرتے ہوئے چوہدری ظہور الٰہی سے فون پر اس کی سفارش کر دی۔ اب اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ چوہدری صاحب اے ڈی سی کی درخواست یا بیگم صاحبہ کے حکم کو ٹال سکتے۔ چنانچہ 20 افراد کا کوٹا مختص کر دیا گیا۔ اب اے ڈی سی صاحب خود اس بزنس کو چلا رہے تھے اور فی ویزا 14000 روپیہ وصول کر رہے تھے اس طرح انہیں 280000 روپے ماہانہ فاضل آمدنی ہو رہی تھی۔ لطف کی بات یہ تھی کہ بیرون ملک جانے کے خواہشمند ایوان صدر کے عقبی دروازے سے ان سے ملنے کے لئے آتے اور نوکری لے کر چلے جاتے' آہستہ آہستہ ان کی میز پر پاسپورٹوں کا ڈھیر لگنا شروع ہو گیا اور ان کا کوٹہ کم پڑ گیا۔

ان دنوں جنرل ریاض خان آئی ایس آئی کے ڈی جی آئی تھے۔ میں نے اس سلسلے میں ایک رپورٹ تیار کی اور ان کی خدمت میں پیش کی۔ اس رپورٹ میں سفارش کی گئی تھی کہ اسے صدر صاحب کے ملاحظے کے لئے بھجوا دیا جائے۔ جنرل ریاض نے رپورٹ دیکھتے ہی مجھ سے پوچھا "کیا یہ سو فیصد درست ہے؟" میں نے انہیں بتایا کہ میں اسے ذاتی طور پر دو بار چیک کر چکا ہوں اور یہ بالکل درست ہے' جنرل صاحب اب بھی مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا "کیا اس ضمن میں کوئی گولہ بھی ہے؟" میں نے کہا "صدر صاحب بذات خود اپنے اے ڈی سی کی میزوں کے دراز چیک کر سکتے ہیں یا بیگم صاحبہ سے بھی پوچھ سکتے ہیں۔"

بہرحال جنرل ریاض ایوان صدر میں ہونے والی اپنی اگلی میٹنگ ہی میں یہ فائل ساتھ

لے گئے۔ ان کی واپسی پر میں نے ان سے رپورٹ کے بارے میں صدر صاحب کا ردعمل پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ صدر صاحب نے رپورٹ کو دیکھا مگر کسی رائے کا اظہار کئے بغیر میز پر رکھ لی۔

اس بات کو تقریباً ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا مگر ابھی تک ایوان صدر سے کسی ردعمل کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ ایک روز میں نے ڈی جی آئی کو پھر یاد دلایا اور بتایا کہ اے ڈی سی صاحب کا ریکروٹنگ کا کاروبار اب خوب چمک رہا ہے۔ اس کا کوٹا مزید بڑھا دیا گیا ہے اور اس بات کا احتمال بھی ہے کہ وہ اپنی فیس بھی 14 ہزار سے بڑھا دیں۔ ڈی جی آئی کہنے لگے "ہمارا کام صرف رپورٹ کرنا ہے۔ فیصلہ کرنا ہمارا منصب نہیں۔ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اب یہ صدر صاحب پر ہے کہ وہ کیا ایکشن لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں یہ سب بھول جانا چاہئے۔"

میں نے مودبانہ گزارش کی:

"جناب میرے خیال میں ہمارا کام ختم نہیں ہوا ہے۔ یہ اے ڈی سی سیریس سکیورٹی رسک ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر ہمارے دشمنوں کو اس کی دولت کی ہوس اور قیمت کا پتہ چل گیا اور میرا خیال ہے کہ اب تک وہ اس سے آگاہ ہو چکے ہوں گے تو وہ یقیناً اس کی وفاداریاں خریدنے کی کوشش کریں گے۔ وہ ایک اہم شخص ہے۔ اس کے ذریعے دشمن ہمارے بہت سے راز خرید سکتے ہیں اور اگر اس کا سودا ہو گیا تو بعید نہیں کہ وہ صدر صاحب ہی کو فروخت کر ڈالے۔ میں اسے ایک سیریس سکیورٹی رسک سمجھتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ ہمیں صدر صاحب کو اپنی اس تشویش سے آگاہ کر دینا چاہئے۔ اگر سرکاری نوکری میں رہ کر پرائیویٹ بزنس کرنا صدر صاحب کی نظر میں غیر قانونی نہیں ہے تو کم سے کم اس اے ڈی سی کو اس کی موجودہ ذمہ داریوں سے ہٹا ہی دیا جائے۔"

ڈی جی آئی نے میری بات غور سے سنی اور اس سے اتفاق کیا۔ اور اس تشویش کو صدر صاحب تک پہنچا دیا۔ چند ہی روز بعد اسٹیبلشمنٹ ڈویژن سے ایک آرڈر ملا جس میں اس اے ڈی سی کو ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ میں تبدیل کر کے فوری طور پر ایک ضلع کا ڈپٹی کمشنر لگا دیا گیا تھا۔

ہماری دعا ہے وہ جہاں بھی رہے ہمیشہ خوش رہے۔

حساس ذمہ داریاں ادا کرنے والے ایسے افسروں اور اہلکاروں کی وقتاً فوقتاً جانچ پڑتال اور نگرانی کے بارے میں میرا پختہ نقطہ نظر' میرے ذاتی مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر معرض

وجود میں آیا ہے اور میں آج بھی اس کے حق میں ہوں کہ ہمیں اس سلسلے میں سی آئی اے کی طرز پر ایک مستقل نظام قائم کرنا چاہیے' تاکہ جو آفیسرز راہ راست سے ذرا بھی بھٹک جائیں انھیں بروقت ان کی حساس ذمہ داریوں سے ہٹا دیا جائے۔

درج ذیل ثبوت میرے اس دعوے کی تصدیق کے لئے کافی ہیں:

"کلاسیفائڈ سی آئی اے فیلڈ رپورٹ"

"سی آئی اے کی فیلڈ رپورٹ کے مطابق پاکستان کے ڈائریکٹر ملٹری آپریشنز' بریگیڈئر میاں محمد افضل کو سی آئی اے کے سپے رول پر اس لئے لایا گیا تاکہ پاکستان کے ساتھ تعاون کو یقینی بنایا جاسکے۔"

3- اکتوبر 1979ء سپائی نیسٹ ڈاکومنٹس' والیم 30' او پی سی' آئی ٹی این۔



تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کا کنونشن

20 جنوری 1980ء کو صدر ضیاء نے اسلام آباد کی لال مسجد سے پورے ملک میں زکوۃ اور عشر کے نظام کے نفاذ کا اعلان کیا۔ اس اعلان سے قبل اسی روز وہ اس ضمن میں ایک آرڈیننس بھی جاری کر چکے تھے۔ صدر ضیاء کے اس اعلان پر پاکستان کے شیعوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا اور مفتی جعفر حسین کی قیادت میں صدر سے مطالبہ کیا کہ شیعوں کو زکوۃ اور عشر کی ادائیگی کے اس طریقہ کار سے مستثنیٰ قرار دے دیں کیونکہ یہ آرڈیننس فقہ حنفیہ کی رو سے نافذ کیا گیا ہے اور فقہ جعفریہ کے پیروکار زکواۃ اور عشر کی ادائیگی کے اس طریقہ کار سے اپنی فقہ کی رو سے قطعی طور پر اتفاق نہیں کرتے۔

شیعوں کے متعدد وفود نے اس ضمن میں جنرل ضیاء سے ملاقاتیں کیں۔ حکومت کو اس سلسلے میں ہزاروں تحریری یادداشتیں اور خطوط ارسال کئے مگر جنرل ضیاء کی حکومت اس آرڈیننس میں تبدیلی پر ہرگز آمادہ نہ ہوئی۔ حکومت کی اس خاموشی پر شیعوں نے 4 اور 5 جولائی کو اسلام آباد میں فقہ جعفریہ کے ماننے والوں کا ایک ملک گیر کنونشن منعقد کرنے کا اعلان کر دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کنونشن کے ذریعے شیعوں کی طاقت کا مظاہرہ کیا جائے اور حکومت کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کے لئے مجبور کیا جائے۔

جس روز اسلام آباد میں یہ کنونشن ہوا میں اور آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کسی اور کیس کے سلسلے میں کراچی میں تھے۔ چونکہ اس کنونشن کا براہ راست آئی ایس آئی سے کوئی تعلق نہیں تھا' لہذا ہم نے نہ تو اس کا تفصیلی مطالعہ کیا تھا اور نہ ہی اس سلسلے میں ہونے والی کسی پیش رفت کا ہمیں علم تھا۔ ہمیں صرف باخبر رکھا گیا تھا۔ جب ہم 5 جولائی کو اسلام آباد واپس پہنچے تو ہمارے فیلڈ کمانڈر نے ہمیں بریفنگ دی کہ کنونشن کے اختتام پر شیعوں کا ایک انبوہ خوب نعرہ بازی کرتا ہوا سیکرٹریٹ۔ 6 کی ہاکی گراؤنڈ سے ایک جلوس کی شکل میں سیکرٹریٹ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ پولیس نے اس جلوس کو روکنے کے لئے لاٹھی چارج کیا۔ آنسو گیس پھینکی حتیٰ کہ فائرنگ بھی کی جس کے نتیجے میں ایک شخص جاں بحق اور 14 افراد زخمی ہو گئے' مگر اس کے باوجود پولیس اس جلوس کو روکنے میں ناکام رہی ہے اور شیعوں

نے سیکرٹریٹ کے سامنے والی اونچی گراؤنڈ پر قبضہ کر لیا ہے۔ گویا یہ ایک قسم کا حکومت پاکستان کا "گھیراؤ" تھا۔

اس معاملے سے نمٹنے کی ذمہ داری مارشل لاء اتھارٹیز یا مقامی پولیس پر عائد ہوتی تھی جبکہ اس کا براہ راست تعلق وزارت مذہبی امور سے تھا۔ فیلڈ کمانڈر کی بریفنگ سے تقریباً ایک گھنٹہ بعد مجھے ڈی جی آئی نے فون پر پوچھا "آپ کو معلوم ہے اسلام آباد میں کیا ہوا ہے؟" میں نے انہیں فیلڈ کمانڈر کی بریفنگ سے آگاہ کر دیا۔ ڈی جی آئی نے کہا "صدر ضیاء بھی مجھے معاملے کی نزاکت سے آگاہ کر چکے ہیں۔ میں شیعوں کے مطالبے سے پوری طرح متفق ہوں۔ کسی ایک فقہ کے اصول کو دوسری فقہ کے ماننے والوں پر نہیں تھوپا جا سکتا مگر شیعوں نے تشدد کا راستہ اختیار کیا ہے۔ صدر ضیاء نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ وزیر داخلہ محمود اے ہارون اور جنرل صغیر حسین سید پر مشتمل ایک اعلیٰ سطحی وفد نے اس سلسلے میں مفتی جعفر حسین سے بات چیت بھی کی ہے' مگر اس وفد کو ناکامی ہوئی ہے۔ ہم مکمل طور پر اندھیرے میں ہیں' صورتحال مکمل طور پر جامد ہو چکی ہے اور ہمیں بالکل علم نہیں کہ شیعہ اگلا قدم کیا اٹھائیں گے۔ فی الحال تو انہوں نے سیکرٹریٹ کا گھیراؤ کر رکھا ہے اور اپنے مطالبے کی منظوری تک اسے ختم کرنے کو تیار نہیں۔ مظاہرین کا ارادہ توڑ پھوڑ اور دنگا فساد کرنے کا معلوم ہوتا ہے۔ اگر کل انہوں نے جاں بحق ہونے والے شخص کی لاش اٹھا کر پھر جلوس نکال لیا تو صورتحال کو کنٹرول کرنا مشکل ہو جائے گا۔ کئی ایک متبادل منصوبوں پر غور کیا جا رہا ہے۔ مگر صدر صاحب یہ چاہتے ہیں کہ آئی ایس آئی اس واقعے کا تفصیلی جائزہ لے اور اس کے مضمرات سے ان کو آگاہ کرے۔ آپ خود وہاں جائیں' حالات کا مطالعہ کریں اور مجھے بتائیں کہ اس صورت حال سے کیسے نمٹا جا سکتا ہے۔ کوشش کریں کہ مرنے والے کے لواحقین لاش گھر لے جانے پر آمادہ ہو جائیں اور مزید خون خرابہ نہ ہو۔"

ڈی جی آئی کی اس ہدایت کے بعد میں نے اپنے دو ماتحت آفیسروں کو ساتھ لیا اور ہم سیکرٹریٹ جا پہنچے۔ پولیس نے تمام علاقے کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور مظاہرین کے اردگرد لوہے کے خاردار تار بچھانے میں مصروف تھی۔ انتظامیہ کا خیال تھا کہ مظاہرین کو ان خاردار تاروں میں پابند کر دیا جائے تاکہ کوئی نہ تو باہر نکل سکے اور نہ ہی اندر جا سکے۔ اس مقصد کے پیش نظر اس علاقے میں محصور شیعہ مظاہرین کو خوراک' پانی اور طبی امداد پہنچانے والے بعض رضاکار اداروں کی گاڑیوں کو بھی آنے کی اجازت نہیں دی جا رہی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے پولیس ان مظاہرین کی مکمل ناکہ بندی کر رہی ہے۔ اس وقت اس جگہ تقریباً 30

سے 40 ہزار شیعہ موجود تھے جو کھلے آسمان تلے ننگی زمین پر پانی اور خوراک کے بغیر رات بسر کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔ ان کے عزائم بتا رہے تھے کہ وہ مفتی جعفر حسین کی قیادت پر مکمل یقین رکھتے ہیں۔ اور اپنے مطالبے کی منظوری کے علاوہ کوئی اور حل قبول نہیں کریں گے۔ تاہم ان کے عزائم قطعی طور پر متشددانہ نہیں تھے۔ ہم نے علاقے کا ایک چکر لگایا اور اپنے طور پر یہ جاننے کی کوشش کی کہ مظاہرین کے پاس کسی قسم کا اسلحہ تو نہیں ہے مگر تمام مظاہرین نہتے تھے اور مفتی جعفر حسین کے اگلے حکم کے منتظر تھے۔

وہاں سے ہم جی۔ 6 میں واقع امام بارگاہ پہنچے جہاں 30 کے قریب افراد' جاں بحق ہونے والے نوجوان کی میت کے غسل اور کفن کی تیاری میں مصروف تھے۔ میں نے بغور لاش کا معائنہ کیا۔ گولی اس کے ماتھے پر لگی تھی۔ اس کا نام شاد تھا اور وہ سرگودھا ڈسٹرکٹ سے اپنے بڑے بھائی اور چند دوستوں کے ساتھ کنونشن میں شرکت کے لئے آیا تھا۔ میں نے اس کی موت پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"ایک معصوم اور بے گناہ شہری اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔"

میں نے اس کے بھائی سے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اس کے جذبات اور احساسات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ وہ پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں تھا اس نے کہا:

"میرے بھائی کی شہادت خدا کو منظور تھی۔ وہی ہم سب کا خالق ہے۔ ہمیں اس کی رضا پر راضی رہنا چاہئے کیونکہ ہم سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔"

اس سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ ہمیں اس کو شاد کی میت دفن کر دینے یا اسے اس کے آبائی گاؤں لے جانے کے سلسلے میں رضامند کرنا چاہئے مگر وہ پہلے ہی میت کو اپنے گاؤں لے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ میت کو کس طرح لے کر جائے۔ وہ اس ضمن میں کنونشن کے منتظمین کی مدد اور رہنمائی کا منتظر تھا۔

علاقے کا تفصیلی دورہ کرنے کے بعد میں نے صورتحال کا مکمل جائزہ لیا اور اس ذمہ داری کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کر لیا۔ میری خواہش تھی کہ اب مزید کسی انسانی جان کے ضیائع اور کسی مسجد یا امام بارگاہ کی بے حرمتی کے بغیر یہ معاملہ بخیر و خوبی طے پا جائے۔ تاہم میں نے کسی کو سرکاری افسر کے طور پر اپنی شناخت نہ کرائی کیونکہ ایسا کرنا انتہائی خطرناک ہو سکتا تھا' اس لئے میں نے خود کو ایک مقامی شیعہ کے طور پر متعارف کروایا۔ اسلام آباد کے چند شیعہ اگر میرے نام سے واقف نہیں تھے تو میرے چہرے سے آشنا ضرور تھے۔ اس لئے میرا وہاں پر موجود ہونا کوئی عجب بات نہیں تھی۔

جب میں شاہ کے بھائی سے گفتگو کر رہا تھا تو میرے ایک ماتحت نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا "امامیہ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے چند نوجوان امام بارگاہ میں آپ کی موجودگی پر مشتعل ہو رہے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ آپ سرکاری آدمی ہیں اس لئے وہ آپ پر تشدد کرنے کا پروگرام بھی بنا رہے ہیں۔"

میں نے اس سے کہا کہ تم ان کے لیڈر کو اندر لے آؤ! آئی ایس او کا لیڈر اندر آیا اور مجھ سے پے در پے سوالات پوچھنے لگا۔ میں نے کہا:

"نوجوان میرا خیال ہے تم اسلام آباد کے رہنے والے نہیں ہو اس لئے تم مجھے نہیں پہچانتے اور میں تم سے اپنا تعارف کروانا ضروری نہیں سمجھتا۔ تاہم اگر تم آئی ایس او کے راہنما ہو تو یہاں کئی ایک مسائل ہیں جن سے تم کو نمٹنا ہے' اس لئے اب میری بات غور سے سنو۔ پہلی بات یہ ہے کہ پولیس امام بارگاہ پر چھاپہ مارنے اور شاہ کی میت لے جانے کا منصوبہ بنا رہی ہے (یہ صحیح تھا کیونکہ پولیس شیعوں کو اس ہلاکت سے کوئی فائدہ اٹھانے سے روکنا چاہتی تھی اور امام بارگاہ پر چھاپہ مار کر میت کو لے جانے کا منصوبہ بنایا جا چکا تھا۔) اگر ایسا ہوا تو ایک اور تصادم یقینی ہے۔ جس کے نتیجے میں نہ صرف مسجد' امام بارگاہ اور میت کی بے حرمتی ہوگی بلکہ مزید شیعہ بھی مارے جا سکتے ہیں۔ اس صورت میں آپ لوگ کیا کریں گے؟ پولیس سے مقابلہ کریں گے؟ کیا آپ لوگوں کے پاس اتنی قوت ہے کہ پولیس سے مقابلہ کر سکیں اور شکست دے سکیں؟ دوسرے' اگر پولیس لاش نہ بھی لے جائے تو یہ سخت گرمی کا موسم ہے۔ شاہ کی شہادت 5 بجے کے قریب ہوئی تھی۔ میت چند گھنٹوں میں بو چھوڑنا شروع کر دے گی۔ پولیس پانی کا ایک قطرہ تک فراہم کرنے پر رضامند نہیں ہے۔ میت کو محفوظ کرنے کے لئے برف کہاں سے آئے گی۔ تم کیا کر سکو گے؟ تیسرے یہ کہ اب اس میت سے کسی صورت بھی کوئی مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا' کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ اسے احترام کے ساتھ دفن کر دیا جائے۔ چوتھے' ہمارے لئے شہید کے بھائی کی خواہش کا احترام سب سے مقدم اور ضروری ہے۔ اس سے پوچھیں وہ کیا چاہتا ہے۔"

میری ان باتوں کا اس نوجوان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے شاہ کے بھائی سے بات کی تو وہ بھی میری گفتگو سے سو فیصد متفق تھا۔ اس نے کہا کہ مجھے ٹرانسپورٹ مہیا کر دی جائے تاکہ میں میت لے کر اپنے گاؤں روانہ ہو سکوں۔ اسے بھی خدشہ تھا کہ جونہی وہ میت لے کر امام بارگاہ سے باہر نکلیں گے پولیس میت چھین کر لے جائے گی۔

آئی ایس او کے راہنما کو صورتحال کی نزاکت کا اندازہ ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ نہ تو

ٹرانسپورٹ مہیا کر سکتا ہے اور نہ ہی پولیس کو میت چھیننے سے روک سکتا ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ اس صورتحال میں ہماری کیا مدد کر سکتے ہیں؟ میں نے اسے جواب دیا کہ میں نہ صرف ٹرانسپورٹ فراہم کر سکتا ہوں' بلکہ میت کی باحفاظت روانگی بھی یقینی بنا سکتا ہوں۔ میں اسلام آباد کا رہنے والا ہوں اور میرے ذرائع لامحدود ہیں۔ میں نے بجا طور پر یہ محسوس کر لیا تھا کہ انہیں مدد کی ضرورت ہے اور وہ انتظامیہ کے موڈ سے واقف نہیں ہیں۔

میری اس پیشکش پر نوجوان بولا:

"مجھے مفتی جعفر حسین صاحب سے اجازت لینے دیجئے اور ان کی آئندہ پالیسی کے بارے میں معلوم کر لینے دیجئے" یہ کہہ کر وہ امام بارگاہ سے چلا گیا۔

اس دوران میں شاہد کے بھائی کو اس بات پر قائل کر چکا تھا کہ میری پیشکش مناسب ہے۔ اس نے مجھ سے کہا:

"بھائی! آؤ چلیں میں مزید مشکلات میں پھنسنا نہیں چاہتا۔ میں پہلے ہی اپنے عقیدے اور اسلام کی عظمت پر اپنا بھائی قربان کر چکا ہوں' میں اپنے بھائی کی میت کی بے حرمتی اور تذلیل نہیں چاہتا۔ آپ ٹرانسپورٹ کا انتظام کریں۔ میں امام بارگاہ کے پچھلے دروازے سے میت لے جاؤں گا۔"

میں نے اس سے کہا:

"میں بھی حالات کو مزید خراب ہونے سے بچانا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے ہمیں مفتی صاحب کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہئے' ہو سکتا ہے ان کے پاس کوئی بہتر حل ہو۔" میرا خیال تھا کہ اگر ہم میت کو یوں چوری چھپے لے گئے تو مظاہرین مزید بپھر جائیں گے اور اسے انتظامیہ کی چال قرار دیں گے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہمیں اطلاع ملی کہ مفتی صاحب نے شاہد کی میت لے جانے کی اجازت دے دی ہے' تاہم سیکرٹریٹ گراؤنڈ میں 3 بجے الصبح نماز جنازہ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ میں نے ڈی جی آئی کو ساری صورتحال کی رپورٹ دیتے ہوئے درخواست کی کہ سول ہسپتال سے ایک ایمبولینس یہاں بھجوا دی جائے اور میت کو سرگودھا لے جانے کے لئے ایک ہیلی کاپٹر کا انتظام بھی کیا جائے۔ میں نے زور دے کر انہیں کہا کہ پولیس کو ہر قسم کی مداخلت کرنے سے مکمل طور پر باز رکھا جائے۔ میں نے یہ درخواست بھی کی کہ پولیس کو حکم دیا جائے کہ وہ مظاہرین تک پانی اور خوراک کی سپلائی کو فوری طور پر بحال کر دے۔

معلوم ہوا کہ ڈی جی آئی اور صدر' شہید کی میت کو احترام کے ساتھ تدفین کے سلسلے

میں کیئے گئے اقدامات پر بے حد خوش تھے اور رضاکار تنظیموں کو خوراک اور پانی فراہم کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی تھی۔

ہم نے الصبح 3 بجے مظاہرین کے ساتھ نماز جنازہ لوا کی۔ اس کے بعد میت کو ایمبولینس میں رکھا۔ میں نے شاد کے بھائی سے کہا کہ آپ اپنے ساتھ جتنے افراد چاہیں لے جا سکتے ہیں۔ تقریباً چھ افراد جو ان کے گاؤں کے تھے جانے کے لئے رضامند ہوئے۔ آئی ایس او نے بھی ایک نمائندہ بھیجنے کی خواہش کا اظہار کیا جسے ہم نے تسلیم کر لیا۔ میں نے اپنے ایک آفیسر کو دفن کی رسومات اور شہید کے ورثاء کے لئے 20 ہزار روپے دے کر میت کے ساتھ روانہ کر دیا۔

چند افراد پر مشتمل شہید کا یہ جنازہ سیکرٹریٹ سے دھمیال کیمپ روانہ کیا گیا۔ میں نے دھمیال کے بیس کمانڈر سے جو میرا دوست تھا' ان افراد کی دیکھ بھال اور کھانے پینے کے انتظامات کرنے کے لئے بھی کہا۔ بیس کمانڈر نے ان کی اچھی طرح سے خاطر مدارت کی اور الصبح ایک فوجی ہیلی کاپٹر انہیں لے کر سرگودھا روانہ ہو گیا۔

سرگودھا سے واپسی پر ہمارے افسر نے بتایا کہ ہیلی پیڈ پر مقامی انتظامیہ کے سینئر نمائندے موجود تھے۔ قبر کھودی جا چکی تھی۔ جہاں میت کو انتہائی احترام کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ تاہم سوگوار خاندان نے کسی طرح کی مالی امداد لینے سے صاف انکار کر دیا۔

ہم نے کسی متوقع خونریزی کا راستہ تو روک لیا تھا مگر اصل معاملہ ابھی طے ہونا باقی تھا۔ پوری رات ایسی کوئی صورتحال پیدا نہ ہو سکی جس کی بنیاد پر معاملے کا حتمی فیصلہ کیا جا سکتا۔ انتظامیہ اپنے طور پر یہ خفت محسوس کر رہی تھی کہ وہ امن و امان کی صورتحال کو قابو میں رکھنے میں ناکام رہی تھی۔ اور مظاہرین نے سیکرٹریٹ پر قبضہ کر لیا تھا اور اس خفت نے انتظامیہ کے اندر انتقام کی چنگاری سلگا دی تھی۔ سب سے تشویشناک معاملہ یہ تھا کہ انتظامیہ نے مظاہرین کو پرندوں کی مانند خار دار تاروں کے ایک وسیع و عریض ڈربے میں بند کر دیا تھا۔ اور پولیس اہلکاروں کی انگلیاں اپنی رائفلوں کے ٹریگر دبانے کے لئے بے چین نظر آ رہی تھیں۔

6 جولائی کو سیکرٹریٹ مکمل طور پر بند رہا کیونکہ مظاہرین نے کسی بھی سرکاری ملازم کو عمارت میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ یوں لگتا تھا جیسے پوری حکومت پاکستان کو یرغمال بنا لیا گیا ہے۔ انتظامیہ نے کسی بھی صورتحال سے نمٹنے کے لئے پولیس کے معمول کے طریقہ کار کے مطابق علاقے میں بڑی تعداد میں مزید پولیس فورس جمع کر لی تھی حتیٰ کہ

سیکرٹریٹ کی عمارت کے برآمدوں میں ہلکی مشین گنوں کے ساتھ فوجی بھی پہرا دے رہے تھے۔

میں شاد کی میت دھمیال ایئر فیلڈ روانہ کر کے ابھی گھر پہنچا ہی تھا کہ ڈی جی آئی کا فون آ گیا۔ وہ ہماری کارکردگی پر بے حد خوش تھے۔ انہوں نے کہا:

"صدر صاحب بے حد خوش ہیں' دراصل انہیں اس بات کی امید نہیں تھی کہ اس نازک صورتحال کو اس خوش اسلوبی سے سنبھالا جا سکتا ہے۔ ویل ڈن! تاہم صدر صاحب کا حکم ہے کہ اب آپ جا کر مفتی جعفر حسین سے ملیں اور انہیں صدر صاحب سے براہ راست بات چیت کے لئے ایوان صدر لے آئیں۔ ہم جانتے ہیں کہ شیعوں کے جذبات اس وقت عروج پر ہیں اور وہ مرنے مارنے پر تلے بیٹھے ہیں' مگر مجھے امید ہے کہ آپ مفتی صاحب کو مذاکرات کی میز پر لا سکتے ہیں۔"

یہ سخت امتحان کا وقت تھا۔ کوئی بھی شدید ردعمل یا جنونی فیصلہ امرتسر کے جلیانوالہ باغ کے واقعہ کی یاد تازہ کر سکتا تھا۔ اور ہم اپنی آنکھوں سے خون کا ایک دریا بہتا ہوا دیکھ سکتے تھے۔ زندگی اور موت کے اس کھیل میں اب ساری امیدیں آئی ایس آئی سے وابستہ ہو چکی تھیں۔

اسلام آباد کی فضاؤں میں اذان فجر کی آواز گونج رہی تھی۔ ہم نے فجر کی نماز بھی مظاہرین کے ساتھ ادا کی۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور میں نے خدا کے حضور دعا کی:

"اے میرے اللہ پاکستان کی حفاظت فرما' اپنی خاص رحمت سے مزید خون خرابے کو روک دے۔ یہ قوم کے لئے اور میرے لئے بھی بہت کڑا امتحان ہے' تو ہی کامیابی عطا کرنے والا ہے"

نماز کے بعد میں اس خیمے میں گیا جہاں شیعہ رہنما جمع تھے اور اپنے آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں خاموشی سے مفتی جعفر صاحب کے پاس بیٹھ گیا اور ان سے اپنا تعارف کرایا۔ میں نے انہیں اپنے مرحوم والد صاحب کا نام بھی بتایا جن سے وہ بخوبی آشنا تھے۔ پھر میں انہیں ایک طرف لے گیا اور پوچھا کہ اب آپ کا اگلا قدم کیا ہو گا؟ انہوں نے بتایا کہ میں ابھی کسی اگلے اقدام کے بارے میں حتمی طور پر تو کچھ نہیں کہہ سکتا تاہم سیکرٹریٹ کا محاصرہ مطالبہ پورا ہونے تک جاری رکھا جائے گا۔ محمود ہارون اور جنرل صغیر سے اپنی گذشتہ روز کی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ انتظامیہ نے ہماری توہین

کی ہے۔ ہمیں ڈرایا دھمکایا ہے اور سخت نتائج کی دھمکی دی ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ ہم پہلے ہی اس سلسلے میں سینکڑوں خطوط اور یادداشتیں صدر اور گورنر صاحب کو روانہ کر چکے ہیں مگر انہیں قابل توجہ ہی نہیں سمجھا گیا مگر "اب" انہوں نے زور دے کر کہا "اگر صدر صاحب بات کرنا چاہتے ہیں تو انہیں یہاں آنا پڑے گا۔" پھر وہ کچھ رک کر بولے' "مگر اب بات کرنے کو رہ کیا گیا ہے۔ ہمارے مطالبات بالکل صاف اور واضح ہیں اور تحریری طور پر ان کے پاس موجود ہیں۔ حتیٰ کہ صدر صاحب خود کئی بار یہ کہہ چکے ہیں کہ "اپنی فقہ مت چھوڑو دوسروں کی فقہ مت چھیڑو۔" مگر اب وہ فقہ جعفریہ کے ساتھ یہ کھیل کیوں کھیل رہے ہیں؟ اب وہ ایوان صدر سے ہمارے مطالبات ماننے کا اعلان کر دیں اور ہم گھروں کو چلے جائیں گے"

اتفاق سے اسی روز لاہور میں وکلاء کا کنونشن ناکام ہو گیا تھا اور مفتی صاحب پر بھی شدید قسم کا سیاسی دباؤ تھا۔ بے چین اور بے قرار سیاسی عناصر شیعوں کی اب تک کی کامیابی کو ہائی جیک کرنا چاہتے تھے۔ بہت سی سیاسی جماعتوں کے نمائندے یہاں آکر مفتی صاحب کو روپے پیسے' اسلحہ' خوراک' افرادی قوت اور دیگر امداد کی پیشکش کر چکے تھے۔ وہ جنرل ضیاء کے خلاف اپنے موقف پر ڈٹے رہنے پر انہیں ہر طرح کی اخلاقی مالی اور سیاسی امداد دینے کے لئے تیار تھے۔ ان کا نعرہ تھا:

"گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور دو!"

مفتی صاحب صورتحال کا پورا ادراک رکھتے تھے اور انہوں نے اس خالصتاً" مذہبی معاملے میں کسی کو کسی طرح کی سیاسی مداخلت کی اجازت دینے سے یکسر انکار کر دیا۔

میں نے مفتی صاحب سے درخواست کی کہ آپ اگلے کسی بھی اقدام سے پہلے میرا انتظار کریں۔ میں کافی فاصلے پر کھڑی اپنی کار تک گیا' وہاں سے ڈی جی آئی سے وائرلیس پر رابطہ کیا اور انہیں شیعہ راہنماؤں کے مطالبات' سوچ اور جذبے سے آگاہ کیا۔ ڈی جی آئی نے کہا کہ "صدر معاملے کو بخیر و خوبی طے کرنے کے لئے مفتی صاحب سے بات چیت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ کسی طرح مفتی صاحب کو ایوان صدر لے آئیں' مذاکرات وہاں ہوں گے' اس طرح مطالبات کی منظوری کا اعلان نہیں ہو سکتا"۔

میں واپس مفتی صاحب کے پاس پہنچا اور انہیں بتانے کی کوشش کی کہ "میں حکومت کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ گھیراؤ سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا اور مسئلے کا حل صرف مذاکرات سے ہی نکلے گا' لہٰذا عدم تعاون کا رویہ اپنانے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ صدر صاحب نے

خود مذاکرات کی خواہش ظاہر کی ہے' وہ ضرور اس مسئلے کا حل نکالیں گے۔ آپ برائے مہربانی میرے ساتھ آیئے میں خود آپ کو صدر صاحب تک لے جاتا ہوں۔"

مجھے لگ رہا تھا کہ مفتی صاحب کو میری بات کا یقین آگیا تھا اور وہ مجھ پر یہ اعتماد کرنے کے لئے تیار تھے کہ میں ان کے ساتھ مسٹر محمود ہارون اور جنرل صغیر حسین والا سلوک نہیں کروں گا۔ تاہم مزید گفت و شنید ہوتی رہی اور وہ بالآخر میرے ہمراہ پریذیڈنسی تک جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ ہم واپس اس خیمے میں گئے جہاں دیگر شیعہ زعماء تشریف فرما تھے۔ انہوں نے ان سے میرا تعارف کرایا اور میری پیشکش ان کے سامنے دہرائی جو صدر پاکستان کے ایماء پر میں نے ان سے کی تھی۔ سب نے اس پیشکش پر سیر حاصل بحث کی اور بالآخر صدر سے بات چیت پر آمادہ ہو گئے۔

چار دیگر شیعہ معززین سید گلاب شاہ' صفدر حسین نجفی' لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) سید فدا حسین اور شبیر حسین ایڈووکیٹ نے بھی ان اہم مذاکرات میں شرکت کے لئے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ صورتحال کی نزاکت کا اندازہ لگاتے ہوئے میں نے مفتی صاحب سے درخواست کی کہ آپ اپنے نعم البدل کے طور پر کسی نرم خو شیعہ راہنما کو یہ ذمہ داری سونپ کر جائیں کہ وہ آپ کی عدم موجودگی میں مظاہرین کو کنٹرول میں رکھیں تاکہ مظاہرین کسی بھی موقعہ پر تشدد پر آمادہ نہ ہوں اور سیکرٹریٹ کی عمارت میں پہرا دینے والے فوجیوں پر خشت باری سے گریز کریں۔

ہم نے ڈی جی آئی کو فوراً اطلاع دی کہ ہم مفتی صاحب کی قیادت میں ایک شیعہ وفد لے کر ایوان صدر پہنچ رہے ہیں۔ میں نے ان سے یہ درخواست بھی کی کہ آپ سول انتظامیہ کو سختی سے ہدایات دیں کہ ہماری واپسی تک یا مذاکرات کے دوران وہ طاقت کے استعمال سے کلی طور پر گریز کرے اور پانی' خوراک کی سپلائی بھی پھر سے بحال کر دے جو ایک بار پھر منقطع کی جا چکی ہے۔ ڈی جی آئی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں مفتی جعفر اور ان کے ساتھیوں کو مذاکرات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ انہوں نے وائرلیس پر ایک بار پھر مجھ سے پوچھا کہ آپ مفتی صاحب کو اچھی طرح پہچانتے ہیں یا نہیں؟ میں نے پھر انہیں یقین دلایا کہ میں مفتی صاحب کو پہچانتا ہوں اور مفتی جعفر حسین ہی اس وفد کے سربراہ کے طور پر میرے ساتھ آ رہے ہیں مگر اس کامیابی پر جنرل اختر کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

جونہی ہم ایوان صدر پہنچے وہاں موجود ہر شخص ہمیں دیکھ کر حیران تھا اور مفتی صاحب

کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ایوان صدر کے مکینوں کے سر سے کوئی بڑا بوجھ ٹل گیا ہو۔ مفتی صاحب کا حلیہ اور شخصیت دیکھ کر انہیں مزید حیرت ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ کوئی سخت گیر اور جابر شخصیت ہوں گے۔ جن کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہو گا اور ان کی کمر کے ساتھ برہنہ تلوار لٹک رہی ہو گی۔ مفتی صاحب کی منحنی اور قابل احترام شخصیت اور سراپا سادگی' ان کے لئے انتہائی حیرت کا باعث تھی۔

صدارتی ٹیم ہماری آمد کے ساتھ ہی فوری طور پر ایوان صدر پہنچ گئی۔ یہ لوگ یقیناً دیر سے گھروں کو گئے ہوں گے اور صبح سویرے انہیں ان مذاکرات کی توقع نہیں ہو گی۔ مجھے صدر کے چیف آف سٹاف کے کمرے میں بلایا گیا۔ جنرل کے ایم عارف' غلام اسحاق خان' محمود ہارون' ڈاکٹر افتیاز' جنرل مجیب اور کرنل صدیق سالک بھی اس کمرے میں موجود تھے۔ جنرل عارف نے مجھ سے پوچھا کہ آپ نے مفتی صاحب کو کس قسم کی یقین دہانیاں کرائی ہیں؟ ان کا خیال تھا کہ شاید میں مفتی صاحب سے فقہ جعفریہ کے نفاذ کا سودا کر چکا ہوں یا حکومت کی پالیسی کے خلاف ان سے کوئی وعدے وعید کر آیا ہوں۔ انہیں شاید اس بات کا ادراک نہیں تھا کہ آئی ایس آئی کا طریقہ کار کیا ہے اور ہم کس طرح اپنے اعلیٰ حکام کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ میں نے جواب دیا "جنرل اختر کی جانب سے مجھے دیا جانے والا مشن انتہائی واضح تھا۔ میں نے مفتی جعفر کو دو یقین دہانیاں کرائی ہیں۔ پہلی یہ کہ صدر اس ٹیم کے ساتھ مذاکرات کریں گے اور دوسرے یہ کہ مذاکرات کامیاب ہوں یا ناکام میں دونوں صورتوں میں' مفتی صاحب کو واپس وہاں پہنچاؤں گا جہاں سے میں انہیں لایا ہوں" میرے اس جواب پر جنرل عارف نے اطمینان کا سانس لیا۔

طویل مذاکرات اور متعدد دستاویزات کی تیاری کے بعد' بالآخر شام تک ایک حتمی معاہدہ طے پا گیا' جس میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ جو پاکستانی بھی ایک جوڈیشل پیپر پر یہ بیان حلفی دے گا کہ اس کا تعلق فقہ جعفریہ سے ہے زکوٰۃ اور عشر آرڈیننس کے تحت وہ زکوٰۃ اور عشر کی ادائیگی سے مستثنیٰ ہو گا۔ مذاکرات کے اختتام پر درج ذیل سرکاری پریس نوٹ بھی جاری کیا گیا:

پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

راولپنڈی 6- جولائی

صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی دعوت پر شیعہ راہنماؤں کے ایک وفد نے مفتی جعفر حسین کی قیادت میں آج چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سیکرٹریٹ میں صدر سے ملاقات کی۔ ان کے ہمراہ وفد کے دوسرے ارکان یہ تھے۔

مولانا سید گلاب شاہ' مولانا سید صفدر حسین نجفی' لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) سید فدا حسین نقوی اور سید شبیر حسین ایڈووکیٹ۔

شیعہ وفد کا نقطہ نظر سننے کے بعد صدر نے اپنی سابقہ یقین دہانی کو دہرایا کہ ملک کے ہر شہری کے مذہبی عقائد کا پورا پورا احترام کیا جائے گا اور کسی ایک فرقے کی فقہ دوسرے پر مسلط نہیں کی جائے گی۔ شیعہ لیڈروں کے خدشات کو رفع کرتے ہوئے صدر مملکت نے کہا کہ وہ اہل تشیع سے کئے ہوئے وعدے پر قائم ہیں اور وہ اسے اس کی روح کے مطابق عملی جامہ پہنانے کے لئے ضروری اقدامات کریں گے۔

صدر مملکت نے مزید کہا کہ اگر کوئی قانون اس سے پہلے اس وعدے کے منافی نافذ ہو چکا ہے تو اس میں ضروری ترمیم کر دی جائے گی' تاکہ وہ اہل تشیع کے لئے فقہ جعفریہ سے ہم آہنگ ہو جائے' انہوں نے یہ بھی یقین دلایا کہ مستقبل میں اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ ہر نئے قانون میں اہل تشیع کے لئے فقہ جعفریہ ملحوظ رہے۔ اس سلسلے میں ضروری قانون 15 ستمبر 1980ء تک بنا دیا جائے گا۔

مفتی جعفر حسین نے صدر مملکت کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اپنے سابقہ وعدے کا اعادہ کیا۔

مفتی صاحب نے یہ بھی یقین دلایا کہ اسلام آباد میں جو اہل تشیع جمع ہیں وہ انہیں مشورہ دیں گے کہ وہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔

دستخط	دستخط
مفتی جعفر حسین	محمود اے ہارون
	وزیر مذہبی امور

جنرل اختر اپنی ٹیم کی اس شاندار کارکردگی پر بے حد نازاں اور خوش تھے۔ اگلے روز سٹاف میٹنگ کے دوران انہوں نے کہا یہ بہت ہی نازک موقعہ تھا۔ تمام دنیا کی نظریں پاکستان پر لگی ہوئی تھیں اور لوگ ایک ایک لمحہ گن رہے تھے' پاکستان کا سرکاری نظام منجمد ہو گیا تھا' سرکاری مشینری مفلوج ہو چکی تھی' لیکن آئی ایس آئی نے اپنے فرض سے بڑھ کر کام کیا' صدر پاکستان آئی ایس آئی کی کارکردگی پر بے حد خوش ہیں اور انہوں نے ان الفاظ میں

ہمیں خراج تحسین پیش کیا ہے:

"مجھے امریکہ کے سفیر نے پیغام دیا کہ آج پاکستان کو بچا لیا گیا ہے۔"

ہم نے بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ ہماری کوششوں سے نہ صرف پاکستان کی سلامتی کو درپیش خطرہ ٹل گیا بلکہ بہت بڑی خون ریزی کو بھی روک دیا گیا۔ شکر الحمدللہ۔ اسے کہتے ہیں غیبی امداد' ورنہ ہم کیا اور ہماری حقیقت کیا۔



شہنشاہی فیصلہ

جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے دور میں بیش کے نام سے مشہور' ایک بریگیڈیئر مارشل لاء ہیڈ کوارٹرز پنجاب میں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد اقبال کے بریگیڈیئر مارشل لاء تھے۔ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے پرنسپل سٹاف آفیسر اور بریگیڈیئر مارشل لاء ہونے کی بناء پر ان کی خاصی اہمیت تھی اور انہیں خاصا بااثر سمجھا جاتا تھا۔ جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد جب گرد و غبار چھٹنا شروع ہوا اور معاملات فوجی حکمرانوں کے قابو میں آنے لگے تو نہ صرف مارشل لاء حکام کی سرگرمیوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا بلکہ ان کے رفقاء اور دوستوں کا حلقہ بھی بڑھنا شروع ہو گیا۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب موقع پرست حالات سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ بہت سے کرپٹ' مفاد پرست اور موقع کی تاک میں رہنے والوں نے مارشل لاء کی مرکزی قیادت سے راہ و رسم بڑھانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ایسے مواقع خاص طور پر پیشہ ور دھوکے بازوں اور ملمع سازوں کے لئے بڑے سنہری ہوتے ہیں اور اکثر اوقات وہ اپنے شاندار تجربے کی بناء پر کوئلے کو بھی چمکدار ہیرا ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی جعلسازی کا جال اپنے ہدف پر اس طرح ڈال دیتے ہیں اور اسے باتوں باتوں میں اس طرح پھانس لیتے ہیں کہ اس کے لئے اچھے برے اور غلط اور صحیح کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے۔

کچھ ایسی صورتحال ہمارے بریگیڈیئر بیش کو درپیش تھی۔ ان کے گرد بھی "کاریگروں" نے ایسا گھیرا ڈالا کہ وہ بہت تھوڑے عرصے میں اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھے۔ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے اس مطلق العنان عہدے نے انہیں بلا شرکت غیرے ایسی اتھارٹی کا مالک بنا دیا کہ وہ اپنے عہدے کی وجہ سے جس قدر چاہتے مالی یا سماجی فوائد حاصل کر لیتے۔ وہ موقع پرست لوگ جنہوں نے انہیں اس راہ پر ڈالا تھا ان کے طفیل خود بھی خاصے لمبے مالی فوائد حاصل کر رہے تھے۔ بریگیڈیئر ایم ایل' کے یہ دوست بلیک میلنگ' اپنے مخالفین کی پگڑیاں اچھالنے اور انہیں ہراساں اور پریشان کرنے کے ساتھ ساتھ ہر غیر قانونی اور غیر انسانی ہتھکنڈا استعمال کر رہے تھے۔ ہمیں پولیس کی وساطت سے اس گروپ کی بعض غیر اخلاقی حرکات کی اطلاعات بھی ملیں' خاص طور پر لاہور اسمبلی چیمبر میں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ہیڈ کوارٹرز

میں تعینات ایک لیڈی پولیس انسپکٹر کے ایسی ہی حرکات میں ملوث ہونے کی ہمیں متعدد بار اطلاع مل چکی تھی۔ یہ خاتون اپنے فرائض منصبی کو بھلا کر اس پورے گروپ کے لئے فرنٹ پرسن کا کردار ادا کر رہی تھیں۔ اس گروپ کے متاثرین شدید قسم کی پریشانیوں کا شکار تو تھے مگر خوف اور لاعلمی کی وجہ سے وہ شکایت کرنے سے بھی گریزاں تھے۔ ہمارے مقامی آفس نے اس گروپ کی سرگرمیوں کے بارے میں ایک مفصل رپورٹ تیار کی جسے شواہد کے ساتھ جی ایچ کیو کو بھجوا دیا گیا۔

چند ماہ بعد جی ایچ کیو میں پروموشن بورڈ کا اجلاس تھا۔ ہمارے ڈی جی آئی جنرل ریاض نے اس رپورٹ کی روشنی میں تجویز کیا کہ بریگیڈیئر بیگ کو ترقی نہ دی جائے کیونکہ ان کے خلاف غیر اخلاقی اور فوجی ڈسپلن کے خلاف کارروائیوں کے شواہد موجود ہیں۔

بعدازاں ہمیں جنرل ریاض نے بتایا کہ اس موضوع پر انتہائی گرم بحث ہوئی اور آئی ایس آئی کے بارے میں روایتی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے بورڈ کے متعدد ارکان نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی مگر جنرل ریاض اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ جنرل ضیاء بحیثیت چیف آف آرمی سٹاف اس میٹنگ کی صدارت کر رہے تھے۔ بالآخر انہوں نے فیصلہ سنایا کہ ہم عارضی طور پر بریگیڈیئر بیگ کو اگلے عہدے پر ترقی دے دیتے ہیں مگر اس وقت تک اس کی کنفرمیشن نہیں ہو گی جب تک آئی ایس آئی ہمیں اس کے بارے میں دوبارہ چھان پھٹک کر کے حتمی رپورٹ نہیں دیتی۔ انہوں نے حکم دیا کہ آئی ایس آئی کے کسی سینئر آفیسر کو اس کام پر لگایا جائے اور ایک ماہ کے اندر مجھے مکمل رپورٹ دی جائے۔

ڈی جی آئی نے اس رپورٹ کے ایک ایک نقطے پر مجھ سے تفصیلی گفتگو کی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ خود لاہور جائیں اور مکمل رپورٹ تیار کریں۔ انہوں نے مجھے یہ بھی حکم دیا کہ آپ لاہور میں آئی ایس آئی کے کسی آفیسر یا عملے کے کسی آدمی سے رابطے نہیں کریں گے اور نہ ہی سرکاری ٹرانسپورٹ استعمال کریں گے بلکہ اپنے طور پر غیر جانبداری سے تحقیقات کریں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہماری یہ رپورٹ غلط ہے تو ہمیں معافی نامہ بھجوانے میں کوئی عار محسوس نہیں ہو گی' ہمیں صرف اور صرف حقیقت کا کھوج لگانا ہے۔

میں فوری طور پر لاہور پہنچا اور رپورٹ میں دیئے گئے ایک ایک واقعہ سے متعلق افراد سے ذاتی طور پر ملا۔ اندرون شہر چھوٹی چھوٹی گلیوں میں' قبضہ کی گئی زمینوں پر' جھوٹے مقدمات میں ملوث کئے گئے لوگوں سے اور غنڈہ ٹیکس دینے والوں' غرض ہر متعلقہ شخص سے میں نے موقع پر پہنچ کر تفصیلی گفتگو کی۔ رپورٹ کرنے والے پہلے تو گھبرائے کیونکہ وہ حیران تھے کہ کیا مارشل لاء والوں کے چیلوں پر بھی ہاتھ ڈالا جا سکتا ہے۔ لیکن بعد میں انہوں نے

سچ باتیں کہہ دیں۔ ہمارے علم میں لائے گئے تمام واقعات حرف بہ حرف درست نکلے۔ میں نے اپنی انکوائری کے دوران ان خرافات کے بارے میں مزید تفصیلات بھی نوٹ کیں اور متاثرین اور گواہوں کے بیانات خفیہ طور پر ٹیپ ریکارڈ بھی کر لئے۔ بہرحال میں نے مقررہ مدت میں رپورٹ ڈی جی آئی کو پیش کر دی۔

ادھر صورتحال یہ تھی کہ بورڈ کے اجلاس کے فوراً بعد مختلف لوگوں کو ان کی ترقی کے بارے میں اطلاعات مل چکی تھیں اور لاہور میں بریگیڈیئر بیٹھ کے دفتر اور گھر میں تحفوں کے انبار لگ رہے تھے۔ ان کے دوستوں کی جانب سے مبارکباد کے تار اور ٹیلی فون آ رہے تھے اور دوستوں نے انہیں جنرل صاحب کہہ کر پکارنا شروع کر دیا تھا۔

بہرحال ہم نے اپنی رپورٹ صدر صاحب کو روانہ کر دی۔ چند روز کے بعد مجھے ڈی جی آئی نے کہا کہ پنجاب کے ایم ایل اے، جنرل اقبال اسلام آباد آئے ہوئے ہیں اور وہ بریگیڈیئر بیٹھ کے کیس کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں لہٰذا تم جا کر ان سے مل لو۔

میں جنرل اقبال سے ملا۔ انہیں اس کیس پر بریفنگ دی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ نے یہ ساری تحقیقات خود کی ہیں؟ میں نے انہیں ٹیپ کی ہوئی گفتگو کے کچھ حصے سنا دیئے جن میں مظلوم شہری اپنی داستان بیان کر رہے تھے۔ اور انہیں بعض ایسے واقعات بھی بتائے جنہیں رپورٹ میں لکھتے ہوئے مجھے خود شرم آ رہی تھی۔ لہٰذا وہ رپورٹ میں شامل نہیں کئے گئے تھے۔ بالآخر انہیں ہماری رپورٹ پر یقین آ گیا۔ تاہم انہوں نے کہا "مجھے حیرت ہے کہ وہ یہ سب میری ناک کے نیچے کرتا رہا اور مجھے خبر نہ ہوئی۔ وہ میرے دفتر کے ساتھ والے کمرے میں بیٹھتا تھا اور ہم تقریباً چوبیس گھنٹے اکٹھے ہوتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے جب سے مارشل لاء لگا ہے ہم آدھی رات سے پہلے کبھی گھر نہیں گئے۔ بہرحال آپ کا شکریہ۔"

جب بریگیڈیئر بیٹھ کو علم ہوا کہ ان کی ترقی روک دی گئی ہے، تو انہوں نے ہتک محسوس کرتے ہوئے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کی درخواست دے دی۔ صدر جنرل ضیاء الحق نے فوری طور پر ان کی درخواست منظور کر لی، انہیں پوری پنشن اور مراعات کے ساتھ ریٹائر کر کے ایک کارپوریشن کا چیئرمین لگا دیا گیا۔ اب اس کی پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں تھا۔ یہ تھا شہنشاہی فیصلہ۔

○

اسلامی جمہوریہ ایران

اسلامی جمہوریہ ایران کی سرزمین پر

میرے ایک سینئر آفیسر جو میرے کرم فرما اور مہربان بھی تھے اور جنہیں اسلام آباد کے ایوان اقتدار تک خاصی رسائی حاصل تھی' ایک دن میرے ہاں تشریف لائے اور معمول کے مطابق خیریت و عافیت دریافت کرنے کے بعد مجھ سے پوچھا کہ ان دنوں آپ کی مصروفیات کیا ہیں اور آپ کیا کرتے ہیں؟ کیا کسی خاص مشن پر کام کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ میں نے جواب دیا کہ کوئی خاص کام نہیں ہے۔ آجکل تو نارمل روٹین چل رہی ہے۔ وہ میرا جواب سن کر مسکرائے اور کہنے لگے "لگتا ہے تم نے "فرینڈز" کو ناراض کر لیا ہے (افغانستان میں پاک امریکہ مشترکہ حکمت عملی کی وجہ سے آئی ایس آئی میں گفتگو کے دوران امریکیوں کو "فرینڈز" کہا جاتا تھا) میرے اصرار پر انہوں نے بتایا کہ "فرینڈز" کا خیال ہے کہ تم ان کے کاموں میں رکاوٹیں پیدا کر رہے ہو' ان کو کام نہیں کرنے دیتے' اس لئے اب ان کے لئے ناقابل برداشت ہو چکے ہو۔ میرا مشورہ ہے کہ بیشتر اس کے کہ تلوار تمہارے سر پر آگرے تم اپنے لئے کوئی اور نوکری تلاش کر لو۔"

یہ درست ہے کہ ہماری کوشش یہ تھی کہ فرینڈز کی "دوستی" اور رابطہ صرف افغانستان کے معاملات تک ہی محدود رہے اور وہ اپنا جاسوسی کا نیٹ ورک ہمارے اندر تک نہ پھیلا سکیں۔ ان کے رابطے صرف چند مخصوص جگہوں اور آفیسرز تک محدود رہیں اور وہ دوستی کے لبادے میں پاکستان میں ہر جگہ نہ دندناتے پھریں۔ امریکی' افغانستان میں روسی افواج کے خلاف مجاہدین کی مدد ضرور کر رہے تھے' لیکن انہیں اپنا مفاد اس سے زیادہ عزیز تھا اور وہ اس خطے میں اپنے سیاسی' فوجی اور معاشی مقاصد حاصل کرنے کے لئے ایک خاص حکمت عملی پر کام کر رہے تھے۔ ہمیں بھی اپنی قومی حمیت اور تشخص عزیز ہے اور ہم اسے ہر قیمت پر قائم رکھنے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ ہمیں یہ بھی احساس تھا کہ سی آئی اے کی قوت کے سامنے ہمارے وسائل بہت محدود ہیں' پھر بھی ہم سے جو کچھ ہو سکتا تھا' کر رہے تھے' لیکن یہ بھی انہیں ناگوار گزر رہا تھا اور وہ "ماسٹرز" بن کر رہنا چاہ رہے تھے۔ ان نازک اور حساس حدود کو متعین کرنا مشکل تھا اور باوجود بسیار احتیاط کے' کہیں نہ کہیں ٹکراؤ ہو ہی جاتا تھا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ امریکی ہمارے حکمرانوں' فوجی قیادت' بیوروکریسی اور کچھ سیاستدانوں پر خاصا اثر رکھتے ہیں اور اپنی مرضی کے فیصلے کروا لیتے ہیں' ہمارے معاشی' معاشرتی' سماجی اور دفاعی سیٹ اپ کا شاید ہی کوئی حلقہ ایسا ہو جہاں امریکہ نے چاہا ہو اور اپنا نمک خوار پیدا نہ کر لیا ہو۔ چنانچہ ہمیں اس محاذ پر بھی اپنا موثر دفاع کرنا تھا۔

ہمیں یہ بھی احساس تھا کہ اس "جن" کے خلاف ہماری کارروائیاں صرف ایک سوئی چبھونے کے مترادف ہیں۔ مگر ان میں قوت برداشت اور حوصلہ بہت کم ہے' وہ ذرا سی مزاحمت بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

میرے مہربان جنرل کے کہنے سے مجھے احساس ہو گیا تھا کہ اب آئی ایس آئی میں میرے دن کم ہی رہ گئے ہیں کیونکہ باتوں باتوں میں جنرل اختر نے بھی مجھے چند مرتبہ کہا تھا:

"تم اتنا کام کرتے ہو' میرا خیال ہے تم تھک چکے ہو گے اور بہتر ہو گا کہ تمہیں اب کوئی ہلکی پھلکی ڈیوٹی دے دی جائے۔" مگر میں نے ہر بار عرض کی:

"کیا میرے کام میں آپ کو کوئی کوتاہی یا سستی نظر آئی؟ میں بالکل نہیں تھکا ہوں بلکہ ابھی تو میں نے انٹیلی جنس کی الف بے سیکھی ہے اور مجھے کام کا کچھ کچھ پتہ چل رہا ہے' مزید تجربے سے شاید میری کارکردگی آپ کے معیار کے مطابق ہو جائے۔"

پچھلے پانچ سال سے ایک ہی کام کرتے کرتے مجھے احساس ہو چلا تھا کہ شاید اب میں فوج کے کسی اور شعبہ میں کام کرنے کے قابل نہیں رہا۔ میرا اوڑھنا بچھونا' جاگنا سونا' زمین آسمان صرف آئی ایس آئی تھا۔

ایک مرتبہ جنرل اختر نے پھر کہا:

"میرا خیال ہے تم نے موجودہ حیثیت میں خاصا کام کر لیا ہے۔ تم اپنی فیملی کو کتنا وقت دیتے ہو؟ میں نے یہ کبھی نہیں سنا کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ شاپنگ کرنے گئے تھے۔ تمہیں پتہ ہے تمہارے بچے کس کس کلاس میں پڑھتے ہیں؟ میرا خیال ہے تمہیں اب کسی ہلکی ذمہ داری کی ضرورت ہے تاکہ تمہاری تھکن کچھ دور ہو جائے۔"

مجھے چونکہ صورتحال کا پہلے ہی سے علم تھا لہٰذا جنرل اختر کی یہ گفتگو میری تفریح طبع کے لئے کافی تھی۔ میں نے پھر کہا:

"سر! کیا میں واقعی آپ کو تھکا ہوا دکھائی دیتا ہوں؟ کیا آپ نے میرے فرائض کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی دیکھی ہے؟ یہاں ایسے آفیسر بھی موجود ہیں جو مجھ سے عمر اور عہدے میں بڑے ہیں اور انہوں نے اپنی آدھی زندگیاں اسی محکمے میں گزار دی ہیں۔ میں اپنی ڈیوٹی سے مطمئن ہوں تاہم آپ جہاں حکم کریں گے میں چلا جاؤں گا۔"

بہرحال مجھے صرف احکامات کی تعمیل کرنا تھی اور سینئرز کے کسی بھی حکم کو چیلنج کرنا میرے پیشے کی کتاب میں نہیں ہے۔ مجھے جنرل اختر کی مجبوری کا بھی اندازہ تھا۔ مجھ سے جان چھڑانا ان کے لئے آسان نہ تھا۔ میری ٹرانسفر کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اول یہ کہ میری ٹیم نے صدر یا ڈی جی آئی کی جانب سے ملنے والے ہر مشن کو پورا کیا اور ہم اب تک دشمنوں کے لئے خوف کی علامت بن چکے تھے۔ دوسری یہ کہ اب تک جو چھوٹی بڑی بات بھی ہمارے نوٹس میں آئی' ہم نے ایمانداری سے اسے اوپر رپورٹ کر دیا۔ تیسرے جہاں تک فنڈز کا تعلق تھا' میرا اسٹاف آفیسر میجر لطیف ایس ایس فنڈز کی ایک ایک پائی کا حساب رکھتا تھا اور انہیں باقاعدگی کے ساتھ آڈٹ کے لئے بھی پیش کیا جاتا تھا۔ جہاں 300 روپے سے زیادہ خرچ کرنا لازمی ہوتا' اس کی اجازت پیشگی لے لی جاتی تھی۔ پھر آئی ایس آئی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد میرے اور میرے خاندان کے لائف سٹائل میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ میرے پاس اس وقت بھی وہی 1963ء ماڈل کی کورٹینا کار تھی جو میں نے 1970ء میں خریدی تھی' پھر ہر سال ہم اپنے تمام اثاثوں کی تفصیل بھجواتے تھے۔ الحمدللہ کسی جگہ بھی کسی شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ویسے بھی میں جنرل اختر عبدالرحمٰن کے ساتھ 1965ء کی جنگ سے ایک طویل اننگز کھیل رہا تھا۔ وہ "فرینڈز" کی بات مان تو سکتے تھے' لیکن مجھے یقین تھا کہ میرے ساتھ انصاف ضرور کریں گے۔

یہ 1981 کا زمانہ تھا' ایران عراق جنگ زوروں پر تھی' انہی دنوں صدر اور ڈی جی آئی بعض دیگر سربراہان مملکت کے ساتھ اسلامی ممالک کی تنظیم OIC کے امن مشن کے ارکان کی حیثیت سے بغداد اور تہران گئے۔ واپسی پر مجھے ڈی جی آئی نے بتایا کہ صدر صاحب بغداد اور تہران میں اپنے سفارتخانے کی کارکردگی سے سخت مایوس ہوئے ہیں اور انہوں نے حکم دیا ہے کہ ان دونوں سفارتخانوں میں فوری طور پر اہم اور قابل افراد کو تعینات کیا جائے۔ تہران سے نیول اینڈ ڈیفنس اتاشی کیپٹن اکبر حسین خان اور فوجی اتاشی کرنل حبیب خان کو واپس بلایا گیا اور ڈی جی آئی نے مجھے حکم دیا کہ میں تہران میں فوراً ڈیفنس اینڈ آرمی اتاشی کے طور پر رپورٹ کروں۔ یہ میرے لئے اعزاز کی بات تھی کہ میری خاطر نہ صرف اس پوسٹ کو اپ گریڈ کیا گیا تھا بلکہ اسے نیوی سے آرمی کوٹے میں منتقل بھی کر دیا گیا تھا اور سلیکشن کی مروجہ راہوں سے گزرے بغیر میری تعیناتی ہوئی تھی۔

روانگی سے پہلے مجھے ڈی جی آئی سے ایک مختصر سی بریفنگ ملی' انہوں نے کہا "اسرائیلی اور بھارتی خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے ایران کے ساتھ ہماری دوستی انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ ہمیں نہ صرف مستقبل کے لئے ایران میں دوستی کی انوسٹمنٹ کرنی ہے"

بلکہ 1965ء اور 1971ء کی جنگوں کے دوران ایران نے جس طرح ہمارا ساتھ دیا ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ ہم اسے ہمیشہ یاد رکھیں اور اب ان کی مدد کریں۔ ہمیں نہ صرف زمانہ امن میں ایران کی ضرورت ہے بلکہ بھارت کے ساتھ سیاسی اور فوجی تنازعات کے سلسلے میں بھی ہمارے لئے یہ دوستی بے حد اہم ہے۔ تاہم ایران میں صورتحال خاصی نازک ہے۔ ملک میں انقلاب آ چکا ہے۔ ہمیں ابھی تک نہ ہی انقلاب کے لیڈروں کی پہچان ہے اور نہ ہی انقلاب کے رخ کا علم۔ انہیں جنگ اور اندرونی خلفشار کا بھی سامنا ہے۔ یہ دونوں باتیں ہمارے لئے توجہ کی طالب ہیں۔ ایران کے ساتھ ہمارے تعلقات خاصے کمزور ہو چکے ہیں۔ ہمارا محکمہ خارجہ ایران کے حالات سے بالکل بے خبر ہے اور ایران سے کٹا ہوا ہے۔ یہی صورتحال ہمارے بارے میں ایران میں بھی ہے۔ تعلقات میں ایک خلیج پیدا ہو رہی ہے اور غلط فہمیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ صدر صاحب کو تہران میں ہماری پوزیشن پر شدید تشویش لاحق ہے۔ جس کا اظہار انہوں نے ہمارے تہران میں قیام کے دوران بار بار کیا' وہ سفارتخانے اور خاص طور پر اس کے ڈیفنس ونگ کی کارکردگی کے بارے میں خاصے متفکر ہیں۔ ایران عراق جنگ ہمارے لئے' اور خاص طور پر علاقے کے لئے بہت سی مشکلات کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ ہمیں ایک ایک منٹ کی خبر رکھنا ہو گی۔ پاکستان کے بارے میں ایران کی رائے کچھ اچھی نہیں ہے۔ تمہیں ان حالات میں بہت کچھ کرنا ہو گا تاکہ دونوں ممالک کے مراسم پھر سے مضبوط ہو سکیں۔ صدر صاحب نے اس عہدے کے لئے ایک بہت لمبی فہرست میں سے تمہیں منتخب کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تم اس کام کے لئے موزوں ترین شخص ہو۔ آئی ایم سوری! میں تمہیں کوئی آرام والی ذمہ داری سونپنا چاہتا تھا مگر مجھے افسوس ہے کہ یہ بھی ایک سخت اور تھکا دینے والی ڈیوٹی ہے' مگر مجھے یقین ہے کہ تم اس کے لئے انتہائی موزوں انتخاب ہو۔ تمہاری روانگی سے قبل صدر صاحب بھی تمہیں بریفنگ دیں گے۔ مجھے تم پر مکمل بھروسہ اور اعتماد ہے۔ اب جاؤ اور جلد از جلد روانگی کے لئے تیار ہو جاؤ!"

یہ کام بالکل سفارتی سطح کا تھا اور اس میں انٹیلی جنس کا قطعا" کوئی رول نہیں تھا' مجھے صرف کھلے عام سفارتی تعلقات کو آگے بڑھانا' ان کی بات کو سمجھنا اور اپنی بات کو ان تک پہنچانا تھا۔ میں چند ہی دنوں میں تہران روانہ ہو گیا۔ ڈی جی آئی نے کرنل امتیاز کو جو اس وقت کراچی میں ہمارے ڈی ٹیچمنٹ کمانڈر تھے میری جگہ تعینات کر دیا۔ یہی کرنل امتیاز بعد ازاں "امتیاز بلا" کے نام سے مشہور ہوئے اور 1990ء سے 1993ء تک میاں نواز شریف کے دور میں ڈائریکٹر جنرل انٹیلی جنس بیورو رہے۔

پاک ایران تعلقات

روایتی طور پر پاکستان اور ایران کے درمیان ہمیشہ خصوصی برادرانہ تعلقات رہے ہیں۔ اپنی اپنی سلامتی اور جغرافیائی محل وقوع کے پیش نظر دونوں ممالک کا باہمی اور عالمی امور پر اکثر و بیشتر ایک ہی موقف رہا ہے۔ یہ تاریخی تعلقات کبھی کبھی اکھاڑ پچھاڑ کر شکار تو ہوئے ہوں گے مگر ان کی بنیاد ہمیشہ مضبوطی سے قائم رہی۔ اگر بنظر غور دیکھا جائے تو شاہ کے دور میں دونوں ممالک کے تعلقات امریکی ہدایات کے مرہون منت تھے۔ دفاعی میدان اور خاص طور پر آر سی ڈی کے حوالے سے ہمارے تعلقات پر ہمیشہ سے وائٹ ہاؤس کی چھاپ رہی۔ چنانچہ ہم ایک دوسرے کے اتنا ہی قریب آ سکے جتنا امریکہ نے چاہا۔ لہٰذا دونوں قومیں اور دونوں ملکوں کے عوام ایک دوسرے کے لئے کم و بیش اجنبی ہی رہے۔ مشترکہ مذہبی' ثقافتی اور تاریخی ورثے کے حامل ہونے اور مشترکہ سرحدوں کے باوجود دونوں ملکوں کے عوام کے عوام سے تعلقات میں وہ گرمجوشی نہ پیدا ہو سکی جس کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایران میں اسلامی انقلاب برپا ہونے کے بعد' اس انقلاب کے قائدین کے ساتھ ہمارا کوئی رابطہ نہ تھا۔ سوائے امام خمینی کے باقی سب نام اجنبی تھے۔ ایران میں اب شاہ اور امریکہ کے نام ایک گالی بن چکے تھے۔ وہاں ہر محکمے اور ہر ادارے میں نئے افراد تھے اور ان کا طریقہ کار بھی بالکل نیا تھا مختصراً" یوں سمجھ لیجئے کہ پاکستانی' ایرانیوں کے لئے اجنبی تھے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جنرل ضیاء وہ آخری سربراہ مملکت تھے جنہوں نے شاہ کے اقتدار کے آخری ایام میں ایران کا دورہ کیا تھا اور شاہ کو اپنی غیر مشروط اخلاقی اور سیاسی حمایت کا یقین دلایا تھا۔ انہوں نے یہ یقین دہانی امریکہ کے کہنے پر کرائی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی انقلاب کے قائدین نے اس کا سخت نوٹس لیا تھا' اور اس بناء پر پاک ایران تعلقات کو دھچکا لگنا فطری امر تھا۔ تاہم جنرل ضیاء نے کسی حد تک اس غلطی کا ازالہ کرنے کی کوشش کی اور امریکی مخالفت مول لیتے ہوئے پاکستان سب سے پہلا ملک تھا جس نے اسلامی جمہوریہ ایران کو تسلیم کیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ جب ہمارے ایک سفارتکار نے پاکستان کی جانب سے اسلامی جمہوریہ ایران کو تسلیم کرنے کا پیغام امام خمینی تک پہنچایا تو انہوں نے خوشی سے اسے سینے سے لگا لیا اور کہا کہ ریڈیو تہران' ایران کے ریڈیو اسلامی جمہوریہ ایران کے اعلان کے بعد جو پہلی خبر نشر کرے گا وہ پاکستان کی جانب سے اسلامی جمہوریہ ایران کو تسلیم کرنے کی ہو گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا' ساری دنیا کو علم ہو گیا کہ اسلامی جمہوریہ ایران کو تسلیم کرنے والا پہلا ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔ اس سے قبل بھی پاکستان نے پی آئی

اے کا ایک جہاز امام خمینی کو تہران لانے کے لئے پیرس کے ہوائی اڈے پر ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا' جسے استعمال نہ کیا گیا- اس جہاز کو استعمال کرنے کی نوبت اس لئے نہ آسکی کہ امام خمینی کو قدرے بڑے جہاز کی ضرورت تھی- بدقسمتی سے، ہمارے خیر سگالی کے ان اقدامات کی ہمارا سفارتخانہ' مناسب تشہیر کرنے میں بھی ناکام رہا اور ایران کی اسلامی قیادت تک ہمارے جذبات کا یہ واضح اور مثبت اظہار پہنچایا ہی نہ جا سکا-

انقلاب کے ساتھ ہی ایران پر عراق کی جانب سے جنگ مسلط کر دی گئی- دراصل یہ جنگ امریکی ریشہ دوانیوں کا شاخسانہ تھی- وائٹ ہاؤس بھلا اپنے انتہائی قریبی حلیف اور اسلامی دنیا میں اپنے سب سے بڑے ایجنٹ رضا شاہ پہلوی کی حکومت کے خاتمے اور ایران میں بادشاہت کی جگہ صحیح معنوں میں ایک مکمل اسلامی انقلاب کی آمد کیسے برداشت کر سکتا تھا' چنانچہ انقلاب کے فوراً بعد ہی اپنے تئیں اس کے اثرات کو سر اٹھاتے ہی کچلنے کے لئے امریکہ نے صدام حسین کو ایک کٹھ پتلی کے طور پر استعمال کیا اور انقلابی قیادت کو ایک بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا- اس جنگ میں عراق کو بہت سے اسلامی ممالک کے ساتھ ساتھ امریکی حلیفوں کی مالی' اخلاقی' سیاسی اور فوجی امداد بھی حاصل تھی-

ایران میں بھی انقلاب کو سبوتاژ کرنے کے لئے اسلام دشمن طاقتیں براہ راست یا بلاواسطہ طور پر سرگرم عمل تھیں- ان میں سے مجاہدین خلق' انقلاب کے خلاف خاصے متحرک تھے- انہوں نے اپنے دوستوں کی مدد سے ایران کے اندر سیاسی اور مذہبی خلفشار پیدا کرنے کی مہم بڑے زوروں سے چلائی اور ایران کی مذہبی اور سیاسی قیادت کی ایک بہت بڑی کھیپ ہلاک کر دی-

ایران میں روس کی حمایتی تودے پارٹی (کمیونسٹ) بھی تخریبی کارروائیوں میں مصروف تھی- حتیٰ کہ ایرانی صدر اور وزیر خارجہ صادق قطب زادہ بھی غدار نکلے- نیوی کا سربراہ کیپٹن افضلی بھی کے جی بی کا ایجنٹ ثابت ہوا اور اسے بھی قطب زادہ کی طرح پھانسی پر لٹکایا گیا- غرض ایک عجیب افراتفری کا عالم تھا- انقلاب دشمن جگہ جگہ موجود تھے اور اس کے اثرات کو ختم کرنے اور اسے ناکام بنانے کے لئے دونوں بڑی عالمی طاقتیں اپنے اپنے ایجنٹوں کو استعمال کر رہی تھیں- ان حالات میں دوست اور دشمن کی پہچان کرانا انتہائی مشکل کام تھا- ایرانی ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے- اس صورتحال میں ایران کی توقع یہ تھی کہ پاکستان ایک واضح دوستانہ پالیسی اختیار کرے گا اور کھل کر ان کا ساتھ دے گا- مگر پاکستان کی حکومت نے نہایت احتیاط سے کام لیا جس سے غلط فہمیاں بھی پیدا ہو گئیں- بعض ایرانی حلقے تو یہاں تک کہتے تھے کہ پاکستان تہران میں شاہ اور امریکہ کے حامیوں کی حمایت

کر رہا ہے۔

میں تہران پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ میری سخت نگرانی کی جا رہی ہے۔ انٹیلی جنس کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ ان کا نگرانی کا انداز بہت مہذب تھا۔ مجھے اپنے گرد سیکورٹی ایجنٹوں کی موجودگی کا کوئی خوف نہیں تھا' مگر میرے ایرانی دوستوں کا خوفزدہ ہو جانا بہرحال بجا تھا۔ مجھ سے ملاقات کے لئے آنے والے ہر فرد کو یہ یقین ہوتا تھا کہ ملاقات کے بعد انہیں اس ملاقات کی وجہ اور احوال جاننے کے لئے اٹھا لیا جائے گا۔ حتیٰ کہ قم کے دینی مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے والے پاکستانی طالب علموں کے ساتھ بھی جو کبھی کبھار مجھ سے ملنے آتے تھے یہی سلوک کیا جاتا تھا۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان دنوں ایران میں فرائض انجام دینا کس قدر جان جوکھوں کا کام تھا۔ ایرانی منظر نامہ بڑا واضح تھا۔ ایرانیوں کی اکثریت نظریاتی انقلاب کی حامی تھی اور بھرپور جذبے اور عمل کے ساتھ اس کے استحکام کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا کر کام کر رہی تھی' مگر امام کی سوچ اور اسلامی انقلاب کے مخالفین بھی ایسے ہی جذبے اور شدت کے ساتھ انقلابیوں کے ساتھ اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ایسی صورتحال میں ایک سفارتکار کے لئے یہی بہتر ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر میں رہ کر تماشا دیکھے۔ کیونکہ غلطی سے بھی اس کے منہ سے نکلا ہوا کوئی لفظ اسے کسی ایک گروپ کا حامی قرار دینے کے لئے کافی ہوتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ سمجھنا زیادہ مشکل بات نہیں۔ مگر مجھے ایک ایسی ذمہ داری سونپی گئی تھی جسے ایک مقررہ وقت میں نبھانا میری منصبی مجبوری تھی۔ مجھے ہر قدم پھونک کر اور راست سمت میں اٹھانا تھا اور ہر جملہ وسیع ترین قومی مفاد کو سامنے رکھ کر ادا کرنا تھا۔ تاہم بحیثیت فوجی اتاشی میری ذمہ داری کی نوعیت کچھ اور بھی تھی۔ اس حیثیت میں عراق ایران جنگ کے تمام پہلوؤں اور روزمرہ صورتحال پر نظر رکھنا میرے لئے اس لئے بھی ضروری تھا کہ ہم ایران کے ہمسائے تھے' اور اسلامی ممالک کی تنظیم کے رکن بھی۔ بہرحال ان قومی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لئے اہل قلم' اہل فہم اور سرکار کے نمائندوں سے رابطے لازمی تھے۔ لیکن ان میں نہ تو کوئی ملاقات اور نہ ہی کوئی کام خفیہ تھا' نہ کوئی خفیہ ایجنٹ اور نہ ہی خفیہ رپورٹ' ہر چیز طشت از بام تھی۔

پروٹوکول کے مطابق اتاشیوں اور دفاعی عملے کو ایرانی جے ٹو (J_2) سے رابطہ رکھنا ہوتا تھا۔ یہ ایران میں آئی ایس آئی کی طرز کا ایک محکمہ ہے۔ جلد ہی میں ایران کے فوجی پروٹوکول اور جے۔ ٹو کے ساتھ تعلقات بڑھانے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے اسی دوران زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے ملاقات کا موقع بھی ملا۔ اپنے چند ایرانی

دوستوں کی مدد سے میں انقلاب کی دو اہم قوتوں، جن کو اسلامی انقلاب کے ستون بھی کہا جاتا ہے، روحانیوں اور سپاہ پاسداران، کے چند اہم ارکان سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے لئے میں ہمیشہ آغا مرتضیٰ پویا، ان کے اہل خانہ اور دوستوں کا مرہون منت رہوں گا۔ جنہوں نے ایران، اسلامی انقلاب، ایرانیوں کی قومی نفسیات اور انداز فکر سمجھنے میں میری خاصی رہنمائی کی۔ انہی کی مدد سے ایران کی چند اہم شخصیات تک میری رسائی بھی ممکن ہو سکی۔ میرے خیال میں ان لوگوں کی مدد اور مشورے کے بغیر یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں بہت تھوڑے وقت میں بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے میں کامیاب ہو جاتا۔ میں انتہائی ایمانداری سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ آغا مرتضیٰ پویا نے تن تنہا ایران اور پاکستان کے تعلقات کی بحالی اور فروغ کے لئے جتنا کام کیا اتنا ہمارے پورے سفارتخانے نے نہیں کیا ہو گا۔ میرے خیال میں ان دونوں ممالک کے تعلقات کے فروغ کی وجہ سے ملنے والے ہر ثمر میں آغا مرتضیٰ پویا کا پورا حصہ ہے۔ دونوں ملک میں دوستی اور بھائی چارے کے پل تعمیر کرنے کے لئے انہوں نے جس بے چینی اور سرعت کا مظاہرہ کیا اس کی پاداش میں انہیں ایک بار ایران کی خفیہ ایجنسی نے تحقیقات کے لئے مختصر مدت کے لئے قید و بند میں بھی رکھا جو بہرحال ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔

جب میں اپنے قدم جما چکا تو میں نے اپنے چند ایرانی دوستوں سے اپنی نگرانی کئے جانے کی وجہ پوچھی۔ ان کے پاس پاکستان کے خلاف شکایات کا ایک پلندہ تھا ان شکایات میں یہ الزام بھی شامل تھا کہ تہران میں امریکی سفارتخانے پر ایرانیوں کے قبضے کے بعد سی آئی اے کا ہیڈ کوارٹرز اب اسلام آباد میں کام کر رہا ہے۔ ایران سے بھاگ کر بہائی اور زرتشت پاکستان میں آباد ہو رہے تھے، انہیں اس بات کا بھی یقین سا تھا کہ جنرل ضیاء جو اس خطے میں امریکہ کے معتمد ہیں انہوں نے سوچ سمجھ کر ایک تربیت یافتہ، تجربہ کار اور خفیہ ادارے آئی ایس آئی کا ایک سینئر افسر جو شیعہ بھی ہے (یعنی مجھے) ایرانیوں کی جاسوسی کے لئے بھیجا ہے۔ تمام متعلقہ ایرانی محکمے اس بات پر ایک ہی رائے رکھتے تھے کہ میں سی آئی اے کا ایجنٹ ہوں، جسے بڑی چالاکی سے تہران میں تعینات کیا گیا ہے۔ انہیں اس بات کا بھی شک تھا کہ میں یہاں سے جو رپورٹس یا اطلاعات بھیجتا ہوں وہ اسلام آباد میں سی آئی اے کے حوالے کر دی جاتی ہیں۔ جہاں سے انہیں عراق بھجوا دیا جاتا ہے۔

اس صورت میں جب میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے دوست بننے کی کوشش کر رہا تھا، مجھے خفیہ دشمن سمجھا جا رہا تھا۔ اور پاکستان کے ایک پاکیزہ اور سچے جذبے کو ایک چال کا نام دیا جا رہا تھا، میرے لئے سچ کو سچ ثابت کرنا بہت مشکل تھا، بہرحال چونکہ میرا ضمیر

صاف تھا' میری ہر کارروائی کھلی ہوئی کتاب کی طرح سے تھی' کسی سے خفیہ رابطہ نہیں تھا' ہر کام سرعام تھا' اس لئے مجھے یقین تھا آخر جیت سچ کی ہو گی اور ایرانیوں کو یقین آ جائے گا کہ ہم پاکستانی ان کے دشمن نہیں دوست ہیں۔

ان کا خیال تھا کہ کارٹر' صدام حسین' ضیاء الحق اور مسلم ریاستوں کے بہت سے بادشاہ اور شیوخ اس گروپ سے تعلق رکھتے ہیں جن کا ہدف اسلامی انقلاب کو سبوتاژ کرنا ہے۔ یہ تمام قوتیں امریکی ہدایات پر عمل کر رہی ہیں۔ تہران کی دیواروں پر جگہ جگہ یہ تحریر تھا "ایں دست امریکہ ہست کہ از آستین صدام بیرون می آید" (یہ امریکہ کا ہاتھ ہے جو صدام کی آستینوں سے باہر نکل رہا ہے)۔

اس سلسلے میں باب وڈوور کی ایک کتاب "Veil - the Secret Wars of CIA 1981-87" سے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

"سی آئی اے اور اس کے سربراہ ولیم کیسی کو ضیاء الحق کی ضرورت تھی۔ اسلام آباد میں سی آئی اے نے بیرونی دنیا کا سب سے بڑا ہیڈ کوارٹر بنا لیا تھا اور ولیم کیسی کے لئے خفیہ کارروائیاں بہت اہمیت کی حامل تھیں اور وہ ان تعلقات اور ایسی کارروائیوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سی آئی اے دنیا میں ہر جگہ موجود ہو اور خفیہ کارروائیوں کے ذریعے امور کو کنٹرول کیا جائے۔ وہ بہت سے آپریشن کی نگرانی خود کرتا تھا۔ ولیم کیسی فنڈز بھی خود کنٹرول کرتا تھا اور سربراہان ممالک یا دوسری اہم شخصیات کو پیسے خود اپنے ہاتھ سے دیتا تھا' انٹیلی جنس کی اصطلاح میں اس کا نام کچھ بھی ہو' بہرحال یہ مکمل کھلا رشوت تھی جو وہ بانٹا کرتا تھا۔

ولیم کیسی کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ سال میں ایک یا دو مرتبہ پاکستان کا دورہ ضرور کرے اور صدر ضیاء سے ملے۔ اس طرح وہ پریذیڈنٹ ریگن کے دور میں جنرل ضیاء سے نزدیک ترین روابط قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔"

اس کتاب کو پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ ایرانیوں کے ہمارے بارے میں خدشات بالکل ہی بے بنیاد نہیں تھے۔

بہرحال ایرانی سیکورٹی ایجنسیوں کی میرے گھر اور سفارتخانے کے باہر نقل و حرکت سے میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میرا کام کرنے کا انداز بالکل واضح اور صریح تھا۔ میں تقریباً زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے ایرانیوں سے ملتا اور انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دیتا۔ میں نے تقریباً تمام آیت اللہ عظمیٰ' افواج کے افسران' دیگر مذہبی راہنماؤں اعلیٰ سرکاری عہدیداروں' سپاہ پاسداران' تاجروں اور صحافیوں سے ملاقاتیں کیں۔

ان ملاقاتوں کے چند اہم مقاصد یہ تھے :

1- باہمی افہام و تفہیم' تعلقات بڑھانا اور ایرانیوں کا موقف جاننے کی کوشش کرنا۔

2- ایران کو اور ملت اسلامیہ کو درپیش عالمی معاملات کے بارے میں ان کا موقف معلوم کرنا۔

3- اپنی خارجہ پالیسی اور ایران عراق جنگ کے سلسلے میں پاکستان کا موقف ان تک پہنچانا۔

4- پاکستان کو درپیش خطرات سے ایرانیوں کو آگاہ کرنا۔

5- انہیں پاک امریکہ تعلقات کی نوعیت اور امریکہ سے اسلحہ اور دفاعی ساز و سامان خریدنے کے بارے میں پاکستان کی مجبوری سے آگاہ کرنا۔

6- علاقے میں روس اور بھارت کے بڑھتے ہوئے گٹھ جوڑ کی طرف توجہ دلانا اور اس کے مضمرات سے آگاہ کرنا۔ کشمیر کے تنازعے کی وضاحت کرنا اور بھارت کے ساتھ پاکستان کے سیاسی اور دفاعی نوعیت کے اختلافات کی وضاحت کرنا۔

7- پاکستان کی اسلامی نظریاتی بنیادوں کی وضاحت کرنا اور خاص طور پر اسلامی امور اور قوموں کی برادری میں پاکستان کے کردار کی نشاندہی کرنا۔

8- ماضی' حال اور مستقبل میں پاک ایران تعلقات کا جائزہ لینا اور ان کو بہتر سے بہتر تر بنانا۔

عالمی تعلقات اور ہماری مشترکہ مذہبی' تاریخی' جغرافیائی اور علاقائی حکمت عملیوں کے تناظر میں دیکھا جائے تو میرا خیال ہے کہ میں اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب رہا۔ آئی ایس آئی اور ایرانی سے ٹو کے درمیان مفاہمت اور ایک دوسرے کو جاننے کی کوششوں میں بے حد اضافہ ہوا اور ہم جلد ہی جاندار عمومی تعلقات بحال کرانے میں کامیاب ہو گئے۔

ایک بار جب میں چند روز کے لئے تہران سے اسلام آباد آیا تو ڈی جی آئی نے دونوں برادر ممالک کے درمیان بہتر تعلقات کی بحالی پر مجھے مبارکباد دی۔ اس طرح کے جذبات کا اظہار صدر ضیاء نے بھی کیا جو اس وقت ایران میں ہمارے ناظم امور طارق میر نے مجھ تک پہنچائے۔ پاک ایران تعلقات کی موجودہ سطح راتوں رات بحال نہیں ہوئی۔ اس کے لئے بڑی سخت محنت اور تگ و دو کرنا پڑی۔ اور اس داستان میں کچھ کڑوے کسیلے قصے بھی شامل ہیں اور کچھ شیریں لمحات بھی۔ اس تعلق کی حقیقت کو وجود میں لانے کے لئے ہمیں بڑی سخت جدوجہد کرنا پڑی ہے۔ بہرحال اس کا کریڈٹ ہماری واضح اور غیر مبہم پالیسی کو بھی جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے ڈی جی آئی جنرل اختر کی لمحہ بہ لمحہ راہنمائی اور مجھ پر ان کا

اعتماد بھی اس کامیابی کی بنیاد تھا۔

کاش ان حالات میں ہمارے دوسرے سفارتکار بھی پاکستان کی خاطر ایران کی مذہبی قیادت سے ملاقاتیں کرنا سفارتی کردار کا حصہ بنا لیتے۔ میں نے بھارت کے ہندو سفارتکاروں کو اپنے شیعہ سفیر مسٹر خلیلی کے ہمراہ محرم میں شیعوں کی تقریبات میں اور تہران یونیورسٹی میں نماز جمعہ کا خطبہ سننے کے لئے تواتر کے ساتھ آتے دیکھا' جہاں وہ ان مذہبی رسومات کا بغور مطالعہ کرتے تھے۔ بدقسمتی سے ہمارے دفتر خارجہ سے تعلق رکھنے والے ہمارے اہلسنت بھائیوں کو کبھی اس کی توفیق نہ ہوئی۔ اس وجہ سے یہ خلیج آج بھی قائم ہے' ہم ایران سے شکوہ کرتے ہیں کہ وہ بھارت سے زیادہ قریب کیوں ہے۔ مگر یہ سوچنا گوارا نہیں کرتے کہ بھارتی سفارت کار وہاں کتنی محنت کر رہے ہیں اور ہمارے سفارتکاروں کی مجموعی کارکردگی کیا ہے۔

اس سلسلے میں چند واقعات جو بظاہر معمولی ہیں' لیکن ان کا اثر بہت گہرا ہے بیان کرنا ضروری ہیں:

1- ہمارا سفارت خانہ علامہ اقبال اور اسد اللہ خان غالب کا دن نہیں مناتا' بلکہ ایرانی سرکاری طور پر یہ ایام مناتے ہیں' اور ہمارے سفارتکار ان تقاریب میں شامل ہونا بھی پسند نہیں کرتے۔ اور اس کی وجہ غالباً" یہ ہے کہ تقاریر فارسی میں ہوتی ہیں اور علامہ اقبال اور غالب کے فارسی کلام پر فارسی میں بحث ہوتی ہے۔

2- تہران میں ایک سڑک کا نام خیابان گاندھی ہے' میں اپنے طور سے کمیٹی کے سربراہ کو ملا اور کہا کہ گاندھی تو مسلمانوں اور پاکستان کا دشمن تھا' آپ نے سڑک کا نام خیابان گاندھی کیوں رکھا ہے؟ اس نے مسکرا کر کہا:

"ہم نے ایک سڑک کا نام خیابان محمد علی جناح اور ایک دوسری سڑک کا نام خیابان پاکستان رکھا ہے' کیا آپ کے ملک بھی کوئی سڑک کسی ایرانی رہنما کے نام پر ہے؟ بہرحال آپ مجھے تفصیل سے بتایئے گاندھی نے کس کس طرح مسلمانوں سے دشمنی کی اور میں یہ تفصیل اگلے ماہ ہونے والے کمیٹی کے اجلاس میں پیش کر دوں گا۔ اور ہم یقیناً سڑک کا نام بدل دیں گے۔"

میں نے اپنے سفیر صاحب سے بات کی اور پاکستان کے دفتر خارجہ کو چٹھی بھی لکھی کہ ہمیں مطلوبہ مواد فراہم کیا جائے لیکن یہاں کسی کو اتنی فرصت کہاں تھی۔

3- میرے ایک دوست بریگیڈئر افتخار گل جو پاکستان اور سینر فاؤنڈیشن کے سربراہ

تھے' انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور کہا کہ "ایرانی ہمارے 114 ڈاکٹروں کے انٹرویو کر گئے ہیں' لیکن انہوں نے ابھی تک کسی کو بلایا نہیں' یہ کام ذرا جلدی کروا دو" میں نے وزیر صحت سے وقت لیا اور اگلے دن ہی ان کے پاس جا پہنچا' اور ان سے اسلام اور مسلمانوں کے باہمی روابط کی بات کی اور پھر اپنے مطلب پر آیا انہوں نے جواب دے دیا:

"ہمارے پاکستان سے برادرانہ تعلقات تو تسلیم لیکن ہم پاکستانی ڈاکٹروں سے باز آئے' دیکھئے میرے پاس یہ رپورٹ پڑی ہے کہ ایک پاکستانی ڈاکٹر ڈیوٹی آف کر کے اپنے کمرے میں آرام کر رہا تھا' کچھ ایمرجنسی کیس آ گئے' ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سب کو اکیلا تو نہیں دیکھ سکتا تھا' جانیں بچانے کے لئے تگ و دو کی جا رہی تھی' نرس پاکستانی ڈاکٹر کے پاس گئی اور اس کی منت کی کہ اگر آپ آ جائیں تو شاید کچھ جانیں بچ جائیں' لیکن پاکستانی ڈاکٹر صاحب نے اسے دھکے دیکر کمرے سے نکال دیا اور کہا کہ میرا یہ آرام کا وقت ہے۔

انہوں نے مزید کہا' ہم پاکستانی ڈاکٹروں کو گاؤں اور چھوٹے قصبوں میں تعینات کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ بڑے شہروں میں رہنا پسند کرتے ہیں' اس وجہ سے بہت سے استعفیٰ دے کر واپس بھی چلے گئے ہیں۔

ہم پر جنگ مسلط ہے' اور ہمارے پاس ڈالر کی کمی ہے ہم نے ان سے کہا ہے کہ آپ 75% تنخواہ ڈالروں میں لیں اور 25% ایرانی کرنسی میں اور جنہوں نے ایرانی لڑکیوں سے شادی کی ہوئی ہے' وہ 50% ڈالر اور 50% ایرانی کرنسی میں لے لیں کیونکہ یہ رقم تو وہ یہاں خرچ کرتے ہوں گے' لیکن پاکستانی ڈاکٹر حضرات ساری کی ساری تنخواہ ڈالروں میں چاہتے ہیں' تاکہ ڈالر بلیک میں بیچ سکیں۔

بھارت کا ڈاکٹر تنخواہ کی بات ہی نہیں کرتا' وہ صرف "روٹی کپڑے" پر بھی کام کرنے کو تیار ہے' دور دراز گاؤں کی ڈسپنسری میں بھی خوشی خوشی چلا جاتا ہے اور چوبیس گھنٹے ہاتھ جوڑ کر ڈیوٹی پر حاضر رہتا ہے۔

جہاں تک ان 114 ڈاکٹروں کا تعلق ہے ہم ان کو لینا چاہتے ہیں' ہمیں ڈاکٹروں کی ازحد ضرورت ہے۔ چونکہ ہمارے ڈاکٹر محاذ جنگ پر ہیں' ہم نے سرکاری طور پر لکھا ہے کہ ان ڈاکٹروں سے کہیں کہ جیب سے ٹکٹ لے کر آ جائیں۔ ہم انہیں یہ رقم واپس کر دیں گے' لیکن وہ اڈوانس لینے پر مصر ہیں۔"

یہ ساری باتیں سن کر میں اپنا سامنہ لے کر واپس آ گیا۔

-4 ہمارے چمڑا بیچنے والے' ایران کو چمڑا برآمد کرنے کے بہت خواہشمند تھے۔ ہم نے امام خمینی سے فتویٰ لیا کہ جوتا صرف حلال گائے بھینس کے چمڑے کا پہننا جائز ہے۔ چنانچہ ایران کے جوتے بنانے والوں نے پاکستان کا رخ کیا اور بہت سی ٹینریز دیکھیں اور چمڑا خریدنے کے آرڈر بک کروا دیئے۔ جب پاکستانی چمڑا پہنچا تو ایرانی درآمد کنندگان پاکستانی سفارتخانے آ گئے اور چمڑا دکھایا جو کچا تھا' تول میں کم تھا اور کئی کھالیں پھٹی ہوئی بھی تھیں۔ ان کی چیخ و پکار سن کر بھارت کے سفیر نے ان کو بلایا اور کہا "بھارت میں پاکستان سے زیادہ مسلمان ہیں جو صرف حلال گوشت کھاتے ہیں' اس کے علاوہ کانپور میں چمڑے کا کاروبار کرنے والے سب مسلمان ہیں' تم لوگ ذرا آ کر جائزہ تو لو۔"

ایرانی کانپور چلے گئے اور آج پاکستان سے ایک اونس چمڑا بھی ایران نہیں جاتا۔

-5 فوجیوں کے پاس ایک چیز ہوتی ہے "چھاگل" جسے آپ کینوس کا مشکیزہ کہہ سکتے ہیں۔ اس میں پانی بھر کر گاڑیوں کے ساتھ لٹکا دیا جاتا ہے' ایک تو وہ ہوا لگنے سے ٹھنڈا رہتا ہے' دوسرے گاڑی میں جگہ نہیں گھیرتا۔ چھاگل کا کینوس اتنا واٹر پروف بھی ہوتا ہے کہ اس میں چوبیس گھنٹے پانی رہ سکتا ہے۔

سپاہ پاسداران کو ایسی کوئی 30000 چھاگلیں درکار تھیں۔ اس کی بھنک ایک ریٹائرڈ بریگیڈیئر کے کان میں پڑی تو وہ فوراً تہران پہنچے اور آرڈر اور ایڈوانس بھی لینے میں کامیاب ہو گئے لیکن جب چھاگلیں ایران پہنچیں تو معلوم ہوا کہ کینوس اتنا ردی لگایا گیا ہے کہ اس میں پانچ منٹ بھی پانی نہیں ٹھہرتا۔ ایرانی اپنا سر پیٹ کر رہ گئے۔

-6 ایک اور پاکستانی ریٹائرڈ بریگیڈیئر ایرانیوں کی مجبوری کا فائدہ اٹھانے کے لئے تہران پہنچ گیا اور ان سے کہا کہ مجھے آپ ایڈوانس ڈالر اور جو اسلحہ بارود آپ کو چاہئے اس کی فہرست دیجئے' میرے تو دنیا بھر کے اسلحہ کے سوداگروں سے ایسے مراسم ہیں کہ میں یہ گیا اور اسلحے سے بھرا جہاز لے کر یہ آیا۔ بیچاروں نے اس پر بھی اعتبار کر لیا' مگر ایرانی ابھی تک اس جہاز کی راہ تک رہے ہیں۔

-7 ایرانیوں کے ساتھ کچھ ایسا ہی برتاؤ ہمارے چاول کے سوداگروں نے بھی کیا۔

-8 ایران عراق جنگ کے دوران' بھارت نے ایران کو فقط دو ایمبولینس گاڑیاں

تحفے میں بھیجیں۔ یہ گاڑیاں محاذ جنگ سے زخمی پیچھے لانے کے کام آتی تھیں، مگر ایرانی سپاہی یہی سمجھتے تھے کہ بھارت جنگ میں ان کی بہت مدد کر رہا ہے۔

بعد میں تو خیر ہم ان کو ویسے بھی ایرانی لاشوں کے تحفے بھجوانے لگے، جس کے خلاف پراپیگنڈہ کر کے بھارت بھرپور سیاسی فائدہ اٹھاتا رہا۔

معززین کے دورے

آپ کو یاد ہو گا کہ اسلامی انقلاب کی کامیابی کے فوراً بعد ایران سے ایک اعلیٰ سطح وفد شاہ کی پرزور مذمت کرنے اور انقلاب کی غیر مشروط حمایت کرنے پر مولانا مودودی کا شکریہ ادا کرنے پاکستان آیا تھا۔ مولانا مودودی کی تحریروں اور تقاریر میں ایران کے انقلابیوں کو اسلامی دنیا میں ان کا ایک ہم خیال مل گیا تھا۔ خاص طور پر سلوک کے مظالم کے خلاف ان کے جذبے اور عمل کو بڑھانے میں عالمی سطح پر مولانا مودودی کی تحریروں اور تقریروں نے ان کی خاصی مدد کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کامیابی کے بعد مولانا مودودی کا شکریہ ادا کرنے آئے تھے۔

امریکہ کے غیر اخلاقی رویے اور اپنوں کے ناروا سلوک کی وجہ سے ایران تنہا رہ گیا تھا اور ان لمحات میں ایران کی اسلامی قیادت کو دوستوں کی تلاش تھی۔ پاکستان کے لئے بھی یہ ضروری تھا کہ وہ اسلامی جمہوریہ ایران کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرے۔ ہم نے بھی اس سلسلے میں کوششیں شروع کر دیں اور بالآخر ایران کے وزیر خارجہ علی اکبر ولایتی کو ایک وفد کے ہمراہ پاکستان کا دورہ کرنے کی دعوت دینے میں کامیاب ہو گئے۔ مجھے حکم ملا کہ میں اس دورے میں علی اکبر ولایتی کے ساتھ آؤں۔ سرکاری اور رسمی ملاقاتوں کے علاوہ میں نے اپنے ڈی جی آئی جنرل اختر کے ہمراہ ایرانی وزیر خارجہ کے ساتھ ایک خفیہ ملاقات کی، جس میں پاکستان میں ایرانی سفیر ابو شریف نے مترجم کے فرائض انجام دیئے۔ اس ملاقات میں ڈی جی آئی نے اپنی اور صدر مملکت کی جانب سے ایران کے لئے انتہائی خیرسگالی کے جذبات کا اظہار کیا اور ایران کو پاکستان کی مالی، اخلاقی اور سیاسی حمایت کا یقین دلایا۔ ڈی جی آئی نے تو ایرانی وزیر خارجہ سے یہاں تک کہہ دیا کہ آپ مجھے پاکستان میں اپنا سفیر سمجھیں۔

چنانچہ اس دورے سے پاکستان اور ایران کے تعلقات کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا۔ ایک دوسرے پر اعتماد میں اضافہ ہوا اور کم سے کم سرکاری سطح پر جنرل ضیاء کو امریکہ کا پٹھو کہنے سے گریز کیا جانے لگا۔ علی اکبر ولایتی کے دورے کے بعد ہم دونوں جانب سے اہم شخصیات کے دوروں کا اہتمام کرنے میں بھی کامیاب ہوئے۔ پاکستان کی

طرف سے غلام اسحاق خان نے وزیر خزانہ کی حیثیت سے دو بار ایران کا دورہ کیا۔ وزیر داخلہ محمود اے ہارون ایک اعلیٰ سطحی وفد کے ساتھ ایران آئے۔ بادشاہی مسجد کے خطیب مولانا عبدالقادر آزاد کی سربراہی میں بہت سے علماء اور مذہبی سکالروں نے ایران کا دورہ کیا۔ مشہد کے آیت اللہ توصلی سمیت ہم نے سپاہ پاسداران کے وفود اور دیگر اداروں سے منسلک دانشوروں اور سکالروں کو پاکستان آنے کی دعوت دی۔ یہ کام جس کے لئے کم از کم دس سال کا عرصہ درکار تھا' آئی ایس آئی کی ٹیم نے چند ماہ میں کر دکھایا۔

1981ء میں جنرل ضیاء نے ایک بار اسلامی ممالک کی تنظیم کے رکن کی حیثیت سے ایران کا دورہ کیا۔ اس دورے میں کچھ دیگر سربراہان مملکت بھی شامل تھے۔ میں نے اپنے ایرانی دوستوں سے پوچھا کہ آپ نے ہمارے صدر کی حفاظت کے لئے کیا اقدامات کئے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا "سیکورٹی ہماری ذمہ داری ہے اس لئے آپ اس کے لئے پریشان نہ ہوں۔" یہ وہ دور تھا جب مجاہدین خلق خاصے متحرک تھے اور وہ ڈاکٹر بہشتی' صدر رجائی اور وزیراعظم باہنر سمیت متعدد ایرانی راہنماؤں کو دہشت گردی کا نشانہ بنا چکے تھے۔ مجھے اپنے دوستوں کا جواب مطمئن نہ کر سکا۔ میں اس بات کی مکمل یقین دہانی چاہتا تھا کہ ہمارے صدر کی حفاظت کے لئے فول پروف انتظامات کئے گئے ہیں۔

بہرحال ایرانی صدر آیت اللہ خامنائی خود وفد کا استقبال کرنے کے لئے ایئرپورٹ پہنچے۔ ایئرپورٹ پر ان ممالک کے سفارتکار بھی موجود تھے جن کے سربراہ وفد میں شامل تھے۔ ہوائی اڈے کی معمول کی تقریبات کے بعد تمام معزز مہمان پروٹوکول کے لحاظ سے کھڑی کی گئی گاڑیوں کی جانب بڑھنے لگے۔ مجھے صدر خامنائی کی گاڑی کا علم تھا۔ میں تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آیت اللہ خامنائی کی گاڑی کی طرف بڑھا اور اس کا دروازہ تھام کر کھڑا ہو گیا۔ صدر ضیاء مجھے دیکھ رہے تھے' انہوں نے اس کار کے قریب میری موجودگی سے یہ تاثر لیا کہ شاید وہ اسی گاڑی میں جائیں گے۔ وہ سیدھے اس گاڑی کی طرف آئے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ صدر خامنائی بھی آئے اور وہ بھی اس گاڑی میں بیٹھ گئے۔

اب اس مرحلے پر ایرانی سیکورٹی ایجنسی اور پروٹوکول اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے تھے۔ میں بہرحال پوری طرح مطمئن تھا کہ میں نے صدر پاکستان کی سیکورٹی کو یقینی بنا لیا تھا۔ میرے لئے یہ بات مزید اطمینان اور خوشی کا باعث تھی کہ جب یہ وفد واپسی کے لئے ایئرپورٹ آیا تو صدر ضیاء اور صدر خامنائی پھر ایک ہی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ اس ایک واقعہ نے دونوں ممالک کے تعلقات کو مضبوط بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور یہ منظر پوری دنیا کے لئے پاک ایران دوستی کے احیاء اور فروغ کا واضح پیغام تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ دونوں

صدور یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ ان دونوں کے ایک ہی گاڑی میں سفر کرنے کا منصوبہ ایرانی دفتر خارجہ نے بنایا تھا اور ایرانی دفتر خارجہ کو یہ یقین ہو گا کہ دونوں صدور زیادہ سے زیادہ وقت باہمی بات چیت میں گزارنے کے لئے از خود ایک ہی گاڑی میں بیٹھے ہوں گے۔ صدر ضیاء کے اس دورے کے دو ہی ماہ بعد صدر علی خامنائی نے پاکستان کا دورہ کیا۔ اور پاکستان اور ایران قریب سے قریب تر ہوتے گئے' آئی ایس آئی کی ٹیم کے ایک رکن نے ازخود ایک قدم اٹھایا جو دونوں برادر ممالک کے لئے بہت خوش آئند ثابت ہوا۔ آئی ایس آئی "قواعد و ضوابط" سے ہٹ کر بھی کام کرتا ہے۔ جو بہت سے حکومتی ادارے نہیں کرتے اور یوں مواقع ضائع کر دیتے ہیں۔

ایران' عراق جنگ

امریکہ' سعودی عرب اور متعدد دیگر ممالک کی جانب سے صدر ضیاء پر شدید دباؤ تھا کہ پاکستان' ایران عراق جنگ میں غیر جانبدار رہے اور ایران پر امریکہ کی جانب سے لگائی گئی پابندیوں کی حمایت کرے' مگر جنرل ضیاء اور ڈی جی آئی جنرل اختر کو اس بات کی داد نہ دینا ناانصافی ہو گی کہ انہوں نے بڑی دلیری سے اس صورتحال کا مقابلہ کیا اور خاص طور پر صدر ضیاء نے امریکیوں کو واضح طور پر کہہ دیا کہ پاکستان ہرگز ایسا نہیں کرے گا۔ جنرل اختر نے تو غصے میں ایک بار یہاں تک کہہ دیا:

"بھاڑ میں جائے امریکہ' بہت سے مسلمان ممالک کھلے بندوں عراق کی مالی اور فوجی امداد کر رہے ہیں' امریکہ عراق کو سیٹلائٹ کی سہولت فراہم کر رہا ہے اور یہ ہم سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہم غیر جانبدار رہیں۔ ہماری اپنی ترجیحات اور ذمہ داریاں ہیں۔ ہم وہی کریں گے جو ہمارے وسیع تر قومی مفاد میں ہو گا۔"

چنانچہ ہم اس جنگ میں ایران کی خفیہ امداد کرتے رہے۔ رات کے اندھیرے میں مختلف رنگوں سے پینٹ کئے گئے ایرانی فضائیہ کے کارگو طیارے اسلام آباد اترتے اور دن کے اجالے سے پہلے ساز و سامان لے کر واپس روانہ ہو جاتے۔ یہ پروازیں اس قدر خفیہ تھیں کہ ان کا کہیں کسی گفتگو میں بھی کوئی تذکرہ نہ تھا۔ نہ کچھ لکھا جاتا' نہ رسید نہ دستخط۔ دونوں اطراف سے اس موضوع پر ہونٹوں کو سی لیا گیا تھا۔

اس جنگ کے دوران ایک وقت ایسا بھی آیا کہ عراقی بمبار طیارے تہران اور اصفہان جیسے شہروں کو بھی نشانہ بنا رہے تھے۔ اس صورتحال کو روکنے کے لئے ایران کو اپنے ریڈار سسٹم کے لئے ایک بلب کی ضرورت تھی۔ کیونکہ پی اے ایف کے پاس بھی ایسا ہی ریڈار

سسٹم ہے' اس لئے ایرانیوں نے دیگر کئی دوستوں کے علاوہ ہمیں بھی اس بلب کی فراہمی کے لئے درخواست کی۔ امریکیوں کو بھی ایران کی اس ضرورت اور مختلف دوستوں سے کی گئی درخواستوں کی خبر ہو گئی۔ مجھے بھی ایرانی دوستوں نے حکومت سے سفارش کرنے کے لئے کہا' میں نے ان کی درخواست اپنے ڈی جی آئی تک پہنچا دی۔ مگر ایران کو یہ بلب فراہم نہ کیا گیا۔ میں نے چند ماہ بعد اپنے اسلام آباد کے دورے کے دوران جنرل اختر سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ "ایران کا موقف تھا کہ یہ بلب صرف ہمارے دفاع کے لئے ہے۔ حملے کے لئے نہیں' اگر یہ مل جائے تو ایران اپنے نہتے بے گناہ شہریوں کو تحفظ دینے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ایران کو یہ بلب شہری آبادی کی حفاظت کے لئے درکار تھا۔ مگر امریکہ نے پی اے ایف کے حکام کو تنبیہہ کر دی تھی کہ اگر آپ نے ایران کو یہ بلب دیا تو اپنے ریڈار سیٹ کے لئے تمہیں اس کا متبادل نہیں ملے گا اور پاکستان ایئر فورس کا یہ قدم امریکی سلامتی کے خلاف تصور کیا جائے گا۔ لہٰذا یہ سیٹ ہمارے لئے ناکارہ ہو جاتا۔ اسے ہم ایسا جنگی حربہ بھی کہہ سکتے ہیں جس سے پاک امریکہ تعلقات پر منفی اثرات مرتب ہوتے' ہم نے دیگر ذرائع سے بھی یہ بلب حاصل کرنے کی کوشش کی مگر امریکیوں نے سارے راستے بند کر دیئے تھے۔ اور ہمیں کہیں سے بھی یہ بلب نہ ملا ورنہ ہم ایران کو ضرور پہنچا دیتے۔"

جی ہاں! یہی بنیادی انسانی حقوق کے چیمپئن ہونے کا دعویٰ کرنے والے اور ترقی یافتہ دنیا کے نام نہاد لیڈر کا اصل چہرہ ہے۔ امریکہ کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ اسلام کی سربلندی اور اپنے وطن کے دفاع کی خاطر ایک جارح سے لڑنے والی قوم کے بے گناہ شہریوں کو عراقی میزائلوں اور بموں کا نشانہ بننے دیا جائے' کیونکہ امریکہ انہیں اپنا دشمن سمجھتا تھا۔

جنگ کے دوران ایران نے اپنے چند نوجوان پائلٹ ایڈوانس ٹریننگ کے لئے پاکستان بھجوانے کی خواہش ظاہر کی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس تربیت کی نوعیت' اخراجات اور دیگر ضروری اقدامات کے حوالے سے پاکستانی سفارت خانے میں تعینات پی اے ایف کے ٹریننگ اینڈ لیزان آفیسر (ٹی ایل او) ایئر کموڈور مختار کے ساتھ ایرانیوں کے تفصیلی مذاکرات اور بات چیت بھی ہوئی۔ مگر ایرانیوں کی اس درخواست کو پذیرائی نہ ملی۔ ایرانی جے۔ ٹو کے کرنل مہدی کتیبہ نے مجھ سے کہا کہ آپ اس معاملے پر اپنے ڈی جی آئی کی مدد حاصل کریں! میں نے ٹی ایل او سے یہ کیس لے کر جنرل اختر کو براہ راست بھجوا دیا۔ جنرل اختر نے صدر اور پاک فضائیہ کے سربراہ سے اس رپورٹ پر تفصیلی بحث کی اور بالآخر ایرانی

ہوابازوں کا ایک گروپ تربیت کے لئے رسالپور پہنچ گیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ انہی دنوں عراقی پائلٹوں کا ایک گروپ بھی تربیت کے لئے رسالپور میں موجود تھا' مگر یہ ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔

تصویروں کی نمائش

ایران کے بہت سے انقلابی گروپ ابھی تک جنرل ضیاء کے سخت مخالف تھے اور وہ انہیں سگ کارٹر (کارٹر کا کتا) کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کے تضحیک آمیز کارٹون اکثر ایرانی اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ تہران میں ہونے والی ایک تصویری نمائش میں جنرل ضیاء کا ایک کارٹون نمائش میں رکھا گیا۔ اس میں جنرل ضیاء کو ان کا بڑی بڑی موچھوں کے ساتھ ہاتھ میں خنجر لئے صدر کارٹر کے بوٹ میں کھڑا دکھایا گیا تھا۔ میں اس تصویر کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا اور اپنے بیٹے سے کہا کہ وہ پتہ کرے کہ کوئی اور پاکستانی سفارتکار بھی اس نمائش میں موجود ہے؟ میرا بیٹا دو اور پاکستانی سفارتکاروں کو تلاش کر کے لے آیا۔ میں نے انہیں صدر کا کارٹون دکھایا تو وہ کھکھلا کر ہنس پڑے' انہوں نے کہا "ہم پہلے ہی اسے دیکھ چکے ہیں۔ ترمذی صاحب! یہ ایران ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟" ان کا جواب تھا۔

ان کا جواب سن کر میں کچھ جذباتی ہو گیا میں نے کہا کہ "تم لوگ جہنم میں جاؤ! ضیاء الحق جیسے بھی ہیں اور ان سے متعلق آپ کی جو بھی ذاتی رائے ہو اس وقت وہ پاکستان کے صدر ہیں' اور ان کو گالی دینا پاکستان کو گالی دینے کے مترادف ہے اور کسی دوسرے ملک کو یہ حق حاصل نہیں کہ ہمارے صدر کا اس طرح کارٹون بنائے' وہ ہمارے صدر کے ساتھ یہ سلوک نہیں کر سکتے۔ اگر تم اسے یہاں سے نہیں ہٹوا سکتے تو میں خود ہٹا دوں گا' میں جانتا ہوں کہ تم میں سے بہت سے اس وقت بھی وہاں موجود تھے جب ہمارے سفارتخانے کی عمارت سے پاکستانی پرچم اتارا گیا تھا اور تم ہاتھ باندھے کھڑے دیکھتے رہے تھے۔ تمہیں پاکستان کی نمائندگی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ (ہمیں بتایا گیا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد تہران میں مقیم کچھ پاکستانی ایک جلوس لے کر ہمارے سفارتخانے آئے مظاہرہ کیا اور نعرہ بازی شروع کر دی۔ سفارتخانے کے عملے نے ایرانی سیکورٹی کو مدد کے لئے بلایا۔ سپاہ پاسداران کا ایک دستہ ابو شریف کی قیادت میں وہاں پہنچا۔ (یہی ابو شریف بعد میں پاکستان میں ایران کے سفیر تعینات ہوئے تھے)۔ انہوں نے مظاہرین کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے بجائے پاکستانی پرچم فلیگ پوسٹ سے اتار دیا اور سفارتخانے کا پاکستانی عملہ خاموش تماشائی

ہٹا دیکھتا رہا)۔

خیر! میرا چیخنا چلانا سن کر وہاں اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔ اسی اثناء میں نمائش کے انتظامی کمیٹی کا ایک رکن بھی شور سن کر آ گیا۔ میں نے اسے سکیچ کے بارے میں جتایا اور کہا کہ "اسے فوراً یہاں سے ہٹا دیا جائے۔" میں نے اسے اپنا عہدہ رینک اور مرتبہ وغیرہ جتایا اور کہا کہ "جب تک یہ تصویر یہاں سے ہٹا نہیں دی جائے گی میں یہاں سے بالکل نہیں ہٹوں گا۔ مجھے یہ قبول نہیں کہ پاکستان کے صدر کی اس طرح بے عزتی کی جائے" منتظمین نے آپس میں صلاح مشورہ کیا اور کہا کہ ہم بعد میں اسے ہٹا لیں گے مگر میں اپنی ضد پر قائم رہا اور بالآخر صدر ضیاء کا کارٹون نمائش سے ہٹا لیا گیا۔ اس قسم کا سفارتی رویہ بھی شاید آئی ایس آئی ہی کی تربیت تھی۔ شاید ہمارے وزارت خارجہ کے افسران کے لئے یہ ایک معمولی سی بات تھی جس کے خلاف احتجاج بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ریڈیو اسلامی جمہوریہ ایران' زاہدان

ریڈیو زاہدان کی اردو سروس سے پاکستان اور مارشل لاء کے خلاف تسلسل کے ساتھ پراپیگنڈہ کیا جاتا تھا۔ میں نے اپنے ان سفارتی ساتھیوں سے اس سلسلے میں بات کی جن کی ذمہ داری ایسے امور پر توجہ دینا تھی' مگر ان کا جواب بڑا سیدھا سادا تھا کہ ہم ایرانی دفتر خارجہ کو اس سے آگاہ کر چکے ہیں مگر وہ بھی پراپیگنڈا بند کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلامی ایران کے ریڈیو' ٹی وی' اخبارات آزاد ہیں اور حکومت اس میں دخل اندازی نہیں کر سکتی۔

تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ پروگرام ریڈیو پاکستان کوئٹہ کے ایک سابق پروڈیوسر پیش کرتے ہیں' جو مارشل لاء کے زمانے میں گرفتاری کے ڈر سے زہدان آ گئے تھے' اور یہاں ریڈیو زہدان کی اردو سروس میں ملازمت اختیار کر لی تھی' انہوں نے ریڈیو زہدان کی ایک خاتون کارکن سے شادی کر لی تھی اور اب یہ دونوں میاں بیوی یہ پروگرام پروڈیوس کر رہے تھے۔ میں نے اپنے طور پر ایرانی جے۔2 کے پروٹوکول والوں سے کہا کہ اس قسم کا پراپیگنڈہ دونوں ملکوں کے تعلقات کے لئے کسی طرح بھی سودمند نہیں ہے' اس لئے اسے فوراً بند ہونا چاہئے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ ہم اس صورتحال کا تدارک کریں گے مگر معاملہ نہ صرف جوں کا توں رہا بلکہ اس پراپیگنڈے میں اور تیزی آ گئی۔ ایک روز تو یہ اس قدر معاندانہ تھا کہ میرے چھوٹے بیٹے نے مجھ سے کہا "پاپا! آپ کے اتنے ایرانی دوست ہیں کیا آپ ان سے کہہ کر یہ ختم نہیں کروا سکتے۔ اگر وہ ہمیں گالیاں دینا بند نہیں کریں گے تو میں

آپ کے کسی ایرانی دوست کو اپنے گھر میں نہیں گھسنے دوں گا۔" یہ ایک پاکستانی بچے کا بنیادی فطری ردعمل اور مناسب وارننگ تھی۔

میں نے فوراً پروٹوکول کو فون کیا اور جے۔ 2 کے چیف سے فوری ملاقات کے لئے وقت مانگا۔ اگلے روز صبح ساڑھے سات بجے ملاقات طے پائی۔ میں نے ایک خالی فائل اور میں ایک پرانا غیر متعلقہ ٹیلیکس کا کاغذ رکھا اور ملاقات کے لئے پہنچ گیا۔ میں بالکل سنجیدہ تھا۔ یہ ہمارے ایرانی دوستوں کے لئے غیر معمولی بات تھی' انہوں نے مجھے ہمیشہ ہشاش بشاش دیکھا تھا۔ جے۔ 2 کے چیف کے کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے فائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"اس میں جنرل اختر عبدالرحمٰن کا اہم پیغام ہے' جس میں انہوں نے کہا ہے کہ اگر ریڈیو زاہدان سے یہ نازیبا پراپیگنڈہ فوری طور پر بند نہ کیا گیا تو آپ بھی آج شام ریڈیو پاکستان کوئٹہ کی فارسی سروس سننے کے لئے تیار رہیں۔ بعد میں ہمیں الزام نہ دیجئے گا۔ بہت ہو چکا۔ تعلقات یک طرفہ طور پر نہیں بڑھائے جا سکتے۔ اس کے لئے دونوں جانب سے خیر سگالی کی ضرورت ہوتی ہے۔"

یہ کہنے کے فوراً بعد میں جے۔ 2 کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ ان کے لئے یہ میرا طرز عمل انتہائی غیر متوقع اور غیر معمولی تھا۔

اسی شام نہ صرف یہ پراپیگنڈہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا بلکہ اس پروگرام کے دونوں پروڈیوسروں کو نوکری سے بھی جواب مل گیا۔ میں نے اپنی تربیت اور تجربے کی بناء پر ایک چال چلی تھی جو کامیاب ہو گئی۔ ہمارے سفیر اور ڈی جی آئی دونوں میری اس کامیابی پر نازاں تھے۔ اس سے پاک ایران تعلقات مستحکم کرنے میں بہت مدد ملی۔ فارن سروس کا کوئی تربیت یافتہ افسر شاید ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا اور نہ ہی وہ اسے اپنی ڈیوٹی کا حصہ سمجھتا ہے۔

جنرل فلاحی اور وزیر دفاع مسٹر ناجو کے لئے تعزیت

ایرانی چیف آف دی جنرل سٹاف' جنرل فلاحی اور وزیر دفاع مسٹر ناجو ایک روز اہواز کے محاذ سے واپسی پر سی۔ 130 طیارے کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ اگلے روز ان کی تدفین تھی اور ان کے جنازے آفیسرز اکیڈمی تہران سے اٹھائے جانے تھے۔ ایرانی آرمی پروٹوکول نے سرکاری طور پر تمام غیر ملکی اتاشیوں کو اس حادثے کی خبر دی مگر ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ سیکورٹی وجوہات کی بناء پر غیر ملکی اتاشی تدفین کی رسومات میں شرکت نہ کریں۔

مجاہدین خلق کا خوف ہمہ وقت موجود رہتا تھا اور یوں بھی ان کے لئے انقلابی قیادت کو بدنام کرنے کے لئے کوئی بھی غیر ملکی سفارتکار بہترین ٹارگٹ ثابت ہو سکتا تھا۔

پاکستان سفارتخانے میں ہم نے اس سلسلے میں آپس میں بات کی' ہمارے بحریہ کے ساتھی کیپٹن اسلم اور ٹی ایل او ایئر کموڈور مختار کا مشورہ یہی تھا کہ چونکہ پروٹوکول ہماری حفاظت کی ذمہ داری نہیں لیتا اس لئے تدفین کی ان رسومات میں شرکت نہ کی جائے' بس جب کبھی ملیں گے ان سے تعزیت کر لیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم ایران میں غیر ملکی تھے اور پروٹوکول کے مدنظر ہمارا وہاں جانا سیکورٹی رسک بھی ہو سکتا تھا جو ہمارے اور ہمارے ایرانی دوستوں کے لئے خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ محبت' بھائی چارے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شرکت کے حوالے سے ہمارے جذبات کا تقاضا یہ تھا کہ مشکل کی اس گھڑی میں اپنے ایرانی بھائیوں سے اظہار ہمدردی دوسرے ممالک سے بڑھ کر کریں تاکہ ان کو بھی پاکستان اور دوسرے ممالک کا فرق معلوم ہو جائے۔ مگر میری کوئی دلیل میرے ساتھیوں کو متاثر نہ کر سکی۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا "آپ نہ جائیں' بہرحال میں جا رہا ہوں اور یہ تعزیت میرے مشن کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہو گی' اللہ مالک ہے!"

میں نے وردی پہنی سفارتخانے سے نکلا اور تن تنہا اکیڈمی کی جانب چل پڑا۔ سڑکوں پر عوام کا ایک ہجوم تھا لہٰذا گاڑی لے جانا ممکن نہ تھا۔ سڑک کے دونوں جانب لوگ اکٹھے ہو رہے تھے اور جنازے کے جلوس کے راستے پر فوج تعینات کر دی گئی تھی۔ پاک آرمی کی یونیفارم میں میرا لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بننا لازمی امر تھا۔ اور میرے لئے یہ انتہائی اطمینان کی بات تھی کہ پوری ایرانی قوم کو یہ پیغام بڑی وضاحت سے مل رہا تھا کہ مصیبت کی اس گھڑی میں پاکستان ان کے ساتھ ہے۔ میں پیدل چلتے ہوئے بڑی آسانی سے اس جگہ پہنچ گیا جہاں ان جانبازوں کی میتیں رکھی تھیں۔ وہاں موجود ہر سینئر فوجی آفسر سے میں نے دلی اظہار تعزیت کیا۔ میں واحد غیر ملکی تھا جو تدفین کی رسومات میں شریک ہوا۔ اس لمحے ایرانی چیف آف پروٹوکول کرنل توفیقی میرے قریب آئے اور آہستہ سے میرے کان میں کہا' برادر! ہم آپ کے بہت ممنون ہیں کہ آپ تشریف لائے مگر مجھے افسوس ہے ہم آپ کو ضروری پروٹوکول فراہم نہیں کر سکتے۔ آپ کا پیدل چل کر آنا اور جانا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا "دکھ کی اس گھڑی میں مجھے کسی پروٹوکول کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے صدر پاکستان اور ڈی جی آئی جنرل اختر نے پیغام بھیجا ہے کہ میں ان کی جانب سے تعزیت کا اظہار کروں۔ جہاں تک سیکورٹی کا معاملہ ہے تو مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی ایرانی اپنے کسی پاکستانی بھائی کو

قتل نہیں کرے گا' آپ بالکل فکر نہ کریں۔" تدفین کے بعد میں بخیر و عافیت واپس پہنچ گیا۔

چند روز بعد میں اپنی بیوی کے ہمراہ صدر پاکستان کی جانب سے جنرل فلاحی کی بیوہ سے تعزیت کے لئے گیا اور فاتحہ خوانی کے بعد انہیں جنرل ضیاء کی جانب سے قرآن پاک کا ایک نسخہ اور جائے نماز پیش کیا۔ یہ تحفے اس بیوہ کو کسی اور اسلامی ملک کے سربراہ نے نہیں بھیجے ہوں گے۔ اس بیوہ کے دل سے پاکستان کے لئے کتنی دعائیں نہیں نکلی ہوں گی؟ اور پاکستان کا وقار کتنا بلند ہوا ہو گا؟

مجھے یقین ہے کہ میرے ان معمولی اقدامات سے پاک ایران تعلقات کی مضبوطی میں خاصی مدد ملی۔ ایرانیوں نے ہم سے اس حادثے کی تحقیقات کے لئے پی اے ایف کے ماہرین کی ایک ٹیم بھیجنے کی درخواست بھی کی جس کا مثبت جواب دیا گیا۔

پاکستانی ٹینک

شاہ کے زمانے میں دفاعی سامان کی مشترکہ خرید و فروخت کے لئے دونوں ممالک کے سفارتخانوں میں ایک ایک علیحدہ دفتر قائم تھا جو اس کام کی نگرانی کرتا تھا' انقلاب کے بعد وہ دفاتر بند ہو گئے' اور پاکستانی افسر بغیر کسی کو چارج دیئے دفتر کا سامان گودام میں پھینک کر پاکستان چلا گیا۔

ایک روز میں گودام میں گیا اور دفاع کے متعلق فائیلیں ادھر ادھر بکھری دیکھیں۔ ان فائلوں کی ذمہ داری کوئی قبول نہیں کر رہا تھا۔ میں یہ تمام فائیلیں اٹھاکر اپنے دفتر لے آیا۔ میں نے سوچا کہ ان میں خفیہ کاغذات بھی ہوں گے اس لئے بہتر ہے انہیں جی ایچ کیو واپس بھجوا دیا جائے۔

فائلوں کو دیکھتے دیکھتے ایک فائل سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ ان ٹینکوں سے متعلق ہے جو پاکستان سے ایران Upgradation کے لئے بھیجے گئے تھے' فائل سے یہ بھی پتا چلا کہ ایران میں ہمارے 38 ٹینک ہیں' میں نے جی ایچ کیو سے رابطہ کیا مگر وہاں سے کوئی مناسب جواب موصول نہ ہوا۔

میں نے ازخود ایرانی وزارت دفاع کو خط لکھا کہ آپ کی ورکشاپ میں پاکستان کے 38 پاکستانی ٹینک ہیں' وہ براہ کرم پاکستان کو واپس دینے کا بندوبست کیا جائے۔

انہوں نے جواب دیا' ہمارے پاس کوئی ریکارڈ نہیں' جو ریکارڈ تھا ضائع ہو گیا۔ اس لئے آپ ان کے انجن نمبر وغیرہ بتائیں' میں نے پھر جی ایچ کیو کو لکھا' لیکن وہاں سے پھر کوئی جواب نہ آیا۔

میں نے بہت وقت صرف کر کے تمام فائلوں کا مطالعہ کیا اور ایک ایک کر کے تمام ضروری معلومات جمع کر لیں' اور ایرانی وزارت دفاع کو جواب بھیج دیا۔

انہوں نے جواب میں لکھا "ہم حالت جنگ میں ہیں' ہمیں معلوم نہیں آپ کے ٹینک کس محاذ پر ہیں' ان میں سے کتنے سلامت ہیں اور کتنے تباہ ہو گئے' بہرحال ہم نے آپ کے 38 ٹینکوں کا کلیم مان لیا اور جنگ کے بعد آپ کو واپس کر دیں گے۔"

امید ہے وہ پاکستانی ٹینک جن کا اتہ پتا ہمارا جی ایچ کیو بھی بھول چکا تھا' اب تک پاکستان کو واپس مل چکے ہوں گے۔

پاک فوج کا حج دستہ

جنرل ضیاء الحق کے زمانے سے پاک فوج کی ایک روایت ہے کہ اس کا ایک دستہ ہر سال خشکی کے راستے حج کا فریضہ ادا کرنے کے لئے جاتا ہے۔ یہ دستہ ایران' ترکی' شام اور اردن کے راستے سعودی عرب جاتا ہے اور اسی راستے سے واپس آتا ہے۔ یہ لوگ دن کو سفر کرتے ہیں اور رات کو آرام۔ ایران سے گزرتے ہوئے انہیں تقریباً ایک ہفتہ لگتا ہے اور ایران میں ایرانی فوج اس دستے کو مکمل پروٹوکول فراہم کرتی ہے۔ ایران وہ واحد ملک ہے جہاں ہمارے ان فوجیوں کو رہائش اور کھانے کی تمام سہولتیں مفت فراہم کی جاتی ہیں حتیٰ کہ گاڑیوں کے لئے پیٹرول اور دیگر لوازمات بھی دوستی کے جذبے کے اظہار کے طور پر فراہم کئے جاتے ہیں۔

ایرانی انقلاب اور عراق کے ساتھ جنگ کے دنوں میں ہمارے حج کے لئے جانے والے ان دستوں کو ہر پڑاؤ پر استقبالیہ کی صورت میں انقلابی تقریریں سننا پڑتیں' جہاں انہیں تحائف کے علاوہ ایران عراق جنگ کے بارے میں لٹریچر وغیرہ بھی دیا جاتا۔

ایک سال جب میں ایرانی پروٹوکول والوں کے ساتھ پاکستانی حجاج کو لینے پاک ایران سرحد پر گیا تو پروٹوکول والوں نے مجھے بتایا کہ اس سال حج پر جانے والا دستہ رہبر انقلاب اسلامی امام خمینی سے بھی ملاقات کرے گا۔ ان کا کہنا تھا کہ دونوں ملکوں کے درمیان یہ ملاقات' دوستانہ تعلقات کو مزید مستحکم بنانے کے لئے اہم فیصلہ تھا اور پاکستانی فوجی بھائیوں کے لئے ایک اعزاز بھی۔ بقول ان کے ایرانی فوجی ہائی کمانڈ نے بڑی تگ و دو کے بعد اس ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔ میں نے جب اس دستے کے کمانڈر کو اس پروگرام کے بارے میں بتایا تو انہوں نے کہا کہ ہمیں یہ خصوصی ہدایات دے کر بھیجا گیا ہے کہ اس دستے کا کوئی بھی رکن امام خمینی سے ملاقات نہیں کرے گا کیونکہ امام ایسے موقعوں پر انقلابی خیالات کا اظہار

کرتے ہیں اور ہمارے دستے کا کوئی بھی رکن ان سے متاثر ہو سکتا ہے۔

میں نے یہ پیغام ایرانی دوستوں تک پہنچا دیا' اس پر حیرت کا اظہار لازمی تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم نے بڑی کوششوں اور بہت سی رکاوٹوں کو عبور کر کے یہ انتظام کیا تھا کہ پاک فوج کا یہ دستہ امام سے ملاقات کا اعزاز حاصل کر سکے اور اب ہمیں حیرت ہے کہ پاک فوج نے اس اعزاز کے حصول سے انکار کر دیا ہے۔ ایرانی پروٹوکول کے انچارج نے مجھ سے کہا:

"جنرل! کیا آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کے انکار سے ہمیں کس قدر ہزیمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہم امام خمینی کو آپ کے انکار' کا کیا سبب بتائیں؟ ہم سب امام کے ردعمل کے بارے میں سوچ کر پریشان ہیں۔ آپ بتائیں اگر اسی طرح کا پروگرام قائد اعظم محمد علی جناح کے ساتھ ہوتا تو آپ کیا کرتے؟"

میں نے کہا "برادر! ہم آپ کے شکر گزار ہیں' مگر پہلی بات تو یہ ہے کہ اس ملاقات کے لئے ہم نے آپ سے کوئی درخواست نہیں کی تھی۔ دوسرے یہ کہ فوج ہمیشہ احکامات کے پابند ہوتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی احکامات کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس معاملے کو احسن طریقے سے سنبھال لیں گے۔"

پروٹوکول آفیسر نے تہران میں اپنے ہیڈ کوارٹرز کے ساتھ طویل گفت و شنید کی اور یہ ملاقات منسوخ کر دی گئی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ انہوں نے یہ سب کس طرح کیا مگر بعد ازاں ان کے رویوں میں ہمیں کوئی تبدیلی محسوس نہ ہوئی' وہ پہلے ہی کی طرح دوستانہ اور ہمدردانہ تھے۔

حج سے واپسی پر پاک فوج کے حاجی آفیسوں نے ایرانی چیف آف جنرل سٹاف بریگیڈیئر جنرل ظہیر نژاد سے ملاقات کی۔ تحائف کے تبادلے ہوئے اور جنرل ظہیر نے کہا "میں نے اپنے بھارت کے دورے کے دوران زمانہ قدیم کے جانوروں کی طرح کے انسان دیکھے ہیں۔ یہ ڈھانچہ نما بدشکل انسان پاک فوج کا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں؟ دستے سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے مزید کہا کہ میری جانب سے اپنے چیف کو یہ پیغام دے دیجئے گا کہ اگر بھارت اور پاکستان کی جنگ ہوئی تو ہم کم از کم تین لاکھ فوج آپ کی مدد کو بھیجیں گے۔"

میرے خیال میں پاکستان کے لئے کسی بھی ایرانی فوجی سربراہ نے اس سے قبل اس قسم کے خیالات کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ایک بار جے۔ 2 کے سربراہ نے یوم پاکستان کی تقریبات کے دوران ہمارے سفیر مسٹر خٹک سے کہا:

"ایکسی لینسی! ہم صرف بریگیڈئر تہذی کی خاطر آئے ہیں۔ آپ کو علم ہے کہ میں کسی سفارتی تقریب میں نہیں جاتا ماسوائے بریگیڈئر تہذی کے گھر یا آپ کے سفار تخانے کے' وہ جب بھی ہمیں بلاتے ہیں ہم بسروچشم آجاتے ہیں۔"

یہ بحیثیت ڈیفنس لینڈ آرمی اتاشی میری کارکردگی کے بارے میں ان کے وہ تاثرات تھے جو میری سروس بک کا تیسرا باب ہیں۔ (تیسرا باب لکھا نہیں جاتا)۔

افغان جہاد

ایران کی خواہش تھی کہ آئی ایس آئی اور جے۔ 2 مل کر افغان جنگ میں مشترکہ کردار ادا کریں اور میدان جنگ میں بھی مشترکہ منصوبہ بندی کریں۔ اس ضمن میں بہت سے خطوط کا تبادلہ ہوا اور میں نے ڈی جی آئی سے اس سلسلے میں بات بھی کی مگر شاید مجاہدین کے ساتوں گروپ لیڈروں اور بعض مدد دینے والے ملکوں کی وجہ سے اس تجویز کو مسترد کر دیا گیا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ روس بہت جلد افغانستان سے نکل جانے پر مجبور ہو جاتا' افغان جہاد کے ثمرات ایران' پاکستان اور افغانستان کو حاصل ہوتے اور افغانستان میں عوام ان مشکلات کا شکار نہ ہوتے جن کا آج بھی انہیں سامنا ہے۔

پاک۔ ایران۔ افغان اور چین اتحاد

دنیا میں بہت سے مقامات پر پاکستانی اور چینی سفارتکاروں کے درمیان ایک خاص تعلق اور تعاون کی فضاء پائی جاتی ہے۔ تہران میں بھی ایسی ہی صورتحال تھی' ہماری ملاقاتیں تواتر کے ساتھ ہوا کرتی تھیں اور ہم ان ملاقاتوں میں باہمی دلچسپی کے دیگر معاملات کی طرح ایران عراق جنگ پر بھی تبادلہ خیالات کیا کرتے تھے۔ اس طرح کی ملاقاتوں سے ہمیں ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ ان ملاقاتوں میں ہمارا پسندیدہ موضوع پاک ایران افغانستان اور چین اتحاد ہوتا تھا۔ میری رائے کا مرکزی نقطہ حکیم الامت علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کے اشعار اور فلسفہ ہوا کرتا تھا۔ میں انہیں اکثر بتایا کرتا تھا کہ برسوں پہلے علامہ اقبال نے کہا تھا:

ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے

انہی ہمالیہ کے بلند و بالا پہاڑوں سے صاف اور شفاف پانی کے چشموں کی طرح صدیوں سے افیون کے نشے میں ڈوبی ہوئی چینی قوم اب اس طویل خواب سے بیدار ہو رہی ہے اور

اقوام عالم سے اپنا وجود منوانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ دوسرا شعر یہ تھا:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

علامہ اقبال جو ہمیشہ دل سے مغربی ثقافت اور رویوں کے شاکی رہے' کہتے ہیں کہ ہمارے دین اور ایمان کی آبرو کو قائم رکھنے اور نظریات کی حفاظت کے لئے دریائے نیل کی وادیوں سے لے کر کاشغر کے میدانوں تک امت مسلمہ کا متحد ہونا بے حد ضروری ہے۔ میں اپنے چینی دوستوں سے اکثر یہ کہا کرتا تھا کہ اگر جدید اور ترقی پذیر چین اور امت مسلمہ کا ایک بلاک بن جائے تو اس سے نہ صرف مغرب کا بھرپور مقابلہ کیا جا سکتا ہے بلکہ اس سے مغرب کی مزید تخریب کاری اور مشرقی اقوام کو کمزور بنانے کے منصوبے ناکام بنائے جا سکتے ہیں۔ ہمارا یہ اتحاد علاقے میں ترقی اور خوشحالی کی ضمانت بھی بن سکتا ہے' ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایران اور عراق کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ یہ جنگ ان دونوں ممالک کے عوام پر امریکہ کی جانب سے تھوپی گئی ہے۔ بنیادی طور پر مغرب' اسلام سے خوفزدہ ہے' جبکہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ چین اور عالم اسلام ہمیشہ مغرب کی چیرہ دستیوں کا شکار رہے ہیں۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ چین' ایران میں احیائے اسلام کی تحریک کا بھرپور ساتھ دینے کو تیار ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو یہ دنیا میں طاقت کا توازن برقرار رکھنے کے حوالے سے ایک شاندار قدم ہو گا اور یہ اقبال کے خواب کی تعبیر کے مترادف بھی ہو گا۔ ہم تقریباً اسی قسم کے موضوعات پر بات چیت کیا کرتے تھے۔

میرے چینی دوست کرنل چن ہمیشہ ان گفتگوؤں کے نوٹس لیا کرتے' ایک روز وہ مجھے ملنے کے لئے آئے اور کہنے لگے:

"ہم اب تک ایران پاکستان' چین اور افغانستان اتحاد اور چین اور عالم اسلام کے سیاسی اور اقتصادی تعاون کے حوالے سے جو باتیں کرتے رہے ہیں' میں اپنی رپورٹوں میں ان کا تذکرہ کرتا رہتا ہوں۔ ہمارے وزیر خارجہ تہران آئے ہوئے ہیں اور وہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں میں نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی حکومت کی پیشگی منظوری کے بغیر آپ کے وزیر خارجہ سے نہیں مل سکتا۔ میرا خیال ہے کہ دونوں ممالک پہلے ہی بہت سے معاملات پر ایک جیسے خیالات کے حامی ہیں۔ لہٰذا بہتر ہے کہ اس موضوع پر دفتر خارجہ سے رابطہ کیا جائے۔" میں چینی وزیر خارجہ سے ملنے تو نہ گیا تاہم ایران' افغانستان' پاکستان اور چین پر مشتمل ایک بلاک کے قیام کا آئیڈیا چینی قیادت تک پہنچ چکا تھا۔

پاکستان شام تعلقات

ایک اور ملک جس کے سفارتکاروں کے ساتھ میں بہت اچھے تعلقات استوار کرنے میں کامیاب ہوا وہ شام تھا۔ شام کے ساتھ اچھے سفارتی تعلقات بنانے کی میرے نزدیک کئی وجوہات تھیں۔ میرا خیال تھا کہ اب حالات ایسے ہیں کہ دونوں ملک کم سے کم وزارتی سطح پر ہی مل بیٹھیں اور اپنے اختلافات ختم کرنے کی کوشش کریں' تاہم مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ اس ضمن میں بھیجی گئی میری سفارشات اور مشورے اسلام آباد میں غالباً" ردی کی ٹوکری میں ڈال دیئے جاتے تھے۔ شام کی حکومت کو اس وقت ہم سے سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ شام میں جتنے بھی عراقی دہشت گرد پکڑے گئے وہ سب کے سب پاکستانی پاسپورٹوں پر شام میں داخل ہوئے تھے۔ وہ اس سلسلے میں ہماری مدد چاہتے تھے۔ مگر ان کی اس شکایت کا ازالہ تو کیا اس پر کان تک دھرنے کی زحمت بھی گوارہ نہ کی گئی' مجھے چونکہ شام سے متعلق ہماری خارجہ پالیسی کا علم نہیں تھا' اس لئے میں اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہ کر سکا۔ بہرحال ان کے سفارتکاروں کے ساتھ ذاتی تعلقات بہت اچھے رہے' اس سے ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ جو پاکستانی زیارات کے سلسلے میں شام جانا چاہتے تھے اور شام کی سفارت انہیں ویزا نہیں دیا کرتی تھی میری ذاتی چٹھی کی بنا پر ان کو ویزا ملنے لگا۔

اختتام

میرا ایران میں تعیناتی کا یہ دور مسلسل تربیت اور سیکھنے کا دور تھا خاص طور پر مجھے انقلاب' ایک مغرب زدہ معاشرے کی مشرقی معاشرے میں دوبارہ تحلیل' مغربی روایات اور ثقافت جو ایران کی قومی شناخت بن رہی تھی کی پھر سے اسلامی روایات اور اقتدار میں تبدیلی' اتنا طویل جنگ کا مردانہ وار مقابلہ اور سینکڑوں ہزاروں زخمیوں اور شہیدوں کا استقبال اور اس نوع کے درجنوں معاملات کے بارے میں بہت کچھ جاننے اور سیکھنے کا موقع ملا۔ اس دوران میں نے غیر ملکی سفارتکاروں سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ ان میں چین' ترکی' شمالی کوریا' سعودی عرب' انگلستان اور شام کے سفارتکاروں سمیت باقی سفارت کاروں سے بھی میرے بہت اچھے مراسم رہے۔

میرے تجربے میں یہ بھی آیا کہ جہاں ایک سفارتکار کے لئے پروفیشنل ہونا اور امور خارجہ کی اکیڈیمی سے سند یافتہ ہونا ضروری ہے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ سفارتکار ہر بات اور ہر مسئلہ کے لئے اسلام آباد کو صرف اطلاع دینے اور ان کے اگلے حکم کے انتظار میں

رہنے کی بجائے وقت اور موقعہ کی مناسبت سے جو بھی اپنے قومی اور ملکی مفاد میں بہتر سمجھے کر گزرے۔ کئی لمحے اور مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وقت گزر جائے تو پھر کچھ حاصل نہیں ہوتا' سانپ کی لکیر کو پیٹنے سے سانپ نہیں مرتا' اپنے ملک کے امور خارجہ کے دیئے ہوئے دائرہ کار میں رہتے ہوئے ملک کے لئے ازخود بہت کچھ کیا جا سکتا ہے' کم از کم میرے مشاہدے میں یہی آیا کہ ہمارے سفارتکار "کم دکھ اٹھانے" اور "پلے سیف" کی پالیسی پر کاربند رہتے ہیں' اور ملک کی بہتری کے لئے جدوجہد اور اپنی جان کو ذرا بھی تکلیف دینے سے اجتناب کرتے ہیں' اور اپنے آپ کو صرف سفارتی رسومات اور فائلوں تک محدود رکھتے ہیں۔



اختتامی کلمات

چند اسباق

انٹیلی جنس ایک انتہائی تکنیک' حساس اور ذمہ داری کا کام ہے اور زمانہء امن ہو یا جنگ' ضروری یہ ہے کہ یہ کام صرف اور صرف ماہرین انجام دیں۔ اس کے درست استعمال نے قوموں کو آگے بڑھنے میں بہت مدد دی ہے مگر اس کا ناجائز اور غلط استعمال ہمیشہ بدنامی اور رسوائی کا سبب بنا ہے۔ پاکستان سمیت تیسری دنیا کے بیشتر ممالک میں انٹیلی جنس کے مختلف شعبوں کو سیاست میں دخل اندازی کے لئے استعمال کیا گیا اور اکثر اوقات اس کے ذریعے انتقامی کارروائیوں سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔

روس میں کے۔ جی۔ بی کے چارٹر میں یہ ذمہ داری شامل کر دی گئی تھی کہ یہ اپوزیشن کے خلاف برسراقتدار کیمونسٹ پارٹی کی مدد کرے۔ اس فیصلے کو نظریات اور مملکت کی خدمت کے نام پر نہ صرف قبول کر لیا گیا بلکہ اس پر عمل بھی ہوتا رہا۔ کیمونسٹ روس میں حکومت کی مخالفت کا سیدھا سادا مطلب وطن سے غداری سمجھا جاتا تھا۔

پاکستان میں بھی برسراقتدار سیاسی جماعتوں نے اکثر خفیہ ایجنسیوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اپنی پارٹی کے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اپوزیشن نے برسراقتدار ٹولے پر کردار کشی' ڈس انفارمیشن پھیلانے' ہراساں کرنے' ٹیلی فون ٹیپ کرنے اور اپوزیشن ارکان کی معمول کی سرگرمیوں کی خفیہ طور پر نگرانی کرنے کے الزامات لگائے ہیں۔ انہیں ہر وقت "خفیہ والوں" کا خوف رہتا ہے۔ دراصل یہ صورتحال نااہل سیاسی قیادت' تنظیمی کمزوریوں اور کرپشن کے فروغ کا شاخسانہ ہے۔ اس کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ ان حساس اداروں کے بعض سربراہ اس خوش فہمی میں بھی مبتلا ہو سکتے ہیں کہ ہمارے علاوہ قومی مفادات کا تحفظ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ ماضی میں بہت سے

موقعوں پر ان ایجنسیوں نے "اقتدار کے دلالوں" اور "بادشاہ گر" کا کردار ادا کیا ہے۔ ملک میں بار بار مارشل لاء کے نفاذ نے بھی ان ایجنسیوں کے مزاج اور بنیادی مقاصد کو تبدیل کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہاں تک کہ ذوالفقار علی بھٹو کا جمہوری دور بھی ان الزامات سے محفوظ نہیں رہا۔ انہوں نے بھی اپنے بعض سیاسی مخالفین پر نظر رکھنے کے لئے ان ایجنسیوں سے کام لیا۔ جنرل ضیاء نے ان ایجنسیوں اور ایجنٹوں سے سب سے زیادہ کام لیا۔ ملک میں موجود خفیہ ایجنسیوں کے علاوہ بھی ضیاء الحق کا اپنا اطلاعات کا ایک نیٹ ورک تھا اور اس کے حوالے سے بہت سے صحافی ان کے تنخواہ دار تھے۔ آئی ایس آئی پر کاؤنٹر چیک رکھنے اور اس کی کارکردگی بڑھانے کے نقطہ نظر سے انہوں نے ملٹری انٹیلی جنس کو حکم دیا تھا کہ وہ صوبائی سطح پر اپنے سیل قائم کرے تاکہ سیاسی معلومات بھی حاصل کی جا سکیں۔ شاید یہ سیل آج بھی اسی طرح کام کر رہے ہوں۔

جنرل ضیاء کے طیارے کے حادثے کے بعد اس وقت کے آئی ایس آئی کے ڈی جی آئی جنرل حمید گل ایک طاقتور شخصیت کے روپ میں سامنے آئے اور انہوں نے پاکستان کی سیاسی اساس کو اپنے قبضے میں لینے کی کوشش کی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے مقابلے میں 9 بکھری ہوئی سیاسی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنا اور اس کو آئی جے آئی کا روپ دینا انہیں کی "بصیرت" کا نمونہ تھا۔ اگر میں انتہائی پیشہ ورانہ نظر سے جنرل حمید گل اور ان کے ساتھیوں کے بادشاہ گری کے اس کردار کا تجزیہ کروں تو مجھے یہ کہنے میں ذرہ برابر باک نہیں کہ انہوں نے قوم کی طرف سے دیئے گئے فرائض میں بددیانتی کی۔ ان کا یہ کردار آئی ایس آئی کی طے شدہ ذمہ داریوں سے بالکل باہر اور ماورا تھا۔

اگر جنرل حمید گل اور ان کے اس وقت کے رفقاء کار یہ سمجھتے تھے کہ پی پی پی ایک ملک دشمن جماعت ہے تو ان کا یہ فرض تھا کہ اس الزام کو ناقابل تردید شواہد کے ساتھ عدلیہ اور قوم کے سامنے پیش کرتے اور قوم پی پی پی کے لیڈروں سے اس کا حساب لیتی۔ شاید جنرل حمید گل کا خیال تھا کہ وہ جلد ہی سیاسی میدان میں آکر اسلامی جمہوری اتحاد کی باگ ڈور خود سنبھال لیں گے۔ لیکن یہ تمنا ابھی تک ادھوری ہے (انہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد بہت بھاگ دوڑ کی اور اب تک سیاست کے میدان میں اپنا نام اور مقام پیدا کرنے کے لئے

کوشاں ہیں۔ لیکن ابھی تک کسی سیاسی جماعت نے ان کو گھاس نہیں ڈالی۔) حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک حساس ادارے کو اس کے اصل ٹریک سے ہٹانے کے مجرم بھی ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی اور آئی جے آئی کے مابین ان کی پیدا کردہ محاذ آرائی کی کیفیت ان لوگوں کی طمع اور ذاتی مفادات اور پسند و ناپسند ہی ہو سکتی ہے اور اس کھیل میں آئی ایس آئی نے اپنے اصل مقاصد سے ہٹ کر ایک سیاسی "دلال" کا کردار ادا کیا۔ یہ اسی حکمت عملی کا نتیجہ ہے کہ آج ایک سپاہی سے لے کر آئی جی پولیس تک اور چپڑاسی سے لے کر وفاقی سیکرٹری تک' بیشتر سرکاری ملازم مختلف سیاستدانوں کے "وفادار" کہلاتے ہیں اور ہر نئی آنے والی حکومت سرکاری ملازموں کی پیشہ ورانہ صلاحیتیں مدنظر رکھے بغیر ان کو تبدیل کر کے "اپنے" آدمی لے آتی ہے۔ نفرتوں اور اختلافات کا یہ عالم ہے کہ آج سیاستدان ایک دوسرے کو قطعی طور پر برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ ارکان اسمبلی' پارلیمنٹ میں ایک دوسرے پر جو کیچڑ اچھالتے ہیں اور جس انداز سے اسمبلی کی کارروائی چلاتے ہیں وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں۔" شاباش جنرل حمید گل!"

جنرل حمید گل کی اس کارستانی کا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا ہے کہ خود آئی ایس آئی بھی سیاسی گروہوں میں بٹ جائے۔ وہ ادارہ جہاں سیاست' شجر ممنوعہ ہے' ایسے حالات میں ذاتی سیاست کا شکار ہو سکتا ہے اور اس کے اہلکار اور عہدیدار اپنے اپنے سیاسی نقطہ نظر کو اپنی ڈیوٹی پر ترجیح دینا شروع کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے جب ایک ادارے کا سربراہ سیاسی گروہ بندیاں کرے گا تو پھر اس کے ماتحتوں کو ایسا کرنے سے کون روک سکتا ہے۔ جن دنوں آئی ایس آئی میں چوہے بلی کا یہ کھیل کھیلا جا رہا تھا' ایک سیاستدان نے ایک نجی ملاقات میں مجھ سے کہا:

"بریگیڈیر! آئی ایس آئی کی خفیہ رپورٹیں ان دنوں آب پارہ کی پکوڑہ شاپ سے بھی دستیاب ہیں۔" ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اب آئی ایس آئی میں کوئی بات بھی خفیہ نہیں رہی۔

ایک ایسا ادارہ جسے ایک طویل عرصے تک بہت سے محب وطن اور محنتی افراد نے اپنے خون پسینے سے استوار کر کے اسے پاکستان کا ایک اعزاز بنا دیا تھا' "گینگ ریپ" کا شکار ہو گیا۔

اس تلخ میں جنرل مرزا اسلم بیگ نے یہ کہہ کر مزید پیوند لگا دیئے کہ 1988 کے انتخابات میں ہیرا پھیری کے لئے آئی ایس آئی کو 140 ملین روپے کے خفیہ فنڈز مہران بنک کے سربراہ یونس حبیب نے فراہم کئے تھے۔ ہم ابھی اس الزام کے بھی منتظر ہیں کہ امریکہ نے افغان جنگ میں آئی ایس آئی کو کتنے فنڈز فراہم کئے تھے اور انہیں کیسے کیسے تقسیم کیا گیا۔ اس حوالے سے خبریں اور الزامات کبھی کبھی غیر ملکی اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

آئی بی (انٹیلی جنس بیورو) کی کارکردگی بھی اس سے کچھ مختلف نہیں رہی۔ اس ضمن میں 17 جولائی 1994ء کو دی مسلم میں شائع ہونے والے ایک خط کے اقتباسات کا حوالہ کافی ہو گا:

> "خاص طور پر پنجاب میں ہونے والی بعض سیاسی تبدیلیوں اور امن و امان کی صورتحال کے سلسلے میں چند اہم واقعات کے وقوع پذیر ہونے سے خفیہ ایجنسیوں کے بارے میں اخبارات میں خاصی لے دے ہو رہی ہے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی کے کمرے سے جاسوسی کے آلات برآمد ہونے سے ہمارے انٹیلی جنس اداروں کی کارکردگی مشکوک ہو گئی ہے۔ ان اداروں کے بارے میں نفرت کا اب یہ عالم ہے کہ قومی اسمبلی میں کسی خفیہ ادارے کے اہلکار کی موجودگی بھی ارکان اسمبلی کے لئے قابل برداشت نہیں رہی۔ ان ایجنسیوں پر اب کھلے عام یہ الزام لگنے لگا ہے کہ یہ اپنے معمول کے فرائض کو چھوڑ کر حکومت کے سیاسی مخالفوں کی جاسوسی کرنے' انہیں ہراساں کرنے اور ان کے پیچھے بھاگنے پر ہی اپنی قوت ضائع کر رہے ہیں"۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کو 1996 میں جب اقتدار اعلیٰ سے علیحدہ کیا گیا تو ان کا بھی یہ کہنا تھا کہ انٹیلی جنس کی 80 فیصد خبریں جھوٹ کا پلندہ ہوتی ہیں' یعنی ان کے اقتدار کے چھن جانے میں انٹیلی جنس سے جھوٹی خبریں آنے کا ہاتھ تھا۔ حالانکہ آئی بی کے ڈائریکٹر جنرل مسعود شریف ان ہی کی پسند کے آدمی تھے۔ اگر وہ درست کام نہیں کر رہے تھے تو اس میں قصور محترمہ کا تھا کیونکہ ایک نااہل آدمی کو آئی بی کا سربراہ بنایا گیا اور پھر اس کی نااہلی کے باوجود

اور ہر روز جھوٹ کا پلندہ پڑھنے کے باوجود اسے ہٹایا نہیں گیا۔

اب بھی وقت ہے کہ ہم اس سے کچھ سبق سیکھیں اور اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے اس صورتحال کی اصلاح کی طرف توجہ دیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے تمام شعبوں کی مکمل اوورہالنگ کریں۔ اس کارروائی کے دوران میں ہمیں سارا گندہ خون ان اداروں کی رگوں سے باہر نکالنے اور اس کی جگہ تازہ اور صحت مند خون رگوں میں شامل کرنے کے عمل سے گزرنا ہو گا۔

ماضی میں اس سلسلے میں بہت سی کمیٹیاں تشکیل دی جا چکی ہیں۔ ان میں جنرل اے آئی اکرم' جنرل صاحبزادہ یعقوب اور ایئر چیف مارشل ذوالفقار کمیٹی شامل ہیں۔ ان کے قیام کا مقصد خفیہ اداروں کی کارکردگی کا جائزہ لینا اور انہیں بہتر بنانے کے لئے اقدامات تجویز کرنا تھا۔ مجھے اکرم اور یعقوب کمیٹی کے سامنے پیش ہونے کا موقع ملا اور ان کے سامنے اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ لیکن شاید ان میں سے کسی کمیٹی کی رپورٹ پر آج تک عمل درآمد نہیں ہوا۔

میں آئی ایس آئی کے وسیع دائرۂ کار میں ایک معمولی سی ذمہ داری ادا کر رہا تھا اور میری ذمہ داری محدود بھی تھی۔ بلکہ مجھے اس حقیقت کو تسلیم کر لینے میں بھی کوئی باک نہیں کہ بعض اوقات حساس سیکورٹی اور خفیہ معاملات کے بارے میں مجھے اپنی کم مائیگی' لاعلمی اور ناتجربہ کاری کا احساس بھی ہوتا تھا۔

میرا مشاہدہ یہ ہے کہ یہ ادارہ ایکسپرٹ افرادی قوت اور مادی وسائل کی کمی کا بری طرح شکار ہے۔ ہمیں پڑھے لکھے اور تجربہ کار افراد کی ضرورت ہے۔ اس نوع کے اداروں کی اپنی شناخت' روایت اور کلچر ہونا چاہیے۔ آج کا دور مائیکرو سپشلائزیشن کا دور ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بدلتے ہوئے حالات اور کرہ ارض پر نمودار ہونے والے بعض حقائق کی روشنی میں ہم اپنے قومی تحفظات اور سلامتی کے پیش نظر ان اداروں کو صرف اور صرف قومی خدمت اور سلامتی کے جذبے کی اساس پر استوار کریں اور ان کے اہلکاروں کو تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات میں جدید طریقہ کار' تربیت اور تکنیکی صلاحیتوں سے بہرہ ور کریں۔ ذیل میں چند مشورے ارباب اختیار کی توجہ کے لئے پیش خدمت ہیں:

1- میرے نزدیک سب سے اہم بات موزوں اور صحیح اہلکاروں کا انتخاب ہے۔ اس کے لئے ایک واضح اور فول پروف طریقہ کار ہونا چاہیے۔ ان اداروں میں کام کرنے کے لئے منتخب کئے جانے والوں کی تربیت بھی انتہائی اہم ہے۔ ان ایجنسیوں کے مختلف شعبوں کے لئے مختلف قسم کی شخصیت' تعلیمی قابلیت' بیک گراؤنڈ اور کردار کے حامل افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے مطالعے اور تجربے کے مطابق ان افراد کے انتخاب کا بہترین طریقہ برطانوی انٹیلی جنس سروس کا ہے اور تربیت کے معاملے میں اسرائیل سرفہرست ہے۔ ہمارے پالیسی سازوں کو ان اداروں کے طریقہ کار کا بغور مطالعہ کرنا چاہئے اور انہیں اپنانے کے لئے مناسب منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔

2- ان ایجنسیوں کے سربراہوں کا انتخاب صرف اہل اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے حامل افراد میں سے کیا جانا چاہیے اور سیاسی بنیادوں پر یا ذاتی ترجیحات پر عہدے نہیں بانٹنے چاہئیں۔

3- سی آئی اے کی طرح ہر خفیہ ادارے میں احتساب اور چیک اینڈ بیلنس کا نظام موجود ہونا چاہیے۔

4- اس میں کوئی شک نہیں کہ آئینی طور پر یہ ادارے ملک کے چیف ایگزیکٹو (وزیراعظم) کو جواب دہ ہوتے ہیں مگر چیف ایگزیکٹو کو ان اداروں کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں باقاعدہ قانون سازی ہونی چاہیے۔

5- ان اداروں میں تخریب کاری' دہشت گردی اور پراپیگنڈہ کے توڑ کے لئے شعبوں کا قیام وقت کی اہم ضرورت ہے۔

6- تمام انٹیلی جنس ایجنسیوں کو صرف اور صرف پاکستان کے وقار اور سلامتی کے لئے کام کرنا چاہیے اور کسی بھی سیاسی جماعت کی سیاسی بلیک میل کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

7- خفیہ اداروں کے کارکن نائب قاصد سے لے کر ڈی جی آئی تک غیر مرئی ہونے چاہئیں۔ ان اداروں کے دفاتر کے گرد اونچی دیواریں اور سرچ لائٹس اس وقت تک بے سود ہیں جب تک ان اداروں کے اندر کام کرنے والے افراد میں

راز کو راز رکھنے کی خوبی نہ پیدا کی جائے۔ ایسے لوگ جن کے سیاسی مقاصد ہوں' جو دولت اور شہرت کے لالچی اور معاشرے میں اعلیٰ سماجی مقام کی خواہش رکھتے ہوں' خود نمائی اور خود پسندی جن کا ذوق ہو' ایسے افراد کو ان اداروں کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا جانا چاہئے۔

-8 آئی ایس آئی اور آئی بی کے دائرہ کار اور کردار کی وضاحت ہونی چاہیے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ جب آئی ایس آئی کو کسی مشن کی تکمیل پر شاباش ملی تو آئی بی میں اس سے بددلی پھیلی۔ یہ دونوں ادارے اکثر اوقات ایک دوسرے کے فرائض میں دخل اندازی بھی کرتے ہیں۔

-9 سب سے اہم اور بنیادی نقطہ یہ ہے کہ ان اداروں میں صرف باکردار' مقصد کے ساتھ کومٹ منٹ رکھنے والے اور قابل افراد کو منتخب کیا جانا چاہیے۔ یعنی (Character, Competence, Commitment) کو بنیادی اہمیت حاصل ہونی چاہئے۔



خدا حافظ

یہ کتاب میری سوانح حیات نہیں ہے اور میں نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ اپنی ذات کو اہم واقعات کا مرکزی کردار نہ بننے دوں۔ تاہم بعض قارئین یہ ضرور جاننا چاہیں گے کہ میں نے اس شعبے کو خدا حافظ کیوں اور کیسے کہا۔ چند جملے اس ضمن میں تحریر کر رہا ہوں۔

ایران میں ڈیفنس اور آرمی اتاشی کے طور پر میری سروس کی چار سالہ توسیعی مدت ختم ہو رہی تھی اور میرے جگہ دوسرے اتاشی کے احکامات جاری ہو چکے تھے۔ تاہم مجھے ابھی تک یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ میری اگلی پوسٹنگ کہاں ہوئی ہے۔ یہ ایک غیر معمولی سی بات تھی، مگر جب نئے اتاشی چارج لینے کے لئے تہران پہنچ گئے تو میں نے فون پر آئی ایس آئی سے پوچھا کہ مجھے بتایا جائے کہ چارج دے کر مجھے کہاں جانا ہے؟ مجھے فون پر ہی کہا گیا کہ آپ اسلام آباد آئی ایس آئی میں رپورٹ کریں۔

اس وقت تو مجھے اس "خاص سلوک" کی وجہ سمجھ میں نہ آئی، مگر اسلام آباد پہنچ کر مجھے اصل حقیقت معلوم ہوئی۔ شاید اب میرے لئے آئی ایس آئی یا پاک فوج میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ تہران میں الوداعی دعوتوں کے دوران بہت سے غیر ملکی سفارتکاروں نے کہا کہ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس قدر کامیاب اتاشی کو کیوں تبدیل کیا جا رہا ہے؟

جب میں اسلام آباد پہنچا تو جنرل اختر عبدالرحمن اتنے مصروف تھے کہ ان کے پاس مجھ سے بات کرنے کا بھی وقت نہیں تھا۔ کچھ عرصہ گو مگو کی کیفیت میں رہنے کے بعد بالآخر ایک روز میں جنرل اختر کے کمرے میں جا پہنچا اور ان سے پوچھا کہ "جناب میرے لئے کیا حکم ہے؟" انہوں نے مجھے جی ایچ کیو ملٹری سیکرٹری برانچ سے رابطہ کرنے کو کہا۔ میں ملٹری

سیکرٹری کے پاس گیا اور عرض کی جناب میری پوسٹنگ کے احکامات جاری کریں تاکہ میں کم سے کم اپنی تنخواہ تو جاری کروا سکوں۔ انہوں نے میرے لئے "افسر بکار خاص" قسم کے احکامات جاری کر دیئے اور مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ آئی بی میں جانا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا میں سپاہی ہوں جس محاذ پر جانے کا حکم ملے گا' وہاں جا کر لڑوں گا اور اس کے بعد میں اطمینان سے گھر آگیا۔

دو تین ہفتوں کے بعد مجھے آئی ایس آئی میں بلایا گیا اور بتایا گیا کہ آئی بی نے آپ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ دراصل اس وقت وزیراعظم محمد خان جونیجو آئی بی کو فوجی افسروں سے "پاک" کر رہے تھے۔ چنانچہ میں واپس آئی ایس آئی کی گود میں آ بیٹھا۔

جنرل اختر نے مجھ سے کہا کہ آپ کی خاطر میں اس وقت کسی ٹیم کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا اس لئے میں آپ کو اپنا چیف آف سٹاف لے رہا ہوں۔ چونکہ آئی ایس آئی میں اس سے پہلے ایسا کوئی عہدہ نہیں تھا لہٰذا جنرل اختر نے صدر سے اس کی منظوری لے لی۔ مجھے جنرل اختر کے ساتھ والا کمرہ مل گیا اور افغانستان سمیت کچھ موضوعات کی فائلیں میرے ذریعے آنی جانی شروع ہو گئیں۔ میں افغانستان کے بارے میں بریفنگز اور میٹنگوں میں بھی جانے لگا۔ میں نے چند ہفتوں میں یہاں جو کچھ دیکھا میرے اصولوں' کردار اور مزاج کے بالکل خلاف تھا۔ میں کسی صورت بھی اس کھیل کا حصہ بننے کو تیار نہیں تھا جو ان دنوں افغانستان کے حوالے سے آئی ایس آئی اور سی آئی اے کے درمیان کھیلا جا رہا تھا۔ میں بخوبی بھانپ گیا کہ سی آئی اے' آئی ایس آئی کو تباہ و برباد کر کے رہے گی۔ چنانچہ میں نے ریٹائرمنٹ لینے کا فیصلہ کر لیا اور ڈی جی آئی کو اس ضمن میں باقاعدہ درخواست دے دی۔ وہ میری درخواست دیکھ کر حیران رہ گئے اور کہنے لگے "تم نے پچھلے 20 سالوں میں مجھ سے کبھی کوئی فیور نہیں مانگی اور اب اپنی ریٹائرمنٹ کے کاغذات پر میرے دستخط چاہتے ہو۔" انہوں نے وہ فائل میرے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا' "گیٹ آؤٹ"۔ یہ ان کی محبت اور شفقت تھی۔

ایک ہفتہ کے بعد میں نے پھر وہ فائل ان کے آگے رکھ دی انہوں نے پوچھا "آخر تم کیا کرو گے؟ اپنے بچوں کا پیٹ کیسے پالو گے؟ کہاں جاؤ گے؟" میں نے جواب دیا:

"سر' اللہ میرا اور میرے بچوں کا رازق ہے" وہ میرے جواب سے خوش نہیں تھے تاہم انہوں نے میری درخواست پر دستخط کرتے ہوئے کہا "اب نوکری کے لئے میرے پاس مت آنا!"

"نہیں آؤں گا سر" میں نے جواب دیا۔ اور اللہ کے فضل سے اپنے اس عہد پر قائم رہا۔

مجھے الوداعی چائے پارٹی دی گئی' ڈی جی آئی نے آئی ایس آئی میں بحیثیت ڈائریکٹر اور تہران میں بحیثیت سفارتکار میری خدمات کے ضمن میں چند کلمات کہے۔ انہوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار بھی کیا کہ میں نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ ان کے خطاب کے جواب میں' میں نے صرف اتنا کہا:

"میں نے ہمیشہ اے ٹیم میں کھیلا ہے اور خاص طور پر آئی ایس آئی کی اے ٹیم کا رکن رہا ہوں اور اے ٹیم کے کھلاڑی کو اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اب اس کا "دستانے اتارنے" کا وقت آگیا ہے۔

خدا حافظ یونیفارم

خدا حافظ آئی ایس آئی

یہ 31 دسمبر 1985 کا دن تھا

کل پھر صبح ہو گی



کتاب کے بارے میں چند تاثرات

محترم بریگیڈیئر ترمذی

کتاب بھجوانے کا شکریہ۔ کتاب معلوماتی اور بے لاگ ہے۔ ظاہر ہے، پاکستان کا پرامن ایٹمی پروگرام اور امریکہ، اور دشمن یا نادان دوست میں نے خاص توجہ سے پڑھا۔ ان ابلیسی کرداروں کو بے نقاب کرنے پر میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے کوئی حیرانی نہیں ہوئی، ہماری تاریخ جعفر اور صادق سے بھری پڑی ہے۔

بہرحال اللہ کا شکر ہے کہ میں محب وطن پاکستانی بھائیوں کی مدد سے اپنے مشن میں کامیاب رہا۔

مخلص

ڈاکٹر عبدالقدیر خان

میں نے اس کتاب کو عوامی نمائندگان کے خلاف فرد جرم کے طور پر دیکھا ہے۔۔۔۔ مصنف نے مجرمانہ غفلتوں، خوفناک کوتاہیوں، قوم کے نقصانات، نہایت ہی نازک معاملات پر آپس کے لڑائی جھگڑوں اور اوپر کی سطح پر قومی جذبے کے فقدان کی نشاندہی کی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو من حیث القوم ہم ایک بہت ہی خطرناک مرغ میں مبتلا ہیں۔ اگر یہ جھوٹ کا پلندہ ہے تو یہ کتاب دشمن کو غلط روش پر لگانے کا ایک شاہکار ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ ترمذی جو کہنا چاہ رہا ہے وہ سچ ہے۔

ایس ایم ظفر

سابق وزیر قانون

ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان

محترم ترمذی

میں آپ کی کتاب سے بہت لطف اندوز ہوا۔ پہلی بات کہ یہ بہت احتیاط اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ بہت سے واقعات سے میں خود بھی واقف ہوں۔

اتنے اچھے کام پر مبارکباد۔ اور میں امید رکھتا ہوں کہ آپ ایسے اہم معاملات پر آئندہ بھی لکھتے رہیں گے۔

احمد کمال

سفیر اور یو این او میں پاکستان کے مستقل نمائندہ

محترم ترمذی

میں نے ایران میں آپ کی خدمات کے بارے میں سن رکھا تھا اب آپ کی کتاب پڑھی ہے جس سے بہت سے راز افشاں ہوئے ہیں۔ واقعی ایسی کتاب لکھنے کے لئے بہت ہمت اور جرات کی ضرورت ہوتی ہے۔

مظہر عباس

انفرمیشن سروس اکیڈمی

وزارت انفرمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ